یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ

افکار حق کا ترجمان

البرھان

- سانحہ کربلا
- حق تو یہ ہے
- کیا یزید جنتی ہے؟
- اسلام بمقابلہ عیسائیت
- مقدمہ توہین رسالت (ثناء صاحب)
- اسلام کا نظریہ حدود و تعزیرات
- ان شاء اللہ
- تحقیق تاریخ ولادت و وصال مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم
- مدینے سے میدان کربلا تک امام حسین رضی اللہ عنہ کی سواری

التحقیقات الاسلامیہ فاؤنڈیشن واہ کینٹ

[illegible]

نوٹ نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری مضمون نگار پر ہوگی

Email:alburhanwah@gmail.com

برائے رابطہ مکتبہ فیضان سنت دکان نمبر 28 میلاد چوک پی۔او۔ایف واہ کینٹ

CELL:0343.5942217 0302.5122663

فہرس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اللھم صلی علی سیدنا و مولانا محمد وعلی آل سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم وصلی علیہ

اداریہ

!! ایڈیٹر !!

عہد حاضر میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت سے کوئی بھی باشعور انسان انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ذرائع ابلاغ انتہائی گہرے اور دور رس اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ حکومتوں کے بنانے اور گرانے میں بھی ان کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ دنیا بھر میں تمام ممالک، قومیں اور عالمی تنظیمیں ان کے ذریعے ہی اپنے اغراض و مقاصد کی تشہیر کر رہی ہیں۔ ان سے صرف نظر کر کے تہذیبوں اور معاشروں میں اپنی حیثیت منوانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اس وقت وطن عزیز پاکستان کے طول و عرض میں مختلف طبقہ ہائے فکر کی طرف سے متعدد ادبی، سیاسی اور مذہبی اخبارات، رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں جو کہ ان طبقوں کے افکار و نظریات کی تشہیر کا اہم ذریعہ ہیں۔ ان میں نمایاں حصہ مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد کا ہے۔ میرا روئے سخن بھی انہی کی طرف ہے۔

پاکستان میں مختلف مکاتب فکر کی طرف سے لاتعداد مذہبی رسائل و جرائد مطلع صحافت پر جلوہ گر ہیں۔ اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اکثر مجلے مسلک حقہ اہل سنت و جماعت کے مخالفین کی طرف سے شائع ہو رہے ہیں ان میں سے چند ایک ہی ایسے ہوں گے جو کہ اپنی بات مثبت طریقے سے پیش کرتے ہوں ورنہ اکثر اہل سنت و جماعت کے عقائد و معمولات کے خلاف ہمہ وقت زہر اگلنے میں مصروف ہیں۔ ان کے ذریعے اپنے لوگوں کی اس طرز پر ذہن سازی کی جا رہی ہے کہ وہ اہل سنت کے خلاف کسی بھی محاذ آرائی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ بعض نبی علیہ السلام کی عظمت،

رفعت کو گھٹانے کی مذموم کوشش کر رہے ہیں۔ بعض صحابہ کرام کی شان کو داغدار کرنے کی ناکام کاوش میں مصروف ہیں۔ اہل بیت پاک کی محبت وعقیدت کو مٹانے کی سعی لاحاصل کے ساتھ ساتھ اولیائے کرام کی تعظیم وتکریم کو شرک گردانے میں مگن ہیں۔ بعض کوتاہ فہم لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھو کر ان کو فقہ حنفی سے برگشتہ کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے اشاعتی اداروں کی طرف سے اہل سنت وجماعت کے عقائد ومعمولات کے خلاف چھپنے والی کتابوں کی ایک یلغار ہے جو ہفواسات وہفوات سے پُر ہیں۔ جنھیں پڑھ کر اہل محبت کا خون کھولنے لگتا ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ حالانکہ پاکستان جو ہمارے بزرگوں کی لازوال قربانیوں اور محنتوں کا ثمر ہے ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

دوسری طرف ہمیں یہ چیلنج بھی درپیش ہے کہ ہمارے بعض عاقبت نااندیش صراط مستقیم سے پھسلتے نظر آرہے ہیں۔ اہل سنت وجماعت کے مسلمہ عقائد ونظریات سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ سلف صالحین کی تحقیقات کو پس پشت ڈال کر اپنی خود ساختہ تحقیقات کو منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔ ایسے میں حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ منظم طریقے سے اہل سنت وجماعت کی طرف سے ان تمام فتنوں کا تحمل وبردباری سے مقابلہ کیا جائے۔ مخالفین کے تمام اخبارات اور رسائل وجرائد نیز ان کی کتب میں چھپنے والے نت نئے اعتراضات اور الزامات کا علمی وتحقیقی جواب دیا جائے اور ان کی طرف سے پھیلائے جانے والے باطل نظریات کے تدارک کے لیے جہد مسلسل سے کام لیا جائے۔

اس مقصد کے لیے اگرچہ اس وقت اہل سنت وجماعت کی طرف سینکڑوں کی تعداد میں رسائل وجرائد مختلف شہروں اور قصبوں سے شائع ہو رہے ہیں ان میں بعض رسائل بہت معیاری اور تحقیقی ہیں جو نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی قارئین کا ایک وسیع اور مضبوط حلقہ رکھتے ہیں۔ ان کے مدیران کی ان کاوشوں کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ان میں بعض رسائل اتنے غیر معیاری اور غیر تحقیقی ہیں کہ دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ انکا حلقہ قارئین اتنا محدود ہے کہ وہ اپنے شہر میں بھی اجنبی ہیں۔ یہ صوری ومعنوی خوبیوں سے تہی دامن ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا انداز نگارش ہے کوئی

کسی درگاہ کا ترجمان ہے تو کوئی کسی خانقاہ کا، کوئی کسی تنظیم کا پیامبر ہے تو کوئی کسی شخصیت کی زلف کا اسیر ہے۔

چنانچہ وقت کا تقاضا ہے کہ ایک ایسا معیاری اور تحقیقی مجلہ منظر عام پر لایا جائے جو ظاہری و باطنی خوبیوں سے مزین ہونے کے ساتھ ساتھ دلیل کی قوت سے بھی مالا مال ہو۔ جو چاروں فقہی مسالک اور تمام سلاسل طریقت کا ترجمان ہو۔ جس کی زبان ایسی ہو کہ اس میں اشتعال کی بجائے چاشنی ہو۔ جس میں مخالفین کے علمی تعاقب کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد و معمولات کو قرآن و سنت کے محکم دلائل سے ثابت کیا جائے۔ فقہ حنفی کی ثقاہت سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا جائے خصوصاً حدیث پاک سے ہر مسئلے کا ثبوت پیش کیا جائے۔ نئے نئے موضوعات کو زیر بحث لایا جائے یا پرانے موضوعات کو نئے رنگ میں پیش کیا جائے، اور دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جائے۔ مستشرقین اور سیکولر نظریات کے حامل لوگوں کو منہ توڑ جواب دیا جائے۔ نیز اہل سنت کی صفوں میں چھپے ان پردہ نشینوں کو بھی بے نقاب کیا جائے جو اہل سنت کے مسلمہ عقائد کو مسخ کر کے اپنے خود ساختہ عقائد کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ملک بھر میں شائع ہونے والے مجلوں اور اخبارات کے کارآمد حوالوں اور شہ پاروں کو محفوظ کر دیا جائے۔

عرصہ سے راقم کی یہ شدید خواہش تھی کہ اس طرح کا کوئی معیاری اور تحقیقی پرچہ سامنے لایا جائے۔ محترم جناب ابوأسامہ ظفر القادری بکھروی مدظلہ کی بھی یہی خواہش تھی محترم جناب ظفر محمود قریشی صاحب بھی ایسے ہی جذبات دل میں رکھتے تھے۔ چنانچہ جب ہم تینوں مل بیٹھے تو اللہ پاک کے فضل عظیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کرم عمیم کے بھروسے پر یہ کام کر گزرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ "البرہان" کے نام سے مجلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مطالعہ کے بعد معزز قارئین سے اور خصوصاً اہل علم سے گذارش ہے کہ اس کے متعلق اپنی آراء سے ہمیں آگاہ فرمائیں اور اپنے قیمتی مشوروں سے بھی ضرور نوازیں۔ میں مشکور ہوں جناب پیر سید صابر حسین شاہ صاحب بخاری اور علامہ سید بادشاہ تبسم بخاری صاحب کا کہ جنھوں نے اپنی قیمتی آراء سے ہمیں مستفیض فرمایا۔

ہمیں حضرت مفکر ملت علامہ پیر عبد القادر صاحب اور اُن کے تلامذہ کی مساعی جمیلہ کا

اعتراف بھی ہے اور احترام بھی، حضرت علامہ پیر سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب اور دیگر علمائے اہل سنت کی خدمات کو بھی ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں ان سب حضرات کی دعاؤں اور مشوروں کی ضرورت رہے گی۔ دعا ہے اللہ کریم ہمیں اپنے مقاصد میں کامیاب و کامران فرمائے۔ آمین!

محمد افضل شاہد (ایڈیٹر امرازی)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

سانحہ کربلا

شیخ الحدیث والتفسیر پیر سائیں غلام رسول قاسمی قادری ☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی حبیب اللہ وعلی الہ واصحابہ اجمعین

سیدنا امام حسین ؓ نے اب تلوار کیوں اٹھائی اور پہلے کیوں نہ اٹھائی تھی:؟

سیدنا امام حسین ؓ نے تمام خلفاء راشدین کے دور میں، حتیٰ کہ حضرت سیدنا امیر معاویہ ؓ کے زمانے تک کسی حکومت کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی بلکہ اطاعت گزاری کو اختیار کیے رکھا۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کے دورِ حکومت میں سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہما دونوں حضرت امیر معاویہ ؓ کے پاس شام میں آیا جایا کرتے تھے اور حضرت امیر معاویہ ؓ ان دونوں شہزادوں کا بہت احترام فرماتے تھے۔ انکی خدمت میں بہت سے عطیات اور وظائف پیش کرتے تھے اور دونوں شہزادے انہیں بخوشی قبول فرماتے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۵۸)۔

حضرت داتا صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ ایک دن حضرت سیدنا امام حسین ؓ کے پاس ایک غریب آدمی نے آکر خیرات مانگی۔ آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ ہمارا وظیفہ آنے والا ہے، جیسے ہی وظیفہ پہنچ جائے گا آپ کو دے دیا جائے گا۔ تھوڑی دیر میں حضرت امیر معاویہ ؓ کی طرف سے ایک ایک ہزار دینار کی پانچ تھیلیاں پہنچ گئیں۔ تھیلیاں پہنچانے والوں نے عرض کیا کہ حضرت امیر معاویہ نے معذرت کی ہے کہ یہ تھوڑی سی رقم ہے اسے قبول فرمائیں۔ سیدنا امام حسین ؓ نے ساری رقم اس غریب آدمی کے حوالے کردی اور اس سے معذرت چاہی (کشف المحجوب صفحہ ۷۷)۔

حضرت امیر معاویہ ؓ نے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا یا نہیں؟ اسکے بارے میں دو قول

☆ 048-3215204

موجود ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ آپ نے اسے ولی عہد مقرر نہیں کیا بلکہ اس نے خود بخود حکومت سنبھال لی تھی۔ یہ بات علامہ ابوالشکور سالمی رحمت اللہ علیہ (متوفی پانچویں صدی) نے اپنی مایہ ناز کتاب التمہید کے صفحہ ۱۶۹ پر بیان فرمائی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یزید کو ولی عہد مقرر کرنے کے لیے حضرت امیر معاویہ نے مختلف اکابر سے مشورہ لیا تھا۔ کچھ لوگ اس تجویز سے متفق ہو گئے جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم اس بات سے متفق نہیں تھے۔ یہ سب باتیں شیعہ کی کتاب (تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۹) پر اور اہل سنت کی کتاب (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۵۸) پر درج ہیں۔ نیز مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ ﷺ نے یزید سے کہا تھا کہ امام حسین ﷺ کے ساتھ اچھا رویہ اختیار رکھنا فصل رحمه وارفق به (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۶۹ اور شیعہ کی کتاب جلاء العیون صفحہ ۳۸۸ فصل دوازدہم)۔ حضرت امیر معاویہ ﷺ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے یزید کے کرتوتوں سے آگاہ نہیں تھے۔ اور اگر کوئی چھوٹی موٹی خرابی آپ کے علم میں تھی بھی تو آپ نے یہ سوچ کر یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا کہ جب ذمہ داری سر پر آئے گی تو انسان بن جائے گا۔ مگر یزید نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حضرت امیر معاویہ ﷺ کے زمانے میں ہی عراق کے شیعہ لوگوں نے سیدنا امام حسین ﷺ کو حضرت امیر معاویہ کے خلاف اکسایا تھا مگر آپ ﷺ نے شیعوں کی اس بات کو قبول نہ فرمایا اور صبر سے کام لینے کا حکم دیا ایشان را مصاحب ننمود و بصبر امر کرد (شیعہ کی اپنی کتاب جلاء العیون صفحہ ۳۲۸)۔ یہی بات شیعہ کے مشہور عالم شیخ مفید نے اپنی کتاب الارشاد کے صفحہ ۱۸۲ پر عربی زبان میں لکھی ہے فاتبع عليهم و ذكر ان بينه و بين معاوية عهدا و عقدا لايجوزله نقضه حتى تقضى المدة (الارشاد ۱۸۲)۔ غور فرمایئے! آخر کیا بات ہے کہ سن ۶۰ ہجری تک سیدنا امام حسین ﷺ نے تمام خلفاء علیہم الرضوان کی تابعداری کو قبول کیے رکھا مگر سن ۶۱ھ میں جب یزید کی باری آئی تو آپ ﷺ نے تلوار کھینچ لی؟

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی مایہ ناز کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ "تا حق ظاہر بود مرحق را متابع بود و چوں حق مفقود شد شمشیر بر کشید" یعنی جب تک حق ظاہر تھا امام

حسین ؓ حق کے تابع رہے۔ مگر یزید کے دور میں حق رخصت ہو گیا تو آپ ؓ نے تلوار کھینچ لی (کشف المحجوب صفحہ ٦٧)۔

سیدنا امام حسین ؓ کا عمل اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ چاروں خلفاء راشدین اور حضرت امیر معاویہ ؓ میں سے ہر ایک کے ساتھ امام عالی مقام متفق تھے۔ اسی لیے ان کے تابع رہے اور ان سے وظیفہ بھی قبول فرماتے رہے۔ مگر یزید سے متفق نہ تھے اسی لیے اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

کوفیوں کی طرف سے خطوط:

کوفہ کے شیعوں نے حضرت امام حسین ؓ کی خدمت میں بے شمار خط لکھے اور عرض کیا کہ آپ کوفہ میں تشریف لائیں آپ ہی ہمارے امیر ہیں۔ ہم نے یہاں کے حکمرانوں کی اطاعت چھوڑ رکھی ہے اور کوفہ کے والی نعمان بن بشیر کے پیچھے جمعہ تک ادا نہیں کرتے (الاصابہ جلد ا صفحہ ٣٣٢ تحت حسین بن علی، شیعہ کی کتاب جلاء العیون صفحہ ٣٥٦)۔

فبعث اھل العراق الی الحسین الرسل والکتب یدعونه الیھم (البدایہ والنہایہ جلد ٨ صفحہ ١٦٥)۔ جلاء العیون میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ وسائر شیعان او از مومنان و مسلمانان اھل کوفہ یعنی یہ خط کوفہ کے تمام حسینی شیعوں کی طرف سے ہے (جلاء العیون صفحہ ٣٥٦)۔

یزید نے حکومت سنبھالتے ہی اہل مدینہ سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ خصوصاً سیدنا امام حسین ؓ اور سیدنا صدیق اکبر کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ سے بیعت لینے پر زیادہ زور دیا تاکہ ان دونوں معتبر ہستیوں کے بیعت کر لینے کے بعد باقی اہل مدینہ کے لیے بیعت کا راستہ آسان ہو جائے۔ مگر ان دونوں مقدس ہستیوں نے بیعت نہ کی بلکہ راتوں رات مدینہ طیبہ سے نکل کر مکہ شریف چلے گئے۔ فبعث الی الحسین و ابن الزبیر فی اللیل و دعاھما الی بیعة یزید فقالا نصبح و ننظر فیما یعمل الناس و وثبا فخرجا (سیر اعلام النبلاء للذہبی جلد ٣ صفحہ ١٩٨)۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مشورہ:

کوفہ کے شیعوں کی طرف سے اس قدر بے تحاشا خطوط آنے کے بعد امام عالی مقام سیدنا حسین ؓ جیسی ذمہ دار ہستی کے پاس لبیک کہنے کے سواہ کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی آپ ؓ نے صحابہ کرام اور اکابرامت علیہم الرضوان سے مشورہ فرمایا اور انہیں کوفیوں کے خطوط کے انبار دکھائے۔

اسکے باوجود صحابہ کرام علیہم الرضوان بلکہ بعض اہل بیت اطہار نے بھی آپ ؓ کو کوفہ جانے سے منع فرمایا۔ منع کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، امام عالی مقام کے بھائی حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت جابر، حضرت ابوسعید اور حضرت ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث علیہم الرضوان جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ ان بزرگوں کے بیانات سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۱۹۷، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۲ اور المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۵ صفحہ ۹۷۔۹۶ وغیرہ پر موجود ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کے سگے چچازاد بھائی اور سیدنا امام حسین ؓ کے چچا حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ فرمان ملاحظہ فرمایئے۔ آپ ؓ فرماتے ہیں۔

جآء نی حسین یستشیر نی فی الخروج الی ماھھنا یعنی العراق فقلت لولا ان یزروا بی وبک لشبنت یدی فی شعرک. الی این تخرج؟ الی قوم قتلوا اباک وطعنوا اخاک؟ یعنی میرے پاس حسین آئے اور عراق جانے کے بارے میں مجھ سے مشورہ لیا۔ میں نے کہا کہ میرا بس چلے تو میں آپ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر عراق جانے سے روک دوں۔ آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اس قوم کی طرف جس نے آپ کے والد ماجد کو شہید کیا اور بھائی کو نیزہ مارا؟ (المصنف جلد ۱۵ صفحہ ۹۶۔۹۷، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۶۲)۔

سیدنا امام حسین ؓ کے بھائی محمد بن حنفیہ ؓ نے مشورہ دیا کہ آپ کا عراق جانا درست نہیں مگر امام حسین ؓ نے ان کا مشورہ قبول نہ فرمایا۔ اس کے بعد محمد بن حنفیہ ؓ نے اپنی اولاد کو ساتھ جانے سے روک دیا جس کی وجہ سے سیدنا امام حسین ؓ اپنے بھائی محمد بن حنفیہ سے ناراض ہوگئے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۲)۔

شرعی مسائل:

ظالم حکمران کے خلاف کارروائی کرنا شرعاً فرض نہیں بلکہ حق واضح کرنے کے بعد اس سے جان چھڑا کر خاموش ہو جانے کی اجازت ہے۔ اس اجازت کو شریعت کی زبان میں رخصت کہا جاتا ہے۔ اسکے برعکس اگر کوئی بلند ہمت اور بلند رتبہ شخصیت ظالم حکمران کے خلاف ڈٹ جائے تو شریعت اس بات کی بھی اجازت دیتی ہے۔ ظالموں کے خلاف ڈٹ جانے کی اس اجازت کو شریعت کی زبان میں عزیمت کہا جاتا ہے۔ عزیمت کا معنی ہے "مضبوط اور پختہ ارادہ"۔

صحابہ کرام علیہم الرضوان نے امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کو عراق جانے سے منع فرمایا۔ وہ رخصت پر عمل کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس کے برعکس سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے عراق جانا پسند فرمایا۔ آپ اپنے مقام اور مرتبے کے لحاظ سے عزیمت کو ترجیح دے رہے تھے۔ دونوں طرف کے فیصلے میں کوئی عیب نہیں۔ یہ بھی حق ہے اور وہ بھی حق ہے۔ اجتہادی مسائل میں اختلاف ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

شیعہ حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے امام پاک رضی اللہ عنہ کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ اس کے برعکس خارجی حضرات امام حسین رضی اللہ عنہ پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ منع کرنے کے باوجود باز کیوں نہ آئے۔ الحمد للہ ہم نے ثابت کر دیا کہ اہل تشیع اور خارجی دونوں بے ادب اور گستاخ ہیں اور امام حسین اور صحابہ کرام علیہم الرضوان دونوں حق پر ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ خواہ کوفہ جائیں یا مکہ شریف میں رہیں۔ جام شہادت نوش کرنا ہمارا مقدر ہے۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ نے مکہ شریف میں شہید ہو کر یزید کو مکہ کی بے حرمتی کرنے کا موقع نہ دیا۔ بلکہ کوفہ کی طرف بڑھ کر شہادت کو گلے لگایا۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ امام پاک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فقال لان اقتل بمكان كذا وكذا احب الى من ان اقتل بمكة وتستحل بى یعنی میرا کسی دوسری جگہ پر قتل ہونا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ میں مکہ میں قتل کیا جاؤں اور مکہ کی بے حرمتی ہو (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۷۲)۔

تیسری بات یہ ہے کہ کوفہ کے شیعوں نے جس قدر خطوط لکھے تھے اگر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اب بھی ظالم حکمران کے خلاف عوامی دعوت کو قبول نہ فرماتے تو کوئی لوگ قیامت کے دن امام پاک کے

خلاف بیان بازی کر سکتے تھے۔ لہٰذا آپ ؓ نے اپنی ذمہ داری نبھانا ضروری سمجھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مکمل سوچ بوجھ اور مشورے کے بعد جب آپ نے ایک عزم اور ارادہ کر لیا تو اپنے عزم پر ڈٹ گئے۔ اللہ پر توکل کرنے والوں کا یہی طریقہ ہوا کرتا ہے۔ اللہ کریم فرماتا ہے: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ یعنی ان سے مشورہ کریں اور جب کوئی عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کرتے ہوئے ڈٹ جائیں (آل عمران: ۱۵۹)۔

پانچویں بات یہ ہے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے مشورے کو آپ ؓ نے مکمل طور پر نہیں پھینکا بلکہ پہلے احتیاطاً اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو کوفہ بھیجا تا کہ اگر کوفہ والے حضرت مسلم ؓ سے بے وفائی کریں تو ان کا شرعی طور پر منہ بند ہو جائے اور اگر وفا کریں تو صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مطمئن کیا جا سکے۔

حضرت مسلم بن عقیل کی روانگی:

سیدنا امام حسین ؓ نے کوفہ کے حالات کا جائزہ لے کر اطلاع دینے کے لیے اپنے چچازاد بھائی اور بہنوئی حضرت مسلم بن عقیل ؓ کو روانہ فرمایا۔ جب وہ کوفہ پہنچے تو تقریباً بارہ ہزار کوفیوں نے آپ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کر لی (الاصابہ جلد ا صفحہ ۳۳۲)۔

آپ نے حالات سے مطمئن ہو کر سیدنا امام حسین ؓ کو اطلاع دی کہ کوفہ کے حالات ہمارے لیے سازگار ہیں۔ آپ جلد تشریف لے آئیں۔ اس وقت کوفہ کے والی نعمان بن بشیر تھے۔ جب یہ اطلاع سیدنا امام حسین ؓ کو پہنچ گئی تو کوفہ میں حکومت کے حامیوں نے کوفہ کے والی تک حضرت مسلم بن عقیل ؓ کے خلاف شکایت پہنچائی مگر کوفہ کے والی نعمان بن بشیر نے نرمی سے کام لیا اور حضرت مسلم کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس پر حکومت کے حامیوں نے یزید کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ یزید نے فوراً نعمان بن بشیر کو برطرف کر دیا اور اس کی جگہ بصرہ کے والی عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ حضرت مسلم بن عقیل نے حضرت ہانی بن عروہ کے گھر میں قیام کر رکھا تھا۔ تمام کوفیوں نے حکومت کے خوف سے حضرت مسلم بن عقیل کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابن زیاد نے حضرت مسلم اور ہانی بن عروہ رضی

اللہ عنہما کو شہید کر دیا (طبقات ابن سعد جلد ۴ صفحہ ۲۹ تحت عقیل بن ابی طالب)۔ ادھر سیدنا امام حسین ﷺ کو اس واقعہ کی کوئی خبر نہ تھی۔

سیدنا امام حسین ﷺ کی روانگی:

حالات کو ساز گار سمجھتے ہوئے حضرت سیدنا امام حسین ﷺ تقریباً اسّی (۸۰) افراد کا قافلہ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ واقعہ ۳ ذوالحج سنہ ۶۰ھ کا ہے۔ ادھر اسی روز حضرت مسلم بن عقیل ﷺ کو شہید کر دیا گیا تھا۔

کوفہ جاتے وقت راستے میں امام حسین ﷺ کو حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کی افسوسناک خبر ملی۔ اسی راستے میں مختلف لوگوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ ان میں بشیر بن غالب، عبیداللہ بن مطیع اور اہل بیت کے مداح اور مشہور شاعر فرزدق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب نے سیدنا امام حسین ﷺ کو آگے جانے سے منع فرمایا۔ فرزدق نے کہا کہ کوفہ والوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر ان کی تلواریں یزید کے ساتھ ہیں۔

یہ حالات سننے کے بعد امام حسین ﷺ کے ساتھیوں میں مختلف خیالات پیدا ہو گئے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے بھی واپسی کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ لیکن حضرت مسلم بن عقیل ﷺ کے بھائی نے فرمایا کہ ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ طویل گفتگو کے بعد یہی طے پایا کہ کوفہ جانا چاہیے۔ جب قافلہ کوفہ کے قریب پہنچا تو حُر بن یزید سے ملاقات ہوئی۔ حُر کے ساتھ ایک ہزار فوجی سوار تھے۔ اس نے امام حسین ﷺ سے عرض کیا کہ میں آپ کا خیر خواہ اور وفادار ہوں مگر سرکاری ملازمت میری مجبوری ہے۔ مجھے ابن زیاد نے آپ کو گرفتار کر کے اسکے پاس لانے کا حکم دیا ہے۔ میں آپکے ادب واحترام کی وجہ سے آپ کو گرفتار نہیں کرتا۔ لیکن آپ بھی میرے حال پر مہربانی فرمائیں اور کوفہ میں داخل نہ ہوں۔ مجبوراً سیدنا امام حسین ﷺ کو کوفہ میں داخل ہونے کی بجائے قریب ہی میدان کربلا میں پڑاؤ ڈالنا پڑا۔

عبیداللہ بن زیاد نے اہل بیت اطہار علی جدہم وعلیہم الصلوٰۃ والسلام سے جنگ کرنے کے لیے عمرو بن سعد کو ایک ہزار مسلح گھڑ سواروں کے لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ ابن زیاد نے بعد میں مزید کمک

بھی بھیجی اور اس کے لشکر کی تعداد تقریباً بائیس ہزار تک پہنچ گئی۔

گنتی کے مقدس افراد کا مقابلہ کرنے کے لیے اس لاتعداد لشکر کا پہنچ جانا ان لشکریوں کی بزدلی اور اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کی عظمت و شجاعت کا زندہ ثبوت ہے۔ پھر اس پر بھی بس نہیں۔ کوفی فوج کو اس قدر خوف تھا کہ اتنی کثرت کے باوجود باقاعدہ جنگی تدبیریں اور حکمت عملیاں اختیار کی گئیں۔ تین دن تک پانی بند کر دیا گیا۔

سیدنا امام حسین ﷜ کسی صورت بھی جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے اور خصوصاً تلوار چلانے میں پہل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جو حالات نظر آ رہے تھے ان حالات میں مخالفین پر حجت قائم کرنے کی غرض سے آپ نے فرمایا میری تین باتوں میں سے کوئی ایک بات تسلیم کر لو۔

۱۔ مجھے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی بجائے اسلامی سرحدوں پر جا کر کفار کے خلاف جہاد کرنے دو۔

۲۔ یا مجھے مدینہ شریف جانے دو۔

۳۔ یا یزید سے میری ملاقات کرا دو۔ تاکہ میں اس سے خود بات کر کے مصالحت کی صورت نکال سکوں (الاصابہ جلد ۱ صفحہ ۳۳۳، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۰۴)۔

عمرو بن سعد نے یہ باتیں ابن زیاد تک پہنچا دیں۔ مگر ابن زیاد نے ان میں سے ایک بات کو بھی قبول نہ کیا اور امام حسین سے بیعت کا مطالبہ کرتا رہا۔ امام حسین ﷜ نے بیعت سے انکار فرما دیا جس پر کوفیوں نے جنگ چھیڑ دی۔

سیدنا امام حسین ﷜ اور آپ کے ساتھی راتوں کو نمازیں پڑھتے، استغفار اور دعائیں کرتے اور اللہ کی بارگاہ میں عاجزی پیش کرتے رہتے تھے اور دشمنوں کے گھوڑے ان کے اردگرد گھومتے رہتے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۵)۔

دسویں محرم کو سیدنا امام حسین ﷜ نے غسل فرمایا اور زبردست خوشبو لگائی اور بعض دوسرے ساتھیوں نے بھی غسل فرمایا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۵)۔ جنگ شروع ہوئی۔ کربلا کے اردگرد کے مسلمانوں کو جب اس جنگ کی خبر ہوئی تو بہت سے لوگ سیدنا امام حسین ﷜ کا ساتھ دینے کے لیے

میدان میں آگئے اور امام پاک پر اپنی جانیں قربان کردیں۔ سیدنا حضرت حُر بن یزید رضی اللہ عنہ نے بھی یزیدی لشکر کو خیر باد کہہ دیا اور سیدنا امام حسین سے پہلے جام شہادت نوش فرمایا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۸)۔

جنگ کے دوران جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دشمنوں سے کہو جنگ روک دیں تاکہ ہم نماز ادا کرسکیں **دخل علیھم وقت الظھر فقال الحسین رضی اللہ عنہ مروھم فلیکفوا عن القتال حتی نصلی** (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۰)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سمیت نماز خوف ادا فرمائی۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے سوتیلے بھائی اور مولا علی رضی اللہ عنہ کے شہزادے حضرت ابوبکر بن علی، حضرت عمر بن علی، حضرت عثمان بن علی اور حضرت عباس بن علی علیہم الرضوان بھی باری باری شہادت سے سرفراز ہوئے۔ مولا علی رضی اللہ عنہ کے ان تمام شہزادوں کے نام شیعوں کی اپنی کتاب جلاء العیون کے صفحہ ۴۱۴ پر اور بہتر تارے کے صفحہ ۹۸، ۱۰۷، ۱۱۱ پر موجود ہیں اور اہل سنت کی کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۷ وغیرہ پر بھی موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ (علی اصغر) جو شیر خوار بچے تھے۔ امام حسین رضی اللہ عنہ خیمے کے دروازے پر انہیں اپنی گود میں لے کر بیٹھے۔ انہیں بوسے دیئے، الوداع کہنے اور اپنے گھر والوں کو وصیت کرنے لگے۔ بنی اسد کے ایک ظالم شخص نے جس کا نام ابن موقد النار تھا، انہیں تیر مار دیا جو ان کی گردن مبارک میں آکر لگا اور ننھے شہزادے نے جام شہادت نوش کرلیا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۴)۔

بالآخر سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کے لشکر کا تنہا مقابلہ فرمایا۔ اپنے کثیر التعداد بھائیوں، جگر کے ٹکڑوں اور ہمراہیوں کی شہادت کا منظر اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھ چکنے کے باوجود سیدنا امام حسین صبر و استقامت کا پیکر تھے۔ ہمت و شجاعت کی وہ مثال قائم فرمائی کہ جس طرف بھی آپ بڑھتا تھا آپ دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے چلے جاتے تھے۔ جب لاتعداد کوفیوں کو ہلاک کرچکے تو کوفیوں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ فرد واحد ہم ہزاروں کا خون کرڈالے مل کر حملہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ

ان سب نے یک بارگی تیروں کی برسات کر دی۔ سیدنا امام حسین ؓ نے جام شہادت نوش فرمایا اور آپ کا جسم اطہر [illegible] کی پشت سے زمین پر آ گیا۔ سنان بن عمرو، یا شاید خولی بن یزید، یا شاید شمر بن ذی الجوشن نے آگے بڑھ کر آپ ؓ کے سر مبارک کو تن سے جدا کر دیا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۵)۔

سیدنا امام حسین ؓ نے دس محرم سن ۶۱ ھ جمعہ کے دن شہادت پائی۔ آپ کی عمر شریف چھپن سال پانچ ماہ پانچ دن تھی۔ کربلا میں سیدنا امام حسین ؓ کے بہتر ساتھی شہید ہوئے جبکہ یزیدی فوج کے اٹھاسی افراد قتل ہوئے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۷)۔

میدان کربلا سے بچ کر آنے والوں میں صرف ایک نوجوان حضرت سیدنا امام زین العابدین ؓ تھے جو طبیعت مبارک کی ناسازی کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ باقی سب اہل بیت اطہار خواتین تھیں۔ جن میں حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا نام نامی اسم گرامی سر فہرست ہے۔ آپ سیدنا امام حسین ؓ کی سگی بہن تھیں۔

واقعہ کربلا کے بعد:

ابن زیاد نے آپ کے سر مبارک کو کوفہ کے بازار میں پھرایا۔ کوفہ کے شیعوں نے رو رو کر کہرام برپا کر دیا۔ شیعوں کی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ کوفہ والوں کو روتا ہوا دیکھ کر سیدنا امام زین العابدین ؓ نے فرمایا کہ ان ھولاء یبکون علینا فمن قتلنا غیرھم یعنی یہ سب خود ہی ہمارے قاتل ہیں اور خود ہی ہم پر رو رہے ہیں (احتجاج طبرسی جلد ۲ صفحہ ۲۹)۔

حضرت سیدہ طاہرہ زینب صلوۃ اللہ علی جدہا وعلیہا نے فرمایا کہ تم لوگ میرے بھائی کو روتے ہو؟ ایسا ہی کرو۔ روتے رہو۔ تمہیں روتے رہنے کی کھلی چھٹی ہے۔ کثرت سے رونا اور کم ہنسنا۔ یقیناً تم رو کر اپنا کالا پن چھپا رہے ہو۔ جب کہ یہ بے عزتی تمہارا مقدر بن چکی ہے۔ تم آخری نبی کے لخت جگر کے قتل کا داغ آنسوؤں سے کیسے دھو سکتے ہو جو رسالت کا خزانہ ہے اور اہل جنت کے جوانوں کا سردار ہے (احتجاج طبرسی جلد ۲ صفحہ ۳۰)۔ اسی طرح شیعہ کی کتاب مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ کوفہ کے لوگ

شیعہ تھے (مجالس المومنین جلد ۱ صفحہ ۵۶)۔

اس کے بعد ابن زیاد نے آپ ﷜ کے سر مبارک کو اسیران اہل بیت کے ساتھ شمر کی نگرانی میں یزید کے پاس شام بھیج دیا۔ یزید نے جب سر مبارک کو دیکھا تو بہت رویا اور اپنے منہ پر طمانچے مارے (شیعوں کی اپنی معتبر کتاب جلاء العیون صفحہ ۴۴۵)۔

سیدنا امام حسین ﷜ کی شہادت پر یزید رویا اور آپ کے قاتلوں پر لعنت بھیجی (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۹)۔

یزید نے اہل بیت اطہار کی مقدس خواتین رضی اللہ عنھم کو اپنے گھر دار الخلافہ میں بھیجا۔ یزید کے گھر کی خواتین نے ان کا استقبال کیا اور یزید کے گھر والوں نے تین دن تک رونے دھونے اور نوحہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۰۲)۔

ان تمام بیانات سے معلوم ہوا کہ امام حسین ﷜ کے قاتل بھی شیعہ تھے اور ماتم کی ابتداء کرنے والے بھی شیعہ تھے اور ان ماتم کرنے والوں میں یزید اور اس کا خاندان بھی شامل تھا۔ اب اگر امام حسین ﷜ کے غم میں رونے یا ماتم کرنے سے بخشش ہو جاتی ہے تو پھر بخشش کا سرٹیفکیٹ کوفیوں کو بھی مل جائے گا اور یزید کو بھی مل جائے گا۔ یزید نے آپ ﷜ کے سر مبارک کو اور اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کو مدینہ شریف میں اپنے نائب عمرو بن سعید کے پاس بھیجا اور اس نے سر مبارک کو کفن دے کر جنت البقیع میں سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پہلو میں دفن کر دیا (طبقات ابن سعد جلد ۵ صفحہ ۱۷۶، البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۱۱)۔ گویا دھڑ مبارک کربلا میں اور سر مبارک مدینہ منورہ میں دفن ہے۔

سیدنا امام حسین ﷜ کی شہادت کے بعد مدینہ شریف کے لوگوں نے یزید کے خلاف بغاوت کر دی۔ مدینہ شریف کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے یزید کی اطاعت کو اس طرح اتار کر پھینک دیا ہے جس طرح یہ جوتا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ پر جوتوں کا ڈھیر لگ گیا۔ یزید کی فوج نے بے حیائی کی انتہا کر دی۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ یزید کی فوج نے سات سو صحابہ کرام کو شہید کر دیا جن میں مہاجرین اور انصار شامل تھے اور ان کے علاوہ دس ہزار موالی، آزاد اور غلام تابعین شہید کر دیے جنہیں

میں نہیں پہچانتا (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۲۲۹)۔

تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کو حرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ کربلا کے واقعہ سے بھی بڑھ کر ظالمانہ ہے۔ اور یہ واقعہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی عظمت اور اہل بیت سے ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ماتم کی ابتداء: سیدنا امام حسین ؓ نے اپنی شہادت سے پہلے وصیت فرمائی تھی کہ میری شہادت کے بعد ماتم نہ کیا جائے (البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸۵)۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ماتم کی ابتداء یزید اور اس کے اہل خانہ کی طرف سے اسی وقت کر دی گئی تھی، لیکن بعد میں ماتم کو باقاعدہ مذہبی عبادت کے طور پر ایک شیعہ حکمران معز الدولہ نے بغداد میں سن ۳۵۲ھ میں رائج کیا اور دس محرم کو بازار بند کر کے ماتم کرنے اور منہ پر طمانچے مارنے کا حکم دیا۔ اور شیعہ کی خواتین کو چہرے پر کالک ملنے، سینہ کوبی اور نوحہ کرنے کا حکم دیا۔ اہل سنت ان لوگوں کو منع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اس لیے کہ حکمران شیعہ تھا (شیعوں کی کتاب منتہی الآمال جلد ا صفحہ ۴۵۲، تتمۃ المنتہی صفحہ ۳۹۱ اور اہل سنت کی کتاب البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۲۷۰)۔

صرف رونا جائز ہے یا نہیں؟:

بعض عوام یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ماتم کرنا ہی منع ہے۔ انکے خیال میں رونے دھونے کی حد تک غم حسین منانا جائز بلکہ کار ثواب اور بخشش کا ذریعہ ہے۔ اسکا جواب اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

کسی پیارے کی وفات پر وقتی طور پر رونا آ جانا محبت اور رحم کے جذبے کا نتیجہ ہے اور یہ بالکل درست اور جائز ہے۔ یہی وہ رونا ہے جس کی احادیث میں صاف اجازت موجود ہے خواہ فوت ہونے والا کوئی بھی ہو۔ لیکن ہر سال کے بعد رونے رلانے بیٹھ جانا ایک عجیب حرکت ہے یہ کام نہ اپنوں کے حق میں جائز ہے اور نہ دوسروں کے حق میں۔ اس دنیا میں ہر کسی کے بہن بھائی، ماں باپ، اولاد اور رشتہ دار فوت ہوتے رہتے ہیں، مرشد اور استاد فوت ہوتے رہتے ہیں، ان سب کے لیے ایصال ثواب کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے مگر سال کے سال رونے کا دھندا نہیں کیا جاتا۔

واقعہ حرہ میں مدینہ منورہ میں سات سو صحابہ کرام علیہم الرضوان کا قتل عام ہوا۔ حضرت مولا علی ﷺ کو رمضان شریف میں بھوکے پیاسے شہید کر دیا گیا۔ حضرت عثمان غنی ﷺ کو چالیس دن تک ان کے گھر میں محصور کر کے اور ان کا پانی بند کر کے پیاس کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ حضرت عمر فاروق ﷺ کو مسجد نبوی میں نماز پڑھتے ہوئے چھرا مار کر شہید کر دیا گیا۔ ظلم کی یہ داستانیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے موقع پر ہم سال کے سال نہ ماتم کرتے ہیں اور نہ روتے ہیں۔

سب کچھ چھوڑیے۔ احادیث میں آتا ہے کہ دنیا کا سب سے تاریک دن وہ تھا جس دن حبیب کریم ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اگر ہر سال غم منانا اور رونا رلانا جائز ہوتا تو اللہ کی عظمت کی قسم ربیع الاول کو ہر سال اس دنیا میں کہرام برپا ہو جایا کرتا۔ اب ہم ہر سال میلادِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشی تو ضرور مناتے ہیں مگر عین اُسی دن (سوموار کو) حضور نبی کریم ﷺ کا وصال شریف بھی ہوا تھا ہم اس کی وجہ سے نہ ماتم کرتے ہیں اور نہ ہی صرف روتے ہیں۔

اہل سنت پر امام حسین ﷺ سے عدم محبت کا الزام لگانے والے غور کریں کہ اہل سنت کی مصطفیٰ کریم ﷺ کے ساتھ محبت کو تو کوئی مائی کا لال چیلنج نہیں کر سکتا۔ آخر حضور کے وصال کے موقع پر اہل سنت کیوں نہیں روتے؟ یہاں سے بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ہر سال رونے لگ جانا واقعی ایک نامعقول اور غیر شرعی حرکت ہے اور جو لوگ سنی کہلانے کے باوجود ہر سال یہ دھندا کرتے ہیں انہیں روافض کا ٹیکہ لگ چکا ہے۔ اللہ کے پیاروں کا طریقہ تو یہ ہے کہ پیاروں کی عین وفات کے دن بھی صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں اور آنسوؤں پر بھی کنٹرول رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ہاں البتہ بے اختیار آنسو نکل آنا ایک الگ بات ہے۔

مولا علی ﷺ محبوب کریم ﷺ کو غسل دے رہے تھے اور فرما رہے تھے: یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ کی وفات سے ہم نبوت غیب کی باتوں اور آسمان کی خبروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس مصیبت کے سامنے دوسری تمام مشکلات آسان نظر آرہی ہیں اور ہر شخص اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ اگر آپ نے ہمیں صبر کا حکم نہ دیا ہوتا اور بے تابی سے منع نہ فرمایا ہوتا تو ہم آپ پر رو رو کر

اپنی آنکھوں کا سارا پانی ختم کر دیتے۔ آپ سے جدائی کا درد اور اندوہ ہمیشہ ہمارے سینے میں رہے گا۔ آپ کے دکھ کے سامنے کسی دوسرے دکھ کی کوئی اوقات نہیں۔ کیا کریں، فوت ہونے والوں کو واپس نہیں بلایا جا سکتا اور موت کو واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔ میرے ماں باپ فدا ہوں، اپنے رب کے پاس جا کر ہمیں یاد رکھنا اور خود بھی ہم پر نظر رکھنا (نہج البلاغہ صفحہ ۳۳۶ مطبوعہ ایران / قم)۔

اس خطبے کو بار بار پڑھیے۔ یہ خطبہ ہم نے مکمل نقل کر دیا ہے۔ اس کے اول یا آخر سے کچھ نہیں چھوڑا۔ اس خطبے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مولا علی شیر خدا ﷺ نے محبوب کی عین وفات کے موقع پر بھی آنسوؤں پر کنٹرول رکھا ہے۔ چہ جائیکہ ہر سال کے بعد دوبارہ رونے دھونے کا کام شروع کر دیا جائے۔

حبیب کریم ﷺ نے فرمایا: تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ یعنی موت مومن کے لیے تحفہ ہے (مشکوٰۃ صفحہ ۱۴۰)۔ آپ خود سوچیے کہ جب سادہ سی موت مومن کے لیے تحفہ ہے تو پھر شہادت کی موت کتنا بڑا تحفہ اور کتنا بڑا اعزاز ہو گی اور شہید ہونے والے اس پر کس قدر مسرور اور مطمئن ہوں گے۔

محبوب کریم ﷺ فرماتے ہیں: وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ یعنی اللہ کی قسم میری یہ دلی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کر دیا جاؤں (مسلم، بخاری، المستند صفحہ ۲۳۵)۔ یہ ہے اس مقدس ہستی کا فرمان جس نے اپنے ہاتھوں سے گلستان زہرا کی آب یاری کی اور اہل بیت کی تربیت پر زور نبوت صرف کیا۔ خاندان نبوت کو شہادت کے ان فضائل کا دوسروں سے زیادہ علم تھا۔ پھر انہوں نے اپنی شہادت یا اپنے پیاروں کی شہادت پر کیوں نہ فخر کیا ہو گا اور انہوں نے کیوں کر ماتم کیا ہو گا اور کیوں کر ہر سال رونے کی تعلیم دی ہو گی؟

اہل سنت کا طریقہ:

اہل سنت و جماعت کے نزدیک جس طرح تمام صحابہ، اہل بیت اور دیگر اولیاء کرام کی سیرت

اور احوال کے لیے جلسے منعقد کرنا اور عرس منانا جائز بلکہ مستحب اور ثواب کا کام ہے اسی طرح سیدنا امام حسین ﷜ اور شہداء کربلا کی یاد میں محافل کا انعقاد بھی نہایت پسندیدہ ہے۔

تذکرۃ الصالحین کفارۃ للسیئات اللہ کے پیاروں کی یاد گناہوں کا کفارہ ہے۔ اس دوران اگر کسی کو اتفاقیہ رونا آ جائے تو ایسے رونے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن تکلف کے ساتھ جان بوجھ کر رونے رلانے کی کوشش کرنا اور زبردستی رلانے والے قصے گھڑ گھڑ کر بیان کرنا اور اس رونے کو کار ثواب سمجھتے ہوئے رونے دھونے کی مجالس یا مجالس عزا قائم کرنا اور پھر ہر سال کے بعد رونے بیٹھ جانا اسلام میں بے صبری اور خدا سے دوری کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ ایسی حرکتوں سے جہاد سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے۔ یاد رکھیے اس طرح رونے سے اگر کسی کی بخشش ہو جاتی ہو تو ان رونے والوں میں یزید بھی شامل تھا۔ اگر یزید آنسو بہانے اور اپنے منہ پر طمانچے مارنے کے باوجود بدبخت ہے تو یقین رکھیے کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت اور سیدنا امام حسین ﷜ سمیت تمام صحابہ واہل بیت علیہم الرضوان کی غلامی کے بغیر غم حسین کا ڈھونگ کچھ کام نہ دے گا۔ اسلام ایک سنجیدہ دین ہے اور ایسی چھچھوری اور غیر ذمہ دارانہ تعلیمات سے پاک ہے۔

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

آج کل واقعہ شہادت بیان کرتے وقت اکثر بے سروپا اور جھوٹی روایات کو بیان کیا جاتا ہے۔ ایسی مجالس میں جانا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے۔ اور اگر واقعہ شہادت بیان کرنے کا مقصد غم پروری اور زبردستی کا رونا دھونا ہو تو یہ نیت بھی شرعاً بری ہے۔ غم اگر ہو بھی تو اسے دل سے دور کرنے کا حکم ہے۔ نہ یہ کہ غم سرے سے ہو ہی نہیں اور محرم کے دنوں میں اپنے اوپر زبردستی غم لاگو کر کے تکلف سے کام لے کر رونے کی کوشش کی جائے یا رونے دھونے کو عبادت سمجھا جائے۔ یہ سب روافض کی بدترین بدعات ہیں۔ اہل سنت پر لازم ہے کہ ان چیزوں سے بچ کے رہیں۔ اللہ کی قسم اگر اس رونے دھونے میں کوئی خوبی ہوتی تو حضور پر نور سید عالم ﷺ کی وفات شریف پر غم کرنا اور رونا ہم پر سب سے زیادہ لازم ہوتا۔ دیکھو! سرکار دو عالم ﷺ کی ولادت اور وفات ایک ہی مہینے میں ہوئی لیکن علماء کرام نے ولادت شریف پر

خوشی منانا پسند فرمایا ہے اور وفات شریف پر غم منانا جائز نہیں سمجھا (رسالہ تعزیہ داری صفحہ ۵ از فاضل بریلوی رحمت اللہ علیہ بالتسہیل)۔

خطیبوں سے گذارش:

ہمارے بعض خطیب حضرات نے بھی رونے رلانے کا دھندا شروع کر رکھا ہے اور اپنی تقریر میں رنگ بھرنے کے لیے شیعہ کی روایات کو بڑے جوش وخروش کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اہل بیت اطہار علیہم الرضوان کی طرف بے شمار من گھڑت باتوں اور قصے کہانیوں کو منسوب کر کے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ بے شمار اقوال گھڑ کے مولا علی ﷛ کی طرف منسوب کر دیے گئے۔ چنانچہ امام محمد بن سیرین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ان اکثر مایروی عن علی الکذب یعنی حضرت علی ﷛ کی طرف منسوب کی جانے والی اکثر باتیں جھوٹی ہوتی ہیں (بخاری جلد ا صفحہ ۵۲۶)۔ اسی طرح تقیہ کی آڑ میں تمام آئمہ اہل بیت کی طرف جھوٹ منسوب کیے گئے ہیں۔

چنانچہ حضرت امام جعفر صادق ﷛ فرماتے ہیں کہ لوگ ہمارے بارے میں جھوٹی باتیں گھڑنے پر عاشق ہو چکے ہیں۔ انہوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنا ان پر فرض کر رکھا ہے اور اللہ نے ان کو یہی دھندا سونپا ہوا ہے۔ میں ان میں سے کسی شخص کو اندر بیٹھ کر ایک حدیث بتاتا ہوں تو وہ باہر جا کر اسکو دوسرے معانی میں ڈھال لیتا ہے (شیعہ کی کتاب رجال کشی صفحہ ۱۳۴)۔

جھوٹ کے اسی سلسلے کی کڑی کربلا کے حالات وواقعات ہیں جنہیں لوگ اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ خود موقع پر موجود تھے۔ حالانکہ کربلا سے بچ کر آنے والے سیدنا امام زین العابدین ﷛ کے علاوہ کوئی شخص کربلا کے صحیح حالات بیان نہیں کر سکتا۔ اہل بیت کی خواتین پردہ میں تھیں۔ امام زین العابدین کی طبیعت مبارک ناساز تھی۔ باقی سب حضرات شہید ہو گئے۔ اب اس واقعہ کو کسی حد تک یا تو امام زین العابدین ﷛ بیان فرما سکتے ہیں یا پھر امام حسین ﷛ کے قاتل اور دشمن بیان کر سکتے ہیں۔

عصر حاضر کے بعض اہل سنت مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں ہر کچی پکی روایت کو لکھ ڈالا ہے۔ ان حضرات سے درخواست ہے کہ تحقیق سے کام لیجیے۔ اس موضوع پر نہایت معتبر اور مستند اقوال پر

اعتماد فرمایئے اور ماتمی انداز سے گریز کیجیے۔ خصوصاً خاکِ کربلا اور اوراقِ غم جیسی کتابوں سے محققین کو دور رہنا چاہیے۔ بعض خطیب کہتے پھرتے ہیں کہ اٹھاون سال کی عمر میں حضرت امام حسین ﷺ کے جسم مبارک پر ایک بال بھی سفید نہیں تھا مگر جیسے ہی سیدنا علی اصغر ﷺ کی گردن سے تیر کھینچا تو سارے کے سارے بال سفید ہو گئے۔ خطیبوں کی یہ ماتمی تحقیق دین سے بالکل دور اور بیگانہ ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت امام حسین ﷺ کا سر مبارک جب کاٹ کر ابن زیاد کے پاس لایا گیا تو آپ کے بالوں پر سیاہ خضاب لگا ہوا تھا و کان مخضوبا بالوسمة (بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۳۰)۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے بال مبارک پہلے ہی سفید تھے۔

بعض کہتے پھرتے ہیں کہ مرج البحرین۔ سے مراد مولا علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما ہیں اور اللؤلؤ والمرجان سے مراد حسنین کریمین علیہما الرضوان ہیں۔ حالانکہ مرج البحرین سے آگے بینھما برزخ لایبغیان کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر شیعوں نے گھڑی ہے (مقدمہ تفسیر ابن تیمیہ صفحہ ۲۹)۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جاہلانہ تاویل ہے جو شیعہ نے کی ہے (الاتقان جلد ۲ صفحہ ۱۸۰)۔ ملا علی قاری علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ مرج البحرین اور اللؤلؤ والمرجان کی یہ تاویل شیعہ جیسے جاہل اور احمق لوگوں کا کام ہے فانہ من تاویل الجھلة والحمقاء کالروافض (مرقاۃ جلد ۱ صفحہ ۲۹۲)۔

عوام اہل سنت سے درخواست ہے کہ دسویں محرم کے دن شہداء کربلا کے لیے قرآن خوانی کیجیے۔ درود شریف، استغفار اور کلمہ طیبہ پڑھ پڑھ کر ایصال ثواب کیجیے۔ شہداء کی طرف سے کھانے پینے کی چیزیں خیرات کیجیے۔ امام پاک ﷺ کا ذکر خیر سننے کے لیے اہل سنت کی محافل میں جایا کیجیے۔ اس مقصد کے لیے شیعوں کی مجالس عزا میں جانا ایمان کی تباہی ہے۔ حسین ہمارے ہیں اور ہم حسین کے ہیں۔ کسی دوسرے کو محبت حسین کا ٹھیکیدار مت سمجھیے۔

علیٰ جدہ و ابیہ و اخیہ و علیہ الصلوۃ والسلام

واقعہ کربلا سے ملنے والے اسباق:

1۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے خلفاء راشدین علیہم الرضوان کی مخالفت نہ کی اور یزید کی مخالفت کی۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اہل حق کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اور اہل باطل کے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

2۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے مشورہ لیا اور راستے میں اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ لیا۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ اہم کام سرانجام دینے کے لیے مشورہ کر لینا چاہیے۔

3۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کا مقابلہ کیا اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم نے رخصت پر عمل فرمایا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جتنا کسی کا رتبہ بڑا ہوتا ہی اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

4۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کا حرمین شریفین میں جنگ کرنے کی بجائے کوفہ چلے جانا ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ حرمین شریفین کی بے ادبی سخت منع ہے۔

5۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مختلف تجویزیں پیش فرما کر جنگ کو ٹالنے کی کوشش فرمائی۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ سے گریز کرنا چاہیے اور پہل ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

6۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا میں نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا۔ اپنے پیاروں کو شہید ہوتا دیکھ کر بھی ماتم اور نوحہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اہل بیت کی خواتین علیہم الرضوان نے بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اللہ کریم کی طرف سے آنے والے امتحانوں پر صبر کرنا چاہیے اور کسی قسم کا واویلا یا ماتم نہیں کرنا چاہیے۔ جو کامل ہوتے ہیں وہ رضا پر راضی رہتے ہیں۔

7۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی رات کو ذکر و عبادت میں مصروف رہے اور عین میدان جنگ میں بھی نماز کو یاد رکھا۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مشکل وقت میں اللہ کریم جل مجدہٗ کو کثرت سے یاد کرنا چاہیے اور ہر حال میں نماز کی پابندی کرنی چاہیے۔

اللھم صل علی سیدنا ومولٰنا محمد وعلی آلہ وعترتہ

وصحبہ وازواجہ واحبابہ وسلم

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

کچھ علم حدیث کے بارے میں

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی ☆

حضور اکرم نور مجسم شفیع المذنبین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ ہی زمین پر تنہا وہ ہستی ہیں جن کی طرف تا قیامت ہدایت کیلئے رجوع کیا جاتا رہے گا۔ حضور ﷺ کے توسط سے ہمیں اللہ تعالیٰ عزوجل کی آخری کتاب ملی۔ اور آپ ہی کے اسوہ حسنہ سے یہ متعین ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں سے کیسا طرز عمل مطلوب ہے۔ یہ اسوہ حسنہ اصطلاحی مفہوم میں سنت کہلاتا ہے۔ جو قرآن مجید کے ساتھ دین کا دوسرا ماخذ ہے۔ حضور ﷺ کی اس مرکزی حیثیت کا تقاضا ہے کہ آپ کو ہدایت کا سرچشمہ مان کر جملہ امور میں آپ کی سنت سے رجوع کیا جائے۔ آپ ﷺ سے اسی تعلق کی بناء پر حدیث کا وہ عظیم الشان علم وجود میں آیا جو مسلمانوں کا طرہ امتیاز ہے۔

مسلمان اہل علم اس بات سے کبھی غافل نہیں رہے کہ کسی قول یا فعل کی حضور ﷺ کی طرف نسبت میں کیا نزاکتیں ہیں۔ اسلیے انھوں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ اس انتساب کو ممکنہ حد تک ہر شک وشبہ سے بالاتر بنا دیا جائے۔ ان کی انھیں کوششوں کا حاصل حدیث کے وہ علوم ہیں جن میں ایک طرف درایت کے پیمانے متعین کیے گئے تو دوسری طرف اسماء الرجال کا علم وجود میں آیا جس کے تحت ان تمام لوگوں کے احوال مرتب کیے گئے جو کسی طرح بھی روایت حدیث سے متعلق تھے۔ علم ودیانت، حسب ونسب ہر زاویے سے ان خواتین وحضرات کے درجات کا تعین کیا گیا۔ جن کی بنیاد پر روایت کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں حکم لگایا جا سکتا ہے۔ روایت کو پرکھنے کا یہ عمل مسلمان محدثین کی غیر معمولی کاوشوں کے نتیجے میں ایک نہایت اعلیٰ وارفع علمی مقام تک پہنچا۔ آج ہر علم کی طرح اس کی اپنی اصطلاحیں ہیں اور اپنی زبان۔

0344-7519992 (☆

کوئی علم جب اس سطح پر پہنچ جاتا ہے تو فہم عام کے لیے وہ شرح و وضاحت کا محتاج ہوتا ہے۔یوں لغات اور تشریح لٹریچر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ہمارے دین کی بنیاد قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ پر ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے دونوں بنیادوں کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے۔قرآن کریم کے بارے میں تو ارشاد باری تعالیٰ کی وضاحت موجود ہے!

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔(سورۃ الحجر آیت نمبر ۹) ترجمہ: ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔اسی طرح نطق رسول کو بھی وحی قرار دیا گیا۔قرآن کریم میں ہے!

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔(سورۃ النجم آیت ۳،۴) ترجمہ: اور نہ وہ اپنی خواہش سے بات کہتے ہیں وہ تو وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔

امام احمد بن حسین علی بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں!"سنت اللہ تعالیٰ کے فرمان کے قائم مقام ہے"۔(مفتاح الجنۃ ص ۳۷) جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے!

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ O ۔(سورۃ النحل ۴۴)

ترجمہ: یہ ذکر ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں۔اس طرح سنت بھی قرآن کے ساتھ ساتھ محفوظ ہے کیونکہ سنت بھی اس ذکر میں سے ماخوذ ذکر ہے۔سنت کی حفاظت کا سب سے اہم ہتھیار سند ہے۔سند کے بغیر حدیث کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے!"الاسناد عندی من الدین ولو لا الاسناد لقال من شاء ماشاء"۔(مقدمہ صحیح مسلم شریف ص ۱۱) ترجمہ: میرے نزدیک سند دین کا حصہ ہے اور اگر سند نہ ہوتی تو جو چاہتا کہہ ڈالتا۔

امام عبداللہ الحاکم النیشاپوری مذکورہ بالا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں!"اگر اسناد نہ ہوتیں اور محدثین کرام ان کو طلب نہ کرتے اور کثرت سے یاد نہ رکھتے تو اسلام کی علامتیں مٹ جاتیں۔جھوٹی احادیث گھڑ لی جاتیں،اسناد حدیث کو الٹ پلٹ کر دیا جاتا۔اور اس طرح اہل بدعت غالب آجاتے۔کیونکہ اگر احادیث کو اسناد سے بے نیاز کر دیا جائے تو وہ بالکل بے بنیاد رہ جائیں گی"۔(معرفۃ علوم الحدیث ص ۶)

رسول اللہ ﷺ کے فرامین و افعال کو اگر پوری صحت اور وقت نظر سے منتقل کرنا ہو تو لازم ہے کہ صحیح سند کو ملحوظ رکھا جائے اور صحت سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایت ثقہ اور عادل راویوں سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچے۔ اس لیے راقم اس مضمون کے اندر علم حدیث کے بارے میں بنیادی باتوں کو قارئین (خاص وعام) کو روشناس کرانے کی کوشش کرے گا۔

حدیث کے دو حصے ہوتے ہیں:

۱)سند حدیث یا روایت حدیث (۲)متن حدیث

۱)**سند حدیث**:۔ حدیث بیان کرنے والے راویان اس حصہ کو سند حدیث کہتے ہیں۔

۲)**متن حدیث** :۔ جہاں پر راویان حدیث کا اختتام ہوتا ہے اور ''قال قال رسول اللہ ﷺ'' کا آغاز ہوتا ہے یہ حصہ متن حدیث کہلاتا ہے۔ کبھی ایک راوی حدیث بیان کرتا ہے تو یہ خبر واحد یا احاد کہلاتی ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں متواتر سے مراد وہ حدیث ہے جسے اتنی کثیر تعداد نے روایت کیا ہو جس کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہ ہو یعنی متواتر میں تعداد کی کثرت اور ان کا عادۃً جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔

<u>طرق روایت کے لحاظ سے تقسیم حدیث</u>

حدیث
- متواتر
  - لفظی
  - معنوی
- آحاد
  - مشہور
  - عزیز
  - غریب (فرد)
    - فرد مطلق
    - فرد نسبی
      - ثقہ راوی کے حوالے سے
      - مخصوص شہر کے حوالے سے
      - مخصوص راوی کے حوالے سے
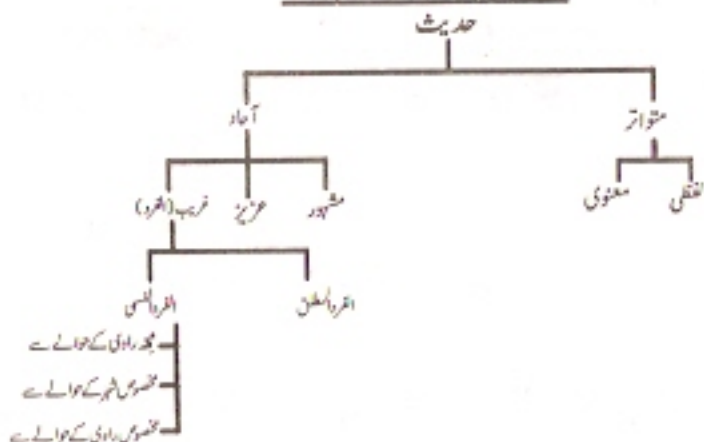
(جاری ہے)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

کیا یزید جنتی ہے؟

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

کچھ عرصہ سے بعض لوگوں نے یزید بن معاویہ کو جنتی ثابت کرنے کا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے اور اس کے لیے بخاری شریف کی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یوں یزید کو امیر المومنین اور رحمۃ اللہ علیہ کہنے کی دلیل بنائی جاتی ہے۔ لہذا قارئین کرام کے سامنے اس حدیث سے متعلق گزارشات پیش خدمت ہیں۔

سب سے پہلے بخاری شریف کی حدیث ملاحظہ فرمایئے:

قال النبی ﷺ اول جیش من اُمتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم ۔ ترجمہ: حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا! میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر روم کے شہر پر حملہ کرے گا اس کی مغفرت فرما دی گئی ہے۔ ۱

بخاری شریف کی درج ذیل حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے!'' قال محمود بن الربیع فحدثتھا قوما فیھم ابو ایوب الانصاری صاحب رسول اللہ ﷺ فی غزوتہ الّتی توفی فیھا و یزید بن معاویۃ علیھم بأرض الروم ۔۲ ترجمہ: حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک قوم کو حدیث بیان کی جس میں حضور ﷺ کے صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ارض روم کے غزوات میں انتقال فرما گئے تھے اور یزید بن معاویہ اس غزوہ کا امیر تھا۔

جواباً گذارش ہے کہ ان روایات سے یزید کے جنتی ہونے کا استدلال کرنا کئی وجوہ سے باطل ہے:

۱) مغفرت کی بشارت والی حدیث میں قسطنطنیہ کے الفاظ کسی کتاب میں نہیں۔

۲) بشارت والی حدیث میں ہے کہ جو پہلا لشکر قیصر روم کے شہر پر حملہ کرے گا وہ مغفور لھم ہوگا۔

۳) یزید بن معاویہ اس لشکر میں شامل تھا جس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ شامل تھے اور وہیں انکی وفات ہوئی۔

۴) یہ لشکر آخری غزوہ کا تھا جو ۵۲ ہجری کو ہوا۔

۵) محدثین نے اس کی شرح کرتے ہوئے کیا یزید کو مغفور لھم میں شامل کیا؟

قیصر روم پر پہلا غزوہ اور بشارت مغفور لھم:

۱) حافظ ابن کثیر دمشقی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں! "۳۲ ہجری میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے بلاد روم پر چڑھائی کی۔ یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک پہنچ گئے۔ ۳

حافظ ابن کثیر دوسرے مقام پر لکھتے ہیں! "خلیج قسطنطنیہ کی جنگ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں ۳۲ ہجری میں ہوئی اور وہ خود اس سال لوگوں پر امیر تھے"۔

اسی طرح درج ذیل کتابوں میں بھی ہے کہ وہ غزوہ ۳۲ ہجری میں ہوا۔

۱) المنتظم از ابن جوزی ۱۹/۵ ۲) تاریخ طبری ۳۰۴/۴ ۳) العبر از امام ذہبی ۲۴/۱

۴) تاریخ اسلام امام ذہبی یزید کی اس وقت عمر تقریباً چھ سال تھی۔ ۴

امام ذہبی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! "فیھا کانت وقعة المضیق بالقرب من قسطنطنیة و امیرھا معاویة "۔ اس سن میں مضیق کا واقعہ ہوا جو کہ قسطنطنیہ کے قریب ہے اور اس کے امیر "معاویہ" رضی اللہ عنہ تھے۔ ۵۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حملہ دور عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں کیا۔

۲) اس حدیث میں مدینة قیصر سے مراد "حمص" ہے نہ کہ قسطنطنیہ لہذا بشارت مغفرت کے اہل حمص پر حملہ کرنے والے مجاہدین ہیں۔ نہ کہ مجاہدین قسطنطنیہ۔ اور حمص پر حملہ ۱۵ ہجری میں ہوا۔ جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت تھا۔

حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! "پندرہ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک لشکر حمص روانہ کیا اور بعد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ سخت سردیوں کے موسم میں مسلمانوں نے حمص کا محاصرہ کیا۔ سردیوں کے

اختتام تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حمص فتح کر لیا۔ حضرت بلال حبشی حضرت مقداد رضی اللہ عنہم اور دیگر امراء کے ذریعے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس فتح کی خوشخبری اور خمس روانہ کیا۔ ۷ے

شیخ الاسلام محمد صدر الصدور نے بھی ''مدینہ قیصر'' سے مراد ''حمص'' لیا ہے فرماتے ہیں! ''بعضے تجویز کنندہ کہ مراد 'بمدینہ قیصر' مدینہ باشد کہ قیصر در آنجا بود روزی کہ فرمود ایں حدیث را آنحضرت وآں حمص است کہ در آں وقت دار مملکت او بود واللہ اعلم''۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ شہر قیصر سے مراد وہی شہر ہے کہ جہاں قیصر اس روز تھا جس روز حضور ﷺ نے یہ حدیث فرمائی اور یہ شہر حمص تھا جو اس وقت قیصر کا دار السلطنت تھا۔ واللہ اعلم۔ ۷ے

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں! ''وجوز بعضهم ان المراد بمدينة قيصر المدينة التي كان بها يوم قال النبي ﷺ تلك المقالة وهي حمص وكانت دار مملكته اذ ذاك''۔ اور بعض علماء کے نزدیک مدینہ قیصر سے مراد وہ شہر جہاں قیصر اس دن تھا۔ (یعنی جو اس کا دار السلطنت تھا) جس دن حضور ﷺ نے یہ فرمان فرمایا تھا وہ حمص ہے جو اس وقت انکا دار السلطنت تھا۔ ۸ے

اس وقت ۱۵ ہجری میں یزید پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ بعض مورخین محدثین نے یزید بن معاویہ کو اول جیش کا امیر لکھا ہے۔ یہ سہو ہوا ہے کیونکہ وہ امیر یزید بن فضالہ بن عبید تھے یہاں یزید بن معاویہ کا نام راوی کی غلطی ہے۔

حافظ ابن کثیر دمشقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ''عمران بن اسلم کہتے ہیں کہ حضرت ابو ایوب انصاری بھی ہمارے لشکر میں شامل تھے۔ وكنا بالقسطنطنية وعلى اهل مصر عقبة بن عامر و على اهل الشام رجل يزيد ابن فضالة ابن عبيد''۔ اور ہم قسطنطنیہ میں تھے۔ اہل مصر پر عقبہ بن عامر اور اہل شام پر یزید بن فضالہ بن عبید امیر تھے۔ ۹ے

سنن ابوداؤد کی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو! ''حدثنا احمد بن عمرو بن السرح نا ابن وهب نا حيوة بن شريح و ابن لهيعه عن يزيد بن ابي حبيب عن اسلم ابي عمران قال غزونا من

السمدينة يزيد القسطنطنية وعلى الجماعة عبد الرحمن بن خالد بن وليد ''۔ابوعمران کا بیان ہے کہ ہم جہاد کرنے کیلیے مدینہ منورہ سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے اور سپہ سالار عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید تھے۔۱۰

اس کے علاوہ ایک اور روایت بھی یہ اشارہ کرتی ہے کہ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید لشکر کے امیر تھے:

''حدثنا سعيد بن منصور ثنا عبد الله بن وهب قال اخبرني عمر بن الحارث عن بكير بن الاشج عن ابن الاشج عن ابن تفلى قال غزونا مع عبد الرحمن بن خالد بن الوليد فاتي باربعة اعلاج من العدو د فامرهم فقتلوا صبرا قال ابو داؤد قال لنا غير سعيد عن ابن وهب في هذا الحديث قال بالنبل صبرا فبلغ ذالک ابا ايوب الانصاري قال سمعت رسول الله ﷺ ينهي عن قتل الصبر فوالذي نفسي بيده لو كانت دجاجة ماصبر تها فبلغ ذالک عبد الرحمن ابن خالد بن الوليد فاعتق اربع رقاب ''۔بکیر بن اشج نے ابن تفلی سے روایت کی ہے کہ ہم نے عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی معیت میں جہاد کیا تو دشمن کے چار قیدی لائے گئے جن کے متعلق آپ نے حکم دیا تو انھیں باندھ کر قتل کیا گیا۔امام ابوداؤد نے فرمایا کہ سعید کے علاوہ دوسروں نے ابن وھب کے واسطے سے یہ حدیث ہم سے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ باندھ کر تیروں کے ساتھ۔جب یہ بات ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انھوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرماتے ہوئے سنا۔پس قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر مرغی بھی ہو تو اسے نہ باندھوں گا۔جب یہ بات عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید کو پہنچی تو انھوں نے چار غلام آزاد کیے۔۱۱

بشارت والی حدیث اور محدثین: بشارت والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے محدثین کرام نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے کہ یزید قطعاً اس بشارت کا مصداق نہیں ہے اور مغفرت عموم سے بالکل خارج ہے۔مگر افسوس کہ اکثر غیر مقلدین اور دیوبندی مکتبہ فکر کے علماء نے اس حدیث سے یہی باور کرایا ہے کہ یزید جنتی ہے اور اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔جیسے ''رشید ابن رشید'' نامی کتاب

پر ان دونوں مکاتب فکر کے علماء کی تصدیقات ہیں۔ اسی طرح دیگر کئی کتب جو یزید کو امیر المومنین اور رحمۃ اللہ علیہ ثابت کرنے کیلئے لکھی گئی ہیں۔ ان میں محدثین کی نامکمل عبارات لکھ کر لوگوں کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ محدثین کی تصریحات ملاحظہ فرمایئے۔

''قوله قد اوجبوا فعلوا وجبت لهم به الجنة قوله مدينة قيصر اى ملك الروم قال قسطلانى كان اوّل من غزا مدينة قيصر يزيد ابن معاوية و جماعة من سادات الصحابة كابن عمر و ابن عباس و ابن الزبير و ابى ايوب انصارى و توفى بها ابو ايوب اثنتين و خمسين من الهجرة انتهى كذا قاله فى الخير البارى و فى الفتح قال المهلب فى هذا الحديث منقبة لمعاوية لانه اوّل من غزا البحر و منقبة لولده لانه من غزا مدينة قيصر و تعقبه ابن التين و ابن المنير بما حاصله انه لا يلزم من دخوله فى ذالک العموم ان لا يخرج بدليل خاص اذ لا يختلف اهل العلم ان قوله ﷺ مغفور لهم مشروط بان تكونوا من اهل المغفرة حتى لو ارتد واحد ممن غزاها بعد ذالک لم يدخل فى ذالک العموم اتفاقاً فدل على ان المراد مغفور لمن وجد شرط المغفرة فيه منهم''۔ ترجمہ: ''قوله قد اوجبوا'' ان کے لیے جنت واجب ہے۔ مدینہ قیصر یعنی ملک روم قسطلانی فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے مدینہ قیصر پر یزید بن معاویہ نے جہاد کیا۔ اس کیساتھ سادات صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ مثلاً حضرت ابن عمر، ابن عباس، ابن زبیر اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہما۔ اور آپ کا انتقال بھی ۵۲ ہجری میں وہیں پر ہوا۔ خیر الباری اور فتح الباری میں ہے کہ مہلب نے کہا کہ اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے کیونکہ انھوں نے سب سے پہلے بحری لڑائی کی اور آپکے بیٹے (یزید) کی منقبت ہے کہ اس نے قسطنطنیہ میں جنگ کی ابن تین اور ابن منیر نے مہلب کا تعاقب کیا، اور انھوں نے کہا کہ اس عموم میں داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی دلیل خاص سے اس بشارت سے خارج نہ ہوسکے کیونکہ اہل علم کا اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان الہیت مغفرت کے ساتھ مشروط ہے حتیٰ کہ اگر ان (مجاہدین) میں سے کوئی

مرتد ہو جائے تو وہ اس (بشارت) کے عموم سے ہرگز داخل نہیں ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ مغفور لھم کی بشارت انھی کیلیے ہے جن میں شرط مغفرت پائی جائے گی۔۱۲ علامہ قسطلانی نے بھی یہی کچھ لکھا اور مزید فرمایا کہ (یزید) بنوامیہ کی حمیت کی وجہ سے اس غزوہ پر گیا تھا۔۱۳

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ نے بھی تقریباً یہی بات لکھی ہے۔۱۴

علامہ بدرالدین عینی علیہ الرحمہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں!" وکان فی ذالک الجیش ابن عباس وابن عمر وابن زبیر وابو ایوب الانصاری قلت الا ظھرو ان ھؤلاء السادات من الصحابة کانوا مع سفیان ھذا فلم یکونوا مع یزید لانه لم یکن اھلاً ان یکون ھولاء السادات فی خدمته قال المھلب فی ھذا الحدیث منقبة لمعاویة کان اوّل من غزا البحر ومنقبة لولده یزید لانه اوّل من غزا مدینة قیصر قلت ای منقبة لیزید وحاله مشھور فان قلت قال ﷺ فی حق ھذا الجیش مغفور لھم قلت قیل لا یلزم من دخوله فی ذالک العموم ان لا یخرج بدلیل خاص اذلا یختلف اھل العلم ان قوله ﷺ مغفور لھم مشروط بان یکونوا من اھل المغفرة حتیٰ لو ارتد واحد ممن غزاھا بعد ذالک لم یدخل فی ذالک العموم فدل علی ان الامراد مغفور لمن وجد شرط المغفرة منھم "۔ ترجمہ: اور اس لشکر میں ابن عباس، ابن عمر، ابن زبیر اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم تھے۔ میں یہ کہتا ہوں یہ سادات صحابہ حضرت سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تھے۔ نہ کہ یزید بن معاویہ کی سرکردگی میں کیونکہ یزید ہرگز اس قابل نہ تھا کہ سادات صحابہ اس کی سرکردگی میں ہوں۔ مہلب نے کہا اس حدیث میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے جنگ لڑی اور انکے بیٹے یزید کی منقبت ہے کہ اس نے مدینہ قیصر پر حملہ کیا۔ میں (علامہ عینی) کہتا ہوں اس میں یزید کی کونسی منقبت ہے جب کہ اس کا حال مشہور ہے۔ اگر تم کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کیلیے "مغفور لھم" فرمایا تو ہم کہتے ہیں کہ عموم میں داخل ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ دلیل خاص سے خارج نہ ہو سکے، کیونکہ اس میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ

ﷺ کا ارشاد مغفور لھم مشروط ہے کہ وہ آدمی مغفرت کا اھل ہو۔ حتیٰ کہ اگر غازیوں میں کوئی مرتد ہو جائے تو وہ اس عموم میں داخل نہیں رہتا۔ پس ثابت ہوا کہ مغفرت اسی کیلئے ہے جو مغفرت کا اھل ہوگا۔ ۱۵

یزید بن معاویہ جس لشکر میں شامل تھا وہ ۵۲ ھجری میں قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ جبکہ پہلا حملہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا جیسا کہ پچھلے اوراق میں تفصیل ذکر کی گئی۔ یزید والا لشکر ۵۲ ھجری میں حملہ آور ہوا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ اس لشکر میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۲ ھجری میں ہوا۔

۱) علامہ ابن کثیر دمشقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!" وذالک سنة ۵۲ ھ اثنین و خمسین ومعھم ابو ایوب فمات ھناک "۔ اسی سال ۵۲ ھجری میں ان کے ساتھ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے اور آپکا انتقال بھی وہیں ہوا تھا۔ ۱۶

۲) علامہ ذہبی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!" وکان ابو ایوب سنة ۵۲ ھجری "۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۲ ھجری میں ہوا۔ ۱۷

۳) علامہ ابن اثیر نے ۵۲ ھجری کے حوادث میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸

۴) یزید کے حامی محمود احمد عباسی نے بھی طبقات ابن سعد کے حوالے سے لکھا!" وتوفی ابو ایوب انصاری عام غزا یزید ابن معاویة القسطنطنیة خلافة ابیه سنة ۵۲ھ ... "۔ ۱۹

۵) علامہ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں!" وکانت غزوة یزید المذکورة فی سنة اثنین و خمسین من الھجرة وفی تلک الغزوة مات ابو ایوب الانصاری فاوصی ان یدفن عند باب القسطنطنیة "۔ ترجمہ: اور یزید کا مذکور غزوہ ۵۲ھ میں ہوا، اسی غزوہ میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اور انھوں نے وصیت فرمائی کہ مجھے قسطنطنیہ کے دروازے کے پاس دفن کیا جائے۔

ان تمام حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ یزید کے لشکر میں شامل تھے اور وہ لشکر ۵۲ھ میں قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوا اور اسی حملہ میں صحابی رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور یہ قسطنطنیہ پر آخری حملہ تھا۔ جبکہ مغفرت کی بشارت والی حدیث میں صراحت ہے کہ ''پہلا لشکر جو ہوگا اس کی مغفرت ہوگی''۔ دوسری طرف دیکھئے کہ یزید اس غزوہ میں شوق یا جوش جہاد سے نہیں گیا بلکہ مجاہدین کو پہنچنے والی تکالیف پر خوشی کا اظہار کرنے کی وجہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے جبراً بھیجا تھا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں! ''۵۰ ہجری میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بہت بڑا لشکر حضرت سفیان بن عوف کی قیادت میں بلاد روم پر حملہ کیلئے بھیجا اور اپنے بیٹے یزید کو بھی اس میں شریک ہونے کو کہا لیکن اس نے بڑی گرانی محسوس کی تو آپ نے چھوڑ دیا۔ پھر لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس لشکر کے مجاہدین سخت بھوک اور بیماری کا شکار ہوئے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ یزید نے اس لشکر کا حال سن کر یہ اشعار پڑھے۔

مَا اِنْ اُبَالِیْ بِمَا لَاقَتْ جُمُوْدُ غُھُمْ. بِالْفَدْ قَدِ الْبَیْدِ مَنَ الْحُمّٰی وَمِنْ شُوْمٍ. اِذَا اِتَّکَاْتُ عَلَی الْاَنْمَاطِ مُرْتَفِقًا. بَدِیْدِ مُرَّانِ عِنْدِیْ اُمُّ کَلْثُوْمٍ وَھِیَ امْرَاَۃُ بِنْتُ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عَامِرٍ فَحَلَفَ لَیُخْلِفَنْ بِھِمْ فَسَارَ فِیْ جَمْعٍ کَثِیْرٍ. ترجمہ: مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ بخار اور بدقسمتی کی وجہ سے اس کھلے صحرا میں ان لشکروں پر کیا بیتی۔ جبکہ میں نے دیر مران میں بلند ہو کر قالینوں پر تکیہ لگایا۔ اور میرے پہلو میں ام کلثوم موجود ہے۔ یہ عبداللہ بن عامر کی بیٹی (اور یزید کی بیوی تھی) تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ یزید کو اس لشکر کے ساتھ بھیجیں گے چنانچہ جماعت کثیرہ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ ؎ علامہ ابن اثیر نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ ۳۱

اگر بالفرض یزید کو بشارت والی حدیث کا مصداق مان لیا جائے تو اس حدیث کا مفاد صرف یہ ہے کہ یزید کے اس وقت تک جتنے گناہ تھے وہ بخش دیئے گئے۔ بعد میں یزید کے افعال قبیحہ نے اسے اس بشارت سے محروم کر دیا کیونکہ جہاد ایک عمل خیر ہے جس سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن بعد والے معاف نہیں ہوتے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے

ہیں!''حضور ﷺ کی اس حدیث پاک ''مغفور لھم '' سے بعض لوگوں نے یزید کی نجات پر استدلال کیا ہے کیونکہ وہ اس دوسرے لشکر میں شریک تھا، بلکہ اس کا افسر و سربراہ تھا۔ جیسا کہ تاریخ گواہی دیتی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس حدیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس غزوہ سے پہلے جو اس نے گناہ کیے وہ بخش دیئے گئے، کیونکہ جہاد کفارات میں سے ہے اور کفارات کی شان یہ ہے کہ وہ سابقہ گناہوں کے اثر کو زائل کرتا ہے بعد میں ہونے والے گناہوں کے اثر کو نہیں۔ ہاں اگر اسی کے ساتھ یہ فرمادیا ہوتا کہ قیامت تک کے لیے اس کی بخشش کر دی گئی ہے تو بے شک یہ حدیث اس کی نجات پر دلالت کرتی۔ اور جب یہ صورت نہیں تو نجات بھی ثابت نہیں، بلکہ اس صورت میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور اس غزوہ کے بعد جن جن برائیوں کا وہ مرتکب ہوا ہے جیسے امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کروانا، مدینہ طیبہ کو تاخت و تاراج کرانا، شراب نوشی پر اصرار کرنا، ان سب گناہوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے چاہے تو معاف کرے چاہے تو عذاب دے جیسا کہ تمام گناہ گاروں کے حق میں یہی طریقہ رائج ہے''۔ ۲۲ یہی مفہوم علامہ قسطلانی نے ''ارشاد الساری ۵/۱۲۵، اور علامہ بدرالدین عینی نے ''عمدۃ القاری ۱۴/۱۰'' میں فرمائی ہے۔

غیر مقلدین کے حافظ زبیر علی زئی نے ماہنامہ ''الحدیث'' شمارہ ۹ صفحہ ۱۴ اور عبداللہ دامانوی نے ماہنامہ ''محدث'' جنوری ۲۰۱۰ء صفحہ ۴۸ میں اور مولانا ارشاد الحق نے بھی ماہنامہ ''محدث'' اگست ۱۹۹۹ء میں یہی موقف اپنایا ہے کہ یزید اس حدیث کا مصداق نہیں، اور نہ اس حدیث سے اس کی نجات ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور الرحیم ہے۔ وہ مالک یوم الدین ہے۔ وہ اگر یزید کو بخشنا چاہے تو اُس کی مرضی، لیکن قواعد شرعیہ کی رو سے عترت پیغمبر کے قاتل، مدینۃ الرسول کو تاخت و تاراج کرنے والے اور حرم کعبہ پر سنگ باری کے مجرم یزید کو جنتی کہنا بہت بڑی جہالت، نخت لا دینیت ہے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

حوالہ جات

(۱) صحیح بخاری کتاب الجہاد ما قیل فی قتال الروم رقم الحدیث ۲۹۲۴، صحیح بخاری مترجم ۲/۱۰۷ باب نمبر ۱۳۷

کتاب الجہاد والسیر رقم الحدیث ۱۸۳۴ طبع لاہور ترجمہ عبدالحکیم خان اختر شاہجہانپوری، صحیح بخاری مترجم وحید الزمان ۲/ ۱۱۸ باب نمبر ۱۳۷ کتاب الجہاد والسیر پارہ نمبر ۱۱ رقم ۱۸۵ طبع لاہور، البدایہ والنھایہ صفحہ ۹۲۹ باب نمبر ۲۷ ما قیل فی قتال الروم مکتبہ بیت الافکار، المستدرک حاکم ۴/ ۵۹۹ رقم الحدیث ۸۲۶۸، سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ ۱/ ۶۷ رقم ۲۶۸، حلیۃ الاولیاء: ابونعیم اصفہانی، مسند الشامیین طبرانی۔

۲) صحیح بخاری ۱/ ۱۵۸ کتاب التہجد باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ (۳) البدایہ والنھایہ ۷/ ۱۵۹

۴) دیکھئے: تقریب التھذیب ۲/ ۳۳۲ (۵) تاریخ اسلام: امام ذہبی، عہد خلفائے راشدین ص ۳۷۱

(۶) البدایہ والنھایہ ۷/ ۵۲ (۷) شرح قاری صحیح بخاری بر حاشیہ تیسیر القاری ۴/ ۶۶۹

(۸) فتح الباری ۱۲/ ۶۱ (۹) تفسیر ابن کثیر ۱/ ۲۱۷

۱۰) سنن ابوداود مع احکام البانی ص ۳۴۱ باب فی قولہ عزوجل ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ: کتاب الجہاد رقم ۲۵۱۲ (صحیح)، سنن ابوداود مترجم ۲/ ۲۸۱ طبع لاہور، مستدرک حاکم ۲/ ۱۰۴ رقم ۲۸۹ طبع قاہرہ، جامع البیان فی تفسیر القرآن ۲/ ۱۱۸، ۱۱۹، احکام القرآن از جصاص ۱/ ۳۲۶، تفسیر ابن ابی حاتم رازی ۱/ ۳۳۰، ۳۳۱ (۱۱) سنن ابوداود مترجم ۲/ ۳۲۳، مصنف ابن ابی شیبہ ۵/ ۳۹۸، مسند احمد ۵/ ۴۲۳ برقم ۲۳۹۸۷، صحیح ابن حبان ۸/ ۳۵۰، طبرانی ۴/ ۳۹ رقم ۴۰۰۲، الطحاوی ۳/ ۱۸۲، السنن الکبریٰ بیہقی ۹/ ۷۱، سنن دارمی ۲/ ۱۱۳ رقم ۱۹۷۴، سنن سعید بن منصور صفحہ ۲۶۷

۱۲) بخاری شریف کی حدیث کا حاشیہ جلد اول صفحہ ۴۰ (۱۳) دیکھئے: ارشاد الساری شرح بخاری ۵/ ۱۲۵

۱۴) فتح الباری شرح بخاری ۱۲/ ۶۱ (۱۵) عمدۃ القاری شرح بخاری ۱۲/ ۱۰ مطبوعہ مصر

۱۶) البدایہ والنہایہ ۸/ ۵۹ (۱۷) تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۲۹

۱۸) ابن اثیر ۳/ ۲۹۴ (۱۹) خلافت معاویہ و یزید صفحہ ۷۹ (۲۰) تاریخ ابن خلدون ۳/ ۱۹، ۲۰

(۲۱) ابن اثیر ۳/ ۳۵۸ (۲۲) شرح تراجم ابواب البخاری صفحہ ۳۱، ۳۲

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

اسلام بمقابلہ عیسائیت

علامہ سعید محمد عامر آسوی حسینی نقشبندی ☆

عیسائیت:

مدعیان مسیحیت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال وافعال اور سیرت طیبہ کے احوال "عیسائیت" کی اساس ہیں۔ چنانچہ "دی امریکن چیمبرز انسائیکلو پیڈیا (جلد۵، ۱۹۶۰ء) کا گو میں درج ہے کہ!

Christianity:The religion founded by Jesus of Nazareth in the first century AD and centring in life ,mission and message.

"عیسائیت وہ مذہب ہے جس کی بنیاد پہلی صدی میں مسیح ناصری نے رکھی، اور جس کا محور ان کی زندگی، مقصد حیات اور پیغام ہے۔"

لیکن ان مدعیان مسیحیت کے پاس حضرت مسیح علیہ السلام کی کوئی ایسی سیرت موجود نہیں جو عیسائیت کے معنی کے صحیح ہونے کے لئے کافی ہو۔ اسی لیے انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ "یسوع مسیح" (Jesus christ) میں لکھا ہے:

Any attempt to write a "Life of Jesus" should be frankly abandoned. The material for it certainly does not exist .It has been calculated that the total number of days in his life regarding which we have any record does not exceed 50 .

☆ 0306-8420977

''درست بات یہ کہ حیات مسیح پر لکھنے کی کوشش ترک کردی جائے۔ یقیناً اس کیلئے مواد موجود نہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے پاس ان کی حیات (مقدسہ) کے پچاس (۵۰) دنوں سے زیادہ کے متعلق ریکارڈ موجود نہیں''

ماضی قریب میں مشہور مبلغ ڈین انجی (Dean Inge) نے بھی اعتراف کیا ہے کہ

"No real biography of Jesus can ever be written"

''مسیح کی کوئی حقیقی سوانح عمری کبھی نہیں لکھی جاسکتی''

(Christian Ethics and Modern Problems, London - 1930)

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ جدید عیسائیت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت مقدسہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ بھلا جس قوم کے پاس اپنے مذہبی پیشوا کی زندگی کے ۵۰ دنوں سے زیادہ کا ریکارڈ ہی موجود نہیں اور جو انکی حقیقی تعلیمات کو محفوظ ہی نہیں رکھ سکی وہ ان کی غلامی اور ان کے نقوش پر چلنے کا دعویٰ کیونکر کرسکتی ہے۔

اسلام:

اسلام کے معنی ہیں ''زمین پر سر رکھنا'' اور ولادت کے قانون عام کے مطابق انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ سر کے بل پیدا ہوتا ہے۔ گویا زبان حال سے اعلان کرتا ہے کہ میں اسلام پر پیدا ہوا ہوں۔ اسی لئے حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''کل مولود یولد علی الفطرۃ'' یعنی ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ لہذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام انسان کا پیدائشی دین ہے۔ پھر اسلام کے ہر حکم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا آسان ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں دین اسلام کے احکامات قرآن حکیم کی شکل میں عطا فرمائے، ساتھ ہی ان کی تشریح و توضیح کے لئے اپنے پیارے نبی علیہ السلام کو بھی مبعوث فرمایا۔ اور حضور ﷺ نے اسلام کے ہر حکم کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر کچھ ایسے حسین انداز میں پیش فرمایا کہ پھر کوئی ابہام، ابہام اور کوئی اشکال، اشکال نہ رہا۔ لہذا یہ

کہنا عین حقیقت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے افعال و فرمودات کا نام اسلام ہے۔اور ہر مسلمان دین اسلام کے احکامات کی بہترین سمجھ بوجھ کے لیے سیرت مصطفی علیہ التحیہ والثناء ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔

عیسائیت کے برعکس جہاں جناب عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات سے آشنائی ناممکن ہے، بانی اسلام ﷺ کی سیرت اقدس کا ہر ورق اجلا، ہر نقش زریں اور ہر پہلو روشن نظر آتا ہے۔اور حضور ﷺ کے ماننے والوں نے آپ ﷺ کی ایک ایک ادا کو کچھ اس حسن اہتمام سے اپنے حافظوں اور کتابوں میں محفوظ کیا ہے کہ بڑے بڑے مغربی مفکر اور مستشرقین ورطۂ حیرت کا شکار ہیں کہ کیا کسی ہستی کی زندگی کے مختلف اور باریک گوشوں کو اتنی خوبصورتی سے آئندہ نسلوں کی تعمیر سیرت کے لیے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

آج ہمارے پاس احادیث کا وسیع و مستند ذخیرہ ہے جس کی روشنی میں ہم حضور علیہ السلام کی تعلیمات و احکامات اور سیرت و کردار پر کھل کر روشنی ڈال سکتے ہیں۔اور ان احادیث کی صحت اور جانچ پرکھ کے لئے اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن معرض وجود میں آیا ہے جسکی نظیر دنیا میں کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔جرمنی کے مشہور ڈاکٹر اسپرنگر رقمطراز ہیں کہ!

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری ہے نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو"۔

اس علم کی بدولت آج احادیث کا قابل قدر اور با اعتماد ذخیرہ حضور علیہ السلام کی سیرت وتعلیمات کے سلسلے میں موجود ہے۔

اسلام اور عیسائیت میں ایک بڑا فرق:۔

اسلام اور عیسائیت میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ عیسائیت میں بنی نوع انسان کیلئے نہ کوئی علمی نظریہ ہے نہ عملی پروگرام۔حیات انسانی کے کسی شعبے کے لئے بھی اس نے کوئی ضابطہ پیش نہیں کیا ہے۔یاد رہے کہ دور حاضر کی عیسائیت کا اصل بانی پولس ہے۔یعنی آج جن عقائد و نظریات کی بنیادوں

پر مسیحیت قائم ہے۔ان کا جناب عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات یا ان کے حواریوں کے نظریات سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ پولس کے عطا کردہ ہیں۔ چنانچہ ممتاز مورخین فلائڈ راس (Floyd Ross) اور مسز ہلز (Mrs.Hills) لکھتے ہیں۔

Of all the people associated with the beginnings of Christianity, paul was the most responsible for the turn its beliefs took.He added a new note that determined its future course.

''ان سب لوگوں میں جن سے عیسائیت کی ابتداء وابستہ ہے۔ پولس اس تبدیلی کیلئے سب سے زیادہ ذمہ دار تھا جو اس کے عقائد میں آئی۔ اس نے (ان عقائد میں) ایک نئی طرح ڈالی جس نے اس کے (عیسائیت کے) مستقبل کی راہیں متعین کیں۔''

(Floyd.H.Ross and Tynette Hills,p.137)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مروجہ عیسائیت کے بانی پولس نے خود یہ نظریات کہاں سے لیے؟ اس کا جواب زیورچ یونیورسٹی کے فاضل عیسائی پروفیسر آرنلڈ میئر (Arnold Meyer) کی زبانی سنئے۔

"As one asks:whence did St.paul derive his teaching? The simplest answer would seem to be :By tradition from Jesus through the instrumentality of the original apostles. But the answer given by St.paul himself is quite different :I received my Gospel not from men ,but by a revelation of Jesus Christ."

''اگر کوئی سوال کرے کہ پولس نے جو تعلیم دی اسے اس نے کہاں سے اخذ کیا؟ تو اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہونا چاہیے تھا: ان روایات سے جو اسے اصل حواریوں کے ذریعہ پہنچی تھیں۔ مگر جو

جواب خود پولس نے دیا ہے، وہ بالکل مختلف ہے۔ (وہ کہتا ہے کہ) میں نے اپنی انجیل انسانوں سے نہیں بلکہ یسوع مسیح کے مکاشفہ سے حاصل کی ہے۔"

(Arnold Meyer: "Jesus or paul")

پولس خود بھی اس حقیقت کا اعتراف یوں کرتا ہے! "اے بھائیو! میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری میں نے سنائی وہ انسانوں کی سی نہیں۔ کیونکہ وہ انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی، بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اس کا مکاشفہ ہوا"

(انجیل، گلتیوں کے نام پولس کا خط)

گویا جدید عیسائیت دراصل "پولس کے مکاشفات" پر مشتمل ہے۔ پولس کے ان مکاشفات کی صحت کیا ہے، یہ تو کوئی "اہل نظر" ہی بتا سکتا ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ دین کی بنیاد مکاشفات یا خوابوں پر نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ آسمانی کتابوں یا صحیفوں اور انبیاء ورسل کی تعلیمات وتشریحات پر رکھی جاتی ہے۔ اس اصول کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مروجہ عیسائیت کی کوئی بنیاد سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ نہ تو ان کے پاس کسی آسمانی کتاب کا حرف بحرف نسخہ ہے اور نہ اپنے کسی نبی کی سیرت کی کوئی مصدقہ دستاویز۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے قرآن میں توحید ورسالت، جزا وسزا، جنت ودوزخ، حرام وحلال اوامر ونواہی حتیٰ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق مکمل ہدایات پیش کی ہیں اور ان کی بہترین تشریح وتفصیل کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ اور آپ ﷺ کے فرمودات کھلی کتاب کی مانند ہمارے سامنے موجود ہیں۔ قرآن وہ کتاب ہے کہ کرہ ارض پر بسنے والا کوئی انسان اس میں تحریف ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اسلئے کہ قرآن اتارنے والا کائنات کا خالق ومالک ہے اور اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ" نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون "ترجمہ: ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمائیں گے۔ پھر ہر دور میں لاکھوں مسلمانوں نے حفظ قرآن کا اہتمام کیا ہے۔ جہاں کسی نے کوئی زیر زبر شد مد غلط پڑھی، بیسیوں لوگوں نے اسے ٹوک دیا کہ یوں نہیں، یوں ہے۔ چنانچہ ایف ایف آر بتھ نات اس بات کا اقرار یوں کرتا ہے:

"and that this has remained the same,without any change and alteration. ...." (The construction of the Bible and Quran)

''یہ کہ قرآن بالکل اصلی حالت میں رہا ہے۔ اس میں آج تک کوئی جیالا، مترجم یا محرف کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم نہیں کر سکا۔ افسوس یہ ہے کہ عہد نامہ جدید وقدیم کی سب کتابوں (بلکہ کسی ایک کتاب) کے بارے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔''

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بائبل (Bible) کے ماننے والے خود آگاہ ہیں کہ بائبل کی جمع وتدوین کی پوری تاریخ ردّوبدل، حذف واضافہ اور تحریف وترمیم کی تاریخ ہے۔ کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار برطانوی مصنف مسٹر لیکی، ماسٹر اس (سیرت مسیح ۱۸۳۵ء) بروشو بائبز (۱۸۷۸ء) ڈاکٹر ابن سن فلپ ویوین، برمن یونیورسٹی کے پروفیسر ہارنگ (What is Christianity) نے کیا۔ نیو یارک ٹائمز کی ایک خبر کے مطابق امریکہ میں پریسبائٹرین (presbytarian) کلیسا کی ایک نمایاں برانچ نے اعلان کیا کہ ''یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بائبل غلطیوں سے پاک ہے''

''ٹائم میگزین'' ۱۹۲۹ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ۹۵ فیصد عیسائی علماء اور عوام کا یقین ہے کہ بائبل تحریف شدہ ہے۔ جرمنی کے ایک رسالہ ''دی اسپگل'' نے بڑے بڑے پروفیسروں کے حوالے سے نیز کوپن ہیگن (ڈنمارک) کے چرچ آف رائل ڈاک یارڈ کا ڈین نے بھی کم وبیش یہی کہا۔

عیسائیت کے بنیادی نظریات:۔

عیسائیت کے دو بنیادی نظریات ہیں۔

۱۔ نظریہ تثلیث (Trinity)　　۲۔ کفارہ کا نظریہ (Atonement)

۱۔ نظریہ تثلیث (Trinity):۔ عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم (Persons) سے مرکب ہے۔ یہ تین اقانیم کون ہیں جن کا مجموعہ ان کے نزدیک خدا ہے۔ انکی تعیین میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض باپ بیٹے اور روح القدس کو اور بعض باپ، بیٹا اور ''کنواری مریم'' کو تین اقانیم قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ان سے سوال کیا جائے کہ ان تین میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے؟ خدا سے

اس کا کیا رشتہ ہے؟ تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں ملتی ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان تین میں سے ہر ایک بذات خود بھی مجموعہ خدا جیسا ہے، دوسرے گروہ کے مطابق تینوں میں سے ہر ایک الگ خدا تو ہیں لیکن مجموعہ خدا (Trinity) سے کمتر ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ تین خدا ہی نہیں، خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔ ان سب کا کسی ایک طرز فکر یا عقیدہ پر یکجا نہ ہونا ہی ان کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ ہمارے قرآن نے ان باطل نظریات کا رد ان الفاظ میں کیا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثہ (پ ۶۔ ع ۱۴) ترجمہ: بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں اللہ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (پ ۶ ع ۷) ترجمہ: بے شک کافر ہوئے وہ جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔

عیسائیت میں خدا کا جو ایک کمزور تصور دیا گیا ہے اس کے برعکس اسلام نے حقیقی اللہ کی شان وعظمت یوں بیان فرمائی۔

انما اللہ الہ واحد ط سبحنہ ان یکون لہ ولد م (النساء۔۔ ع ۳) ترجمہ: اللہ تو ایک ہی خدا ہے۔ پاکی اسے اس سے کہ اس کے کوئی بچہ ہو۔

قل ھو اللہ احد o اللہ الصمد o لم یلد ولم یولد o ولم یکن لہ کفوا احد o ترجمہ: تم فرماؤ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی۔ یہ ہے خدا کا وہ حقیقی اور جاندار تصور جو قرآن نے دیا ہے جبکہ پوری عیسائیت اور اس کی ذریت اس سے خالی ہے۔

۲۔ نظریہ کفارہ (Atonement):۔ مسٹر ڈینیل ولسن کے مطابق یہ نظریہ عیسائی مذہب کی جان ہے اور فی نفسہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (vol.5) میں درج ہے:

"The doctrine of salvation has taken the most prominent place in th echristian faith : so

prominent,indeed ,that to a large portionof believers it has been the supreme doctrine,and the doctrine of the deity of Jesus has been valued only because of its necessity on the effect of atonement".

''نجات کے نظریہ کو عیسائی عقیدہ میں نمایاں ترین جگہ حاصل ہے، اتنی نمایاں کہ اکثر عیسائی ایمانداروں کے نزدیک یہ عیسائیت کا اعلیٰ ترین نظریہ ہے۔ حتیٰ کہ یسوع کے خدا ہونے کے نظریہ کی اہمیت بھی اس لیے ہے کہ کفارہ کو موثر بنانے کے لئے اس کا ماننا ضروری ہے۔''

اس عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پھانسی کے ذریعے مزعومہ موت اور پھر جی اٹھنے سے انسان کی نجات کی صورت پیدا ہوئی اور اس کا ازلی گناہ **(Original Sin)** معاف ہوا۔ یہ ازلی گناہ کیا تھا؟ جس کی پاداش میں ساری نسل انسانی مجرم بنی ہوئی تھی۔ اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ عیسائی جناب آدم وحوا علیہما السلام اوران کی نسل کے ہر فرد کو گنہگار مانتے ہیں یہاں تک کہ نبیوں اور رسولوں سے متعلق بھی ان کا اعتقاد یہی ہے کہ یہ گناہوں سے پاک نہ تھے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ سب سے پہلا گناہ (جناب) حوا علیہا السلام نے کیا پھر (جناب) آدم علیہ السلام کو اس درخت سے کھانے کی طرف راغب کیا جس کے قریب جانے سے خدا نے روکا تھا۔ تو آدم وحوا علیہما السلام کے اس گناہ سے تمام نسل انسانی گنہگار ہوگئی۔ جس کی وجہ سے مستحق سزا ٹھہری۔ اب ان کی نجات کے لیے ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو خود گنہگار نہ ہو۔ اور جناب عیسیٰ علیہ السلام وہ ہستی تھے۔ کیونکہ یہ ابن اللہ ہیں۔ باقی آدم وحوا (علیہما السلام) کے بیٹے ہیں۔ اب خدا نے ان سے کہا: ''اے پیارے بیٹے مسیح! میں تمام لوگوں کے گناہوں کا بوجھ تیرے سر پر رکھ کر صرف تجھی کو سزا دوں گا۔ تو صلیب پر چڑھ جا اور تین دن تک (معاذ اللہ) لعنت کی موت مردہ رہ کر گنہگاروں کے گناہوں کا کفارہ کردے تاکہ بنی نوع انسان کی نجات ہو جائے۔'' چنانچہ پولس لکھتا ہے: ''مسیح نے اپنے آپ کو سب کے فدیہ میں دیا۔''

(تیمتھیس ۲:۲)

یہ تو تھا وہ مختصر واقعہ جس کی بنیاد پر پولس نے نظریہ کفارہ کی بنیاد رکھی۔ اگر اس کو تفصیل سے پڑھیں تو

اس میں بے شمار تضادات نظر آئیں گے اور ایسے سوالات جنم لیتے ہیں جن کا جواب آج تک عیسائی برادری سے نہیں بن سکا۔ یہاں اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ اگر علمائے عیسائیت کے نزدیک جناب مسیح علیہ السلام کا مصلوب ہونا تمام بنی آدم کا کفارہ ہے تو پھر تو سب کی نجات ہوگی۔ اب کیا ضرورت ہے عیسائیت قبول کرنے کی۔ کوئی عیسائی ہو یا یہودی، ہندو ہو یا مسلمان جب سب کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا تو عیسائیت کی بھی ضرورت نہ رہی۔ تو کیوں علمائے عیسائیت اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کیوں فری ڈسپنسریوں سکولوں کالجوں اور رفاہ عامہ کے کاموں کی آڑ میں مسیحیت کا پرچار کر رہے ہیں۔

پوری عیسائیت بالخصوص نظریہ کفارہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے دیکھ لیں یہی معلوم ہوگا کہ یہ خدا کی شریعت کے باغی اور مجرم ذہنوں کا وضع کردہ ہے۔ جو دراصل تصور سزا ختم کر کے ہر طرح کے گناہوں اور جرائم سے اپنا دامن آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے تئیں وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں۔ اور جب سب ان نظریات کے حامل ہو جائیں گے تو اسے گویا ''آئینی حیثیت'' مل جائے گی۔ جب سزا و جزا کا تصور ختم ہو گیا تو کھلی چھٹی مل گئی۔ قتل کرو، زنا کرو، چوری کرو، حرام خوری کرو کسی طرح کی کوئی قدغن نہیں۔ یہاں ہم یہ نکتہ اٹھانے میں بھی حق بجانب ہیں کہ کفارہ کے اعتقاد کے بعد ان کے پاس اپنے ملکوں میں جرائم کی سزاؤں کے قوانین وضع کرنے کا کیا جواز ہے؟ کیا یہ عیسائیت کے ساتھ مذاق نہیں؟ ایک طرف تو کہتے ہیں کہ کفارہ ادا ہو چکا تو پھر جرائم کی روک تھام کے لئے قوانین وضع کرنا، پولیس فورس تشکیل دینا اور عدلیہ کا نظام رائج کرنا چہ معنی دارد۔

اسلام اس نظریہ کو یکسر مسترد کرتا ہے اور دو ٹوک اور واضح موقف بیان کرتا ہے: ولا تزر وازرۃ وزر اخری. (فاطر، آیت ۱۸) کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔ نیز فرمایا۔ "لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت. (بقرہ۔ ۲۸۶) ترجمہ: اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی۔ (ترجمہ اعلیٰحضرت)

گناہ بنی آدم نے کیا تو جناب مسیح علیہ السلام گناہ گار کیوں اور کیوں کسی کی سزا بھگتیں۔ گناہ کوئی کرے اور وبال کسی پر ہو یہ تو عدل و انصاف اور فکر و عقل کے تقاضوں کے خلاف ہے کوئی معقول اور

باشعور دماغ اس نظریہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ خود بائبل میں ایک جگہ اس کے خلاف بات کہی گئی ہے:

''بیٹوں کے بدلے باپ دادا نہ مارے جائیں اور نہ باپ دادا کے بدلے بیٹے مارے جائیں بلکہ ہر آدمی اپنے ہی گناہ کے لئے مارا جائے''۔

یہ سوال بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا خدا قادر مطلق نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے تو پھر وہ ''بیٹے کی قربانی'' اور فدیہ کے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسی تناظر میں دیکھیں تو سمجھ آجائے گی کہ خدا سے متعلق ان کا اعتقاد و یقین کتنا متنی اور کمزور ہے۔ ان کی نظر میں خدا کس قدر مجبور تھا (معاذ اللہ) کہ بغیر جناب عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیے وہ کسی کو بخش نہ سکتا تھا۔ پھر کفارہ پر مبنی انسان کی فلاح و نجات کے اس مزعومہ ''خدا کے منصوبے'' کا ایک اور مضحکہ خیز اور لغو پہلو یہ بھی ہے کہ مسیح جو اس کے مرکزی کردار ہیں وہ (ان کے نظریے کے مطابق) نہ تو اس کی ضرورت و اہمیت سے باخبر ہیں نہ دل و جان سے اس میں شریک۔ چنانچہ انجیل کہتی ہے:

''وہ غمگین اور بے قرار ہونے لگے اور منہ کے بل گر کر یوں دعا کرنے لگے کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے'' (متی) اگر وہ اس 'خدائی منصوبے' میں شریک تھے تو پریشان ہونے اور یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ ''یہ پیالہ مجھ سے ٹال دے''۔

نیز اس مذہب کے پیشوا یہ ثابت کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام صلیب دیے گئے تھے۔ اس بارے میں یہ متفق نہیں ہیں اسی طرح ان کے صلیب دیے جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کی بات کسی ٹھوس دلیل کے بغیر کر گئے ہیں۔ جیسا کہ محققین نے اعتراف کیا:

(An) event .....which ,however , no eye saw.

''البتہ (جی اٹھنے) کا یہ واقعہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھا۔''

(Adolf Harnack: History of Dogma, London ,1961)

اور آخری بات یہ کہ اس میں بھی اناجیل کا اختلاف ہے کہ جی اٹھنے کے بعد وہ کہاں گئے۔ یہ ساری بحث تفصیل طلب تھی جسے ہم نے مختصر ترین شکل میں پیش کیا اور جو نتیجہ اس بحث سے برآمد ہوا وہ یہ

ہے کہ بقول ہیو شون فیلڈ (Dr.Hugh Schonfield)

"Christianity today is about as far from the teaching of Jesus as from those of Hinduism."

''آج کی عیسائیت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے اتنی دور ہے جتنی کہ وہ ہندومت کی تعلیمات سے دور ہے''

(TheDaily ,"Today " London ,March 28, 1986)

نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جدید عیسائیت کا ہر عقیدہ و نظریہ سراسر انسانی تفکرات و توہمات اور مکاشفات پر مبنی اور خدائی و نبوی تعلیمات سے دور ہے جبکہ اسلام اپنی اصل ترین شکل پر قائم تحریف و تبدل سے پاک اور خدا (جل جلالہ) و رسول (علیہ الصلوۃ والسلام) کی طرف سے عطا کردہ عقائد و نظریات اور تعلیمات پر مبنی سچا دین ہے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

مقدمہ

توہینِ رسالت ننکانہ صاحب

ازقلم حقیقت رقم: صادق علی زاہد☆

رسول اکرم ﷺ کی ذات، مسلمانوں کے لیے ان کی اپنی ذات سے بہت بڑھ کر ہے۔ آپ ﷺ کے بارے میں فحش گوئی اور بدکلامی سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچنا ایک لازمی وفطری عمل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی عزت وتکریم کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہی نہیں بلکہ بنیادِ ایمان ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اے نبی ﷺ بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاہد ومبشر اور نذیر بنا کر، تاکہ اے لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم وتوقیر کرو اور صبح وشام اللہ کی تسبیح (پاکی) بیان کرو'' (1) دوسری جگہ آپ ﷺ کی عزت وتوقیر کی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی: ''پس جو لوگ اس رسول ﷺ پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اسکی مدد کریں اور اس نور کی اتباع کریں جو اس کے ساتھ اترا، وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔'' (2) نبی اکرم ﷺ کی عزت وتوقیر کس حد تک کی جائے اس بارے میں ارشادِ ربانی ملاحظہ فرمائیں۔ ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو اور ان کی موجودگی میں بلند آواز سے بات نہ کرو جس طرح بلند آواز سے تم ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے'' (3)

صحابہ کرام تو پہلے ہی مجسم ادب تھے لیکن اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد ادب واحترام رسول ﷺ کے بارے میں مزید محتاط ہو گئے۔ خود ہی محتاط نہ ہوئے بلکہ دوسروں کو بھی بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہونے سے قبل ''آدابِ باریابی'' سے مطلع فرماتے۔ کتب سیر میں مرقوم ہے کہ اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے معمول بنا لیا تھا کہ جب بھی کوئی بیرونی وفد آپ ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ طیبہ پہنچتا تو آپ رضی اللہ عنہ وفد کی طرف ایک خاص

☆0300-4529446

آدمی کو روانہ کرتے جو اس وفد میں شامل لوگوں کو آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری اور بات چیت کے آداب سے آگاہ کرتا۔ ایسے الفاظ جن میں توہین رسالت ﷺ کا شائبہ بھی موجود ہو ان کے استعمال سے منع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا! ''اے ایمان والو (جب تم رسول ﷺ سے بات کرو تو)''راعنا'' نہ کہو بلکہ یوں عرض کرو کہ حضور ﷺ ہم پر نظر فرمایئے اور (جب حضور ﷺ ارشاد فرما رہے ہوں تو) غور سے سنا کرو (تاکہ بار بار تم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر آپ ﷺ کو تکلیف محسوس نہ ہو)(4) اتنی واضح تعلیمات کے باوجود اگر کوئی بدبخت حضور ﷺ کے ناموس کے بارے میں ناپسندیدہ عمل کرے تو اس کا کیا حشر ہوگا، ارشاد ربانی ہے! ''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ہلاک کیا جائے گا جس طرح ان لوگوں کو ہلاک کیا گیا جو ان سے پہلے تھے۔''(5)

مزید فرمایا! ''جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں یہ ذلیل ترین لوگ ہیں''۔(6) ناموس رسالت کا پاس نہ رکھنے والوں سے مومنین کا کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے ارشاد ربانی ہے! ''جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، تم انہیں خدا اور رسول ﷺ کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔''(7) شاتمان رسالت کو سزا سے بچانے کیلئے قوانین میں ترمیم کرنے والوں اور گستاخان رسول کی وکالت کر کے انہیں سزا سے بچانے کی کوشش کرنے والوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے اس حکم ربانی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ حکومت وقت سے گذارش ہے کہ غیرت مسلماں کا امتحان لینے سے باز رہے۔ اقتدار کے نشے میں سرمست ہو کر جس نے بھی گستاخان رسول کی پشت پناہی کی کوشش کی اس کی دنیا و آخرت تباہ ہونے کا اشارہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''جان لو! بے شک نبی کریم ﷺ کی عزت و حرمت اور آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح ضروری و لازم ہے۔ جس طرح آپ ﷺ کی ظاہری حیات میں ضروری و لازم تھی۔ اس کا اظہار خصوصاً آپ ﷺ کے ذکر مبارک، آپ ﷺ کی حدیث شریف کی تلاوت، آپ ﷺ کی سنت، آپ ﷺ کے نام مبارک اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے سننے کے وقت ہونا چاہئے۔''(8)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رہے!

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید، جنید و بایزید ایں جا

ان دنوں میڈیا پر ننکانہ صاحب میں توہین رسالت کی مرتکب آسیہ نامی عیسائی عورت کو جناب محمد نوید اقبال صاحب ایڈیشنل سیشن جج ننکانہ صاحب کی طرف سے سزائے موت سنائے جانے کے خلاف بہت کچھ کہا سنا جا رہا ہے خصوصاً گورنر پنجاب سلمان تاثیر غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنے کی خاطر ہر قسم کی قانونی و اخلاقی حدیں پھلانگ رہا ہے۔ میڈیا اصل حقائق عوام تک نہیں پہنچا رہا بلکہ سرکاری بولی بول رہا ہے۔ ننکانہ صاحب کا مقامی شہری ہونے کی حیثیت سے میں نے مناسب سمجھا کہ اصل حقائق قارئین تک پہنچا دیے جائیں۔

آسیہ نامی عیسائی عورت ننکانہ صاحب کے نواحی گاؤں اٹانوالی چک نمبر 3 گ ب تھانہ صدر ننکانہ صاحب کی رہائشی ہے۔ اس کا کردار پورے گاؤں میں قابل اعتراض مشہور ہے۔ مادر پدر آزادی کی دلدادہ ہے۔ سرعام قابل اعتراض گفتگو کرتی ہے۔ اس کی بڑی بہن کی شادی اس کے نام نہاد خاوند عاشق کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس سے اس کے خاوند کے تین بچے موجود ہیں۔ جب اس کی بڑی بہن کو بچے کی امیدواری ہوئی اور زچگی کے دن قریب آئے تو آسیہ اپنی بہن کے گھر کا کام کاج کرنے اس کے گھر آ گئی۔ اپنی بہن کے گھر چند دن رہائش کے دوران اس کے خاوند (جو کہ اب آسیہ کا بھی خاوند ہی بن چکا ہے) سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔ اور حاملہ ہو گئی۔ والدین نے حمل چھپانے کی غرض سے شادی کرنا چاہی تو اس نے اپنی بہن کے خاوند عاشق مسیح کے سوا کسی اور سے شادی کروانے سے انکار کر دیا بلکہ بغاوت کر کے زبردستی عاشق کے گھر رہنے لگی اور عاشق اپنی بیوی کے گھر موجود ہونے کے باوجود راتیں آسیہ کے ساتھ بسر کرنے لگا۔ اس پر بیوی نے سخت احتجاج کیا تو عاشق نے مار پیٹ کر اسے گھر سے نکال دیا اب اصل بیوی، بے گھر اور سالی گھر والی بن کر زندگی گزارنے لگی۔ (ایسی حرکت پر ہی پنجابی میں کہا جاتا ہے "اگ لین آئی تے گھر دی مالک بن بیٹھی") عیسائی مذہب میں ایک بیوی کے ہوتے ہوئے

دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن آسیہ نے اہل دیہہ اور برادری والوں کے اصرار کے باوجود عاشق کے گھر سے جانے سے انکار کر دیا۔ آسیہ اور عاشق کے اس خلاف مذہب اقدام پر عیسائی برادری نے بھی سخت احتجاج کیا اور ان کا معاشرتی بائیکاٹ کرنے کی دھمکیاں دیں لیکن دونوں نے کسی بات کی پروانہ کی اور شادی کا سوانگ رچا ڈالا۔ دنیا کے دکھاوے کے لئے ، مذہبی روایات کے برعکس عاشق نے آسیہ سے نام نہاد شادی کر لی اور دونوں بہنوں کو اکٹھا اپنے گھر آباد کر لیا جو کہ آج بھی دونوں حقیقی بہنیں عاشق کے گھر آباد ہیں آسیہ قدرے پڑھی لکھی اور ''روشن خیال'' عورت ہے اسی روشن خیالی کی وجہ سے **NGO,S** کی آنکھ کا تارا بن گئی اور علاقے میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے لگی۔ دیہات میں چونکہ عورتیں کھیتوں میں مزدوری کرتی ہیں ، آسیہ نے یہ طریقہ بنا رکھا تھا کہ عورتوں کے ساتھ مزدوری کے بہانے چلی جاتی اور اپنے ساتھ کام کرتی عورتوں کو باتوں باتوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتی۔

اسی معمول کے مطابق **14/06/2009** کو گاؤں کی عورتیں ادریس نامی زمیندار کے کھیتوں میں فالسہ کے باغ میں فالسہ توڑنے گئیں آسیہ بھی ان عورتوں میں موجود تھی۔ عورتیں عام طور پر دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھیتوں میں لے جاتی ہیں۔ جب عورتیں دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھیں تو آسیہ نے مافیہ بی بی ، آسیہ بی بی دختران عبدالستار کے گلاس میں پانی پی لیا۔ انہوں نے اس کے جھوٹے گلاس میں پانی پینے کی بجائے اپنا سالن والا برتن خالی کر کے اس میں پانی پی لیا۔ اس بات کو آسیہ نے اپنی توہین سمجھ کر دونوں بچیوں کے ساتھ تو تکار کر کے مذہبی گفتگو شروع کر دی۔ دوران گفتگو آسیہ نے نبی اکرم ﷺ اور قرآن مجید کے بارے میں انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ جن کا خلاصہ اس طرح سے ہے۔

''تمہارے نبی موت سے ایک ماہ قبل سخت بیمار پڑے رہے۔ حتی کی تمہارے نبی کے منہ اور کانوں میں (نعوذ باللہ) کیڑے پڑ گئے تھے۔ تمہارے نبی نے مال و دولت کے لالچ میں خدیجہ سے شادی کی اور مال و دولت بٹورنے کے بعد اسے گھر سے نکال دیا۔ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود سے بنائی گئی کتاب ہے۔''

یہ باتیں معافیہ بی بی، آسیہ بی بی دختران عبدالستار کے علاوہ یاسمین دختر اللہ رکھا اور کھیت میں موجود دیگر کئی عورتوں نے سنیں تو مسلمان عورتوں کا مشتعل ہونا ایک فطری عمل تھا انھوں نے آسیہ کو اپنا منہ بند رکھنے اور اپنے الفاظ واپس لینے کی بابت کہا۔ آسیہ کے انکار پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ جھگڑے کا شور سن کر کھیت کا مالک ادریس اور اس کی بیوی جو قریبی ڈیرہ پر موجود تھے موقع پر آگئے، معاملہ سنا اور آسیہ نے مذکورہ بیان شدہ الفاظ کا کہنا تسلیم کیا۔ ادریس نے اسے اپنے کھیتوں میں سے چلے جانے کا کہا تو وہ چلی گئی۔ مسلمان عورتوں نے گاؤں پہنچ کر یہ بات اپنے اپنے گھروں میں کی تو گاؤں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور گاؤں کے معززافراد پر مشتمل پنچایت اکٹھی ہوئی جس میں عیسائی لوگ بھی موجود تھے۔ آسیہ کو بلا کر مذکورہ گفتگو کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے ان الفاظ کا کہنا تسلیم کیا اور معافی بھی مانگی۔ اس پر گاؤں میں مزید اشتعال پیدا ہو گیا۔ اور لوگ آسیہ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ گاؤں کے نمبردار نے گاؤں والوں کو سمجھایا کہ اس نے جو جرم کیا ہے اس کی سزا موت ہی ہے۔ جو عدالت اسے دے گی تم اسے قتل کر کے کیوں اپنے ذمے جرم لیتے ہو۔ اور اس طرح قتل کر دیے جانے سے دیگر ممالک میں پاکستان کی جگ ہنسائی کا بھی اندیشہ ہے، مناسب ہے کہ اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے۔" نمبردار صاحب کے سمجھانے پر گاؤں والوں نے اس کے خلاف قاری محمد سالم کی مدعیت میں تھانہ صدر ننکانہ صاحب میں برائے اندراج مقدمہ درخواست گذاری تو، **19/06/2010** کو پولیس نے مقدمہ نمبر **326/09** بجرم **295/C** درج کر کے تفتیش محمد ارشد ڈوگر **SI** کے سپرد ہوئی۔ جس نے ریڈ کر کے ملزمہ کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا اور اس کا ڈاکٹری معاینہ کرانے کی استدعا عدالت سے کی لیکن ملزمہ نے ڈاکٹری معاینہ کرانے سے انکار کر دیا۔ ملزمہ سے کوئی برآمدگی مطلوب نہ ہونے کی بنا پر اسی دن اُسے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کر کے جوڈیشل جیل شیخوپورہ بھیج دیا گیا۔ اس مقدمہ کی اطلاع جب **RPO** شیخوپورہ رینج کو ہوئی تو اس نے اس مقدمہ کی حساسیت کے پیش نظر بروئے چٹھی انگریزی نمبری **18523-26/Leagal** مورخہ **24/06/2009** اس کی تفتیش سید محمد امین بخاری **SP** انویسٹی گیشن شیخوپورہ کے سپرد کر دی۔ سید محمد امین بخاری **SP** انویسٹی گیشن شیخوپورہ نے مثل مقدمہ طلب کر

کے ملاحظہ کی اور فریقین کو مورخہ 29/06/2009 کو اپنے دفتر طلب کیا۔ 29/06/2009 کو مدعی فریق کی جانب سے گواہان FIR سمیت 27 افراد نے جبکہ ملزمہ کی جانب سے 04 افراد نے پیش ہو کر اپنے بیانات ریکارڈ کروائے۔ وہاں پر ملزمہ آسیہ کے خاوند عاشق مسیح نے آسیہ کی برحلف صفائی دینے سے انکار کر دیا۔ فریقین کے بیانات سنے جو کہ ضمنی نمبر 03 مرتبہ مورخہ 29/06/2009 میں مفصل درج ہیں۔ بیانات سننے کے بعد ضمنی نمبر 03 پیرہ نمبر 12 میں لکھا کہ "معاملہ سنگین ہے۔ ریڈر خود کو حکم کیا کہ ادریس نامی کاشتکار جس کے کھیتوں میں وقوعہ ہوا ہے اسے بھی طلب کیا جائے اور ملزمہ جیل میں بند ہے اس سے ملاقات کے لئے سپرنٹنڈنٹ جیل کو درخواست لکھی جائے" مورخہ 04/07/2009 کو محمد ادریس مذکور نے SP انویسٹی گیشن کے روبرو پیش ہو کر اپنا مفصل بیان ریکارڈ کروادیا جو کہ ضمنی نمبر 04 مرتبہ 04/07/2009 میں مفصل درج شدہ ہے۔ محمد ادریس نے بتایا کہ وقوعہ کے بعد گاؤں میں حاجی علی احمد کے ڈیرہ پر اکٹھ ہوا جہاں لوگوں کی موجودگی میں ملزمہ نے حضور پاک ﷺ کی شان میں گستاخانہ باتیں کرنے کا اعتراف کیا۔ جبکہ اسی دن ریڈر SP انویسٹی گیشن نے علاقہ مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں ملزمہ سے جیل میں دریافت حالات کرنے کی اجازت طلب کی جو اسی دن اجازت دے دی گئی۔ تو مورخہ 06/07/2009 کو SP انویسٹی گیشن شیخوپورہ معہ عملہ متعلقہ ڈسٹرکٹ جیل شیخوپورہ پہنچا ملزمہ آسیہ سے جیل کے اندر ملاقات کر کے دریافت حالات کی اور اپنی مرتبہ ضمنی نمبر 05 پیرہ نمبر 05 میں لکھا کہ "مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں مسمات آسیہ بی بی کا حضور پاک ﷺ کی شان میں اور قرآن پاک کے متعلق گستاخانہ باتیں کرنا ثابت ہوا ہے جو مقدمہ ہذا میں صحیح گنہگار پائی گئی ہے" اپنی تفتیش مکمل کر کے ملزمہ کو گنہگار لکھ کر مسل واپس تھانہ صدر ننکانہ صاحب ارسال کر دی۔ جہاں سے مورخہ 12/07/2009 کو محمد ایوب I/SHO تھانہ صدر نے حالات تفتیش مقدمہ کی روشنی میں ملزمہ کو گنہگار قرار دیکر مسل چالان مقدمہ مکمل کر کے ہمراہ بیانات گواہان متعلقہ دفتر میں جمع کرا دیا۔ جو کہ معمول کے مطابق 14/09/2009 کو چالان عدالت میں پہنچا اور سماعت جناب نوید اقبال صاحب ایڈیشنل سیشن جج ننکانہ صاحب کے سپرد ہوئی۔ 03/10/2009 جناب محمد نوید اقبال ایڈیشنل سیشن جج صاحب ننکانہ صاحب نے

ملزمہ پر فرد جرم عائد کر کے مقدمہ کی باقاعدہ کاروائی کا آغاز کیا۔ استغاثہ کی طرف سے جناب میاں ذوالفقار علی ایڈووکیٹ جبکہ ملزمہ کی طرف سے وکلاء کا ایک مضبوط پینل جن میں ایس کے چوہدری، سید رشید حسین اور میاں محمد اجمل ایڈووکیٹس شامل ہیں عدالت میں پیش ہوتا رہا۔ پرائیویٹ گواہان ہر تاریخ پیشی پر عدالت میں حاضر ہوتے رہے لیکن کبھی وکلاء کی ہڑتال اور کبھی معزز جج صاحب کی چھٹی کی وجہ سے کئی ماہ تک گواہان کے بیانات ریکارڈ نہ ہو سکے۔ بالآخر 01/06/2010 گواہان استغاثہ قاری محمد سالم، مافیہ بی بی، عاصمہ بی بی محمد افضل نے، 15/06/201 کو محمد رضوان SI نے، 06/07/2010 محمد ارشد سب انسپکٹر (تفتیشی افسر) اور سید محمد امین بخاری SP انویسٹی گیشن شیخوپورہ (تفتیشی افسر) نے، 01/10/2010 کو محمد ادریس (جس کے فالسہ کے باغ میں وقوعہ ہوا تھا) نے بطور گواہ عدالت میں پیش ہو کر اپنا بیان قلمبند کرایا۔ جبکہ 20/10/2010 کو ملزمہ کا بیان ریکارڈ ہوا۔ کئی ماہ تک مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اسی دوران ملزمہ نے سیشن کورٹ اور ہائی کورٹ میں درخواست ہائے ضمانت پیش کیں جو نامنظور ہوئیں۔ سماعت مکمل ہونے پر ملزمہ گناہ گار ثابت ہو گئی تو مورخہ: 08/11/2010 کو جناب محمد نوید اقبال صاحب ایڈیشنل سیشن جج صاحب ننکانہ صاحب نے ملزمہ کو سزائے موت اور ایک لاکھ روپے جرمانہ کی سزا دی۔ ملزمہ کے وکیل رائے اجمل ایڈووکیٹ نے فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ جناب نوید اقبال صاحب نے میرٹ پر فیصلہ کیا ہے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران مجھے کوئی تعصب نظر نہیں آیا۔ ملزمہ آسیہ کے دفاع میں شہادت کمزور ہونے کی بنا پر میں نے شہادت عدالت میں پیش نہیں کی۔ وکیل موصوف کا یہ بیان مورخہ: 26/11/2010 ملکی اخبارات میں شائع ہوا۔ مکمل پولیس ریکارڈ جس میں مدعی، گواہان، ملزمہ اور پولیس کے مفصل بیانات لگے ہوئے ہیں اور مفصل عدالتی فیصلہ جس میں پورے مقدمہ کا خلاصہ اور حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد سزائے موت سنائی گئی ہے، کی فوٹو سٹیٹ کاپی میرے پاس موجود ہے جس کی روشنی میں یہ تحریر تیار کی جا رہی ہے۔

اگلے دن معمول کے مطابق یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو میڈیا میں شور برپا ہو گیا جو آج

تک جاری ہے۔ گورنر پنجاب جناب سلمان تاثیر صاحب اس سلسلہ میں بہت پیچ و تاب کھا رہے ہیں 20/11/2010 کو گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے اپنی بیٹیوں اور بیوی کو ساتھ لے کر جیل کے اندر ملزمہ سے ملاقات کی ،ملزمہ کو اپنے ساتھ بٹھا کر پریس کانفرنس کی۔ پولیس اور عدلیہ کی کئی ماہ کی انکوائری اور تحقیقات پر بیٹھے بٹھائے قلم پھیر کر ملزمہ کو بے گناہ قرار دے دیا اور اسے جلد ہی بری کر دیئے جانے کی نوید سنا کر اور ایک درخواست پر دستخط کروا کر چلے گئے۔ میڈیا پر یہ خبر بھی آچکی ہے کہ ملزمہ کو شیخوپورہ جیل سے کہیں نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

اپنا دینی اور ملی فریضہ سمجھتے ہوئے، میں صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری اور گورنر پنجاب جناب سلمان تاثیر صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا پاکستان میں ''اندھیر نگری اور چوپٹ راج'' والا معاملہ کیا جا رہا ہے؟ ابھی تو سیشن کورٹ ٹرائل ہوا ہے اس کے بعد ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی معزز عدالتیں موجود ہیں ان عدالتوں سے ٹرائل کے بعد صدر کے پاس اپیل کی باری آئے گی ۔اگر مجرمہ بے گناہ ثابت ہوگئی تو عدالتیں اسے بری کرنے میں آزاد ہیں۔ اگر گورنر اور صدر آصف زرداری نے سب عدالتوں کو بائی پاس کر کے مغربی خداؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر سیشن کورٹ کے فیصلہ پر ہی پیچ و تاب کھا کر مجرمہ کی رہائی کے غیر قانونی اور ناپاک منصوبے بنا رکھے ہیں تو ایک آرڈیننس جاری کر کے عدالتی نظام جو ان کے کئی ''منصوبوں'' کو روکے ہوئے ہے، ختم کر دیں اور خود ہی اپنی مرضی کے فیصلے کرتے جائیں۔ لیکن جب تک عدالتیں قائم ہیں ان کا احترام گورنر اور صدر مملکت کو عام پاکستانی شہری سے بدرجہا بڑھ کر کرنا ہوگا تاکہ عوام ان کی تقلید میں قانون کا احترام سیکھ سکیں۔ عقلمند لوگ دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھتے ہیں آپ لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ حضور نبی رحمت ﷺ کا نام ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہے گا مگر تمہارے اعمال کی وجہ سے۔

ع تمہاری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں

ابھی بھی وقت ہے ہوش کے ناخن لو اور اللہ اور اس کے رسول کی عزت کی حفاظت کا ڈنکا بجا دو وہ زمانے میں تمہاری عزت کا سامان پیدا کر دے گا۔ عیسائی آج بھی توہین عیسٰی علیہ السلام پر

سزائے موت دینے پر قائم ہیں لیکن نام نہاد مسلمان لیڈر توہین رسالت کے قانون کی طرح طرح کی تاویلیں کرکے اس کی روح کو سبوتاژ کرنے کے درپے ہیں۔ یورپی ممالک اسلام سے برگشتہ اور اسلامی تعلیمات پر نکتہ چینی کرنے والے انھیں نام نہاد مسلمانوں کو جس طرح عزت و توقیر سے نوازتے ہیں، یہ سراسر قابل اعتراض اور اشتعال انگیز حرکت ہے۔ گستاخ رسول، ملعون سلمان رشدی ہو یا تسلیمہ نسرین، ملعون کارٹونسٹ ہو یا شاتمہ آسیہ انھیں امریکہ ویورپ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور میڈیا میں انہیں ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جو کہ امریکہ ویورپ کے اسلام کے خلاف اندرونی بغض وعناد کا کھلم کھلا اظہار ہے۔ مغربی دنیا کی بھرپور کوشش ہے کہ روشن خیالی، آزاد روی اور جدیدیت کے نام پر مسلمانوں کو ان کے بنیادی اعتقادات سے بھی دور کردیا جائے۔ ان حالات میں سب اسلامیان پاکستان سے گذارش ہے کہ اپنے وسائل اور اختیارات کے مطابق ہر فورم پر احتجاج کرکے اس دریدہ دہن عورت کو کیفر کردار تک پہنچانے اور قانون توہین رسالت کی روح کو بچانے میں اپنا حصہ اپنے تمام تر وسائل سمیت ڈال کر عند اللہ اور عند رسول اللہ ﷺ سرخرو ہوں۔

حواشی:

۱) سورت الفتح۔ آیت ۹ (۲) سورت الاعراف۔ آیت ۱۵۷ (۳) سورت الحجرات۔ آیت ۲

۴) سورۃ البقرہ۔ آیت ۱۰۶ (۵) سورت المجادلہ آیت ۵ (۶) سورت المجادلہ۔ ۲۰ آیت

۷) سورت المجادلہ۔ آیت ۲۲ (۸) کتاب الشفاء از قاضی عیاض علیہ الرحمہ

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

ایف۔ آئی۔ آر

ابتدائی رپورٹ نسبت جرم قابل دست اندازی پولیس رپورٹ شدہ زیر دفعہ 154 مجموعہ ضابطہ فوجداری نمبر 326/9 15682 تھانہ صدر ننکانہ ضلع ننکانہ صاحب تاریخ ووقت وقوعہ 14/04/09

1	تاریخ ووقت رپورٹ	بحوالہ 23/19-06-09 بوقت 6/15 بجے شام	6	تھانہ سے روانگی کی تاریخ ووقت	سپیشل رپورٹ
2	نام وسکونت اطلاع دہندہ ومستغیث	درخواست ازاں قاری محمد سالم ولد حافظ غلام جیلانی قوم اعوان سکنہ چک نمبر 3 اناتوالی مرسلہ مہدی حسن ASI تھانہ صدر ننکانہ			
3	مختصر کیفیت جرم (معہ دفعہ) ومال اگر کچھ کھویا گیا ہے۔	جرم 295/C			
4	جائے وقوعہ فاصلہ تھانہ سے اور سمت	بحد رقبہ چک نمبر 3 اناتوالی بفاصلہ 7 میل جانب شمال از تھانہ			
5	کارروائی متعلقہ تفتیش اگر اطلاع درج کرنے میں کچھ توقف ہوا ہو تو اس کی وجہ بیان کی جائے	بلا توقف			

دستخط محمد رضوان Asi

عہدہ محرر

(ابتدائی اطلاع نیچے درج کرو)

نوٹ: اطلاع کے نیچے اطلاع دہندہ کا دستخط یا مہر یا نشان انگوٹھا ہونا چاہیے اور افسر تحریر کنندہ (ابتدائی اطلاع) کے دستخط بطور تصدیق ہونے چاہئیں بخدمت جناب SHO صاحب تھانہ صدر ننکانہ صاحب جناب عالی گذارش ہے کہ سائل چک نمبر 3 گ ب اناتوالی تھانہ صدر ننکانہ صاحب

تحصیل و ضلع ننکانہ صاحب کا رہائشی ہے اور مسجد صدیق اکبر میں بطور امام مسجد خدمات سرانجام دے رہا ہے مورخہ 14/06/09 کو بروز اتوار ادریس ولد احمد علی قوم آرائیں سکنہ دیہہ کی زمین میں آسیہ زوجہ عاشق مسیح جو عیسائی مذہب کی مبلغہ ہے گاؤں کی دیگر عورتوں جن میں عاصمہ بی بی دختر عبدالستار۔ مافیہ بی بی دختر عبدالستار۔ یاسمین دختر اللہ رکھا شامل ہیں فالسہ توڑ رہی تھیں آسیہ الزام علیہا نے کہا آپ مسلمانوں کے نبی (معاذ اللہ) کیا ہیں وہ وفات سے صرف ایک ماہ قبل چارپائی پر بیمار پڑے رہے اور تمہارے نبی کے منہ اور کانوں میں کیڑے پڑے۔ اور تمہارے (نبی ﷺ) نے حضرت خدیجہؓ سے محض مال کی خاطر شادی کی اور مال لوٹنے کے بعد انہیں گھر سے نکال دیا۔ مزید قرآن پاک کے متعلق کہا کہ وہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود بنائی گئی کتاب ہے۔ یہ سب باتیں عاصمہ بی بی۔ مافیہ۔ یاسمین مذکوران و دیگران نے مجھے اور گاؤں کے لوگوں کو بتائیں آج مورخہ 19/06/09 کو سائل معہ محمد افضل ولد محمد طفیل قوم گجر۔ مختار احمد ولد مشتاق احمد قوم راجپوت ساکنان دیہہ نے عاصمہ بی بی وغیرہ اور آسیہ الزام علیہا کو بلوایا اور 14/06/09 کے وقوعہ کے متعلق آسیہ مذکوریہ سے پوچھا تو اس نے اقرار کیا کہ مجھ سے واقعی میں نے نبی کریم اور قرآن پاک کی توہین کی مرتکب ہوئی ہوں اور معافی مانگتی ہوں۔ آسیہ مذکوریہ ملزمہ نے توہین رسالت ﷺ اور توہین قرآن کا ارتکاب کرکے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے دعویدار ہوں آسیہ ملزمہ مذکوریہ کے خلاف توہین رسالت ﷺ اور توہین قرآن پاک کرنے پر مقدمہ درج کرکے کارروائی مطابق قانون کی جاوے عرضے دستخط اردو قاری محمد سالم ولد حافظ غلام جیلانی قوم اعوان سکنہ چک نمبر 3 اٹانوالی تحصیل و ضلع ننکانہ (امام مسجد صدیق اکبر چک نمبر 3 اٹانوالی)

کارروائی پولیس: اس وقت میں معہ کانسٹیبل ارشد علی 842/C کانسٹیبل نبیل نواز 909/C سواری سرکاری گاڑی نمبری 7631/SAG جس کا ڈرائیور محمد یسین نمبر 468/C برائے گشت پل نمبر چندر کوٹ موجود ہوں کہ مسمی قاری محمد سالم مستغیث مذکور نے میرے پیش ہو کر درخواست مضمون بالا میرے پیش کی میں نے سردست جرم 295/C پائی جا کر درخواست ہذا بغرض اندراج مقدمہ بدست کانسٹیبل محمد ارشد 842/C ارسال تھانہ ہے مقدمہ درج کرکے نمبر مقدمہ سے اطلاع دی جاوے میں معہ ہمراہی

ملازمان بغرض تفتیش روانہ موقع کا ہوتا ہوں نیز سپیشل رپورٹ ہائے جابجا افسران مجاز بھجوائی جاویں دستخط

ارو مہدی حسن Asi تھانہ صدر ننکانہ صاحب از نقل نمبر چند در کورٹ بوقت 5/45 بجے شام۔

از تھانہ: حسب آمد درخواست مضمون بالا مقدمہ عنوان بالا درج رجسٹر کر کے اصل درخواست معہ نقل FIR بغرض تفتیش بدست آرندہ کا نسٹیبل عقب بوجہ معاملہ سنگین نوعیت محمد ارشد ڈوگر Si ارسال ہے نیز سپیشل رپورٹ ہائے جابجا افسران مجاز بھجوائی جارہی ہیں دستخط ارو محمد رضوان Asi محرر تھانہ صدر ننکانہ صاحب 19/06/09

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

اسلام کا نظریۂ حدود و تعزیرات

مفتی سید صابر حسین (کراچی) ☆

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو سلیم بنایا ہے یعنی یہ باعتبار اصل سلیم الطبع ہے۔ جب کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ فطرت سلیم کے ساتھ آتا ہے، جسے قرآن "فِطْرَتِ اللّٰهِ" کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ (سورۂ روم، آیت نمبر ۳۰) لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات کریمہ اور احادیث مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیکیوں کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت میں شر و باطل، فتنہ و فساد کو قبول کرنے اور جرائم کے کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ☆ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ☆ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ☆ پھر سمجھ دی اسکو بدکاری کی اور بچ کر چلنے کی، لہٰذا جس نے اسے پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے معصیت کی وہ ناکام ہو گیا۔ (سورۂ شمس، آیت نمبر ۸ تا ۱۰)۔ اسی طرح مشہور حدیث شریف ہے کہ ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن یہ اس کے والدین ہیں، جو اسے یہودی نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ اگرچہ انسان کی فطرت سلیم ہے لیکن وہ اپنے ماحول کے اثرات بد کو قبول کر کے گناہ و سرکشی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔۔

انسان کی فطرت سلیم ہے؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بار ہا وہ اپنی زندگی میں اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ خدانخواستہ اس سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو ابتداء وہ اپنے اندر ایک کشمکش پاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے واقعی کچھ غلط کر دیا ہے۔ دراصل یہ اس کی فطرت سلیمہ ہی ہے، جو اسے احساس

0321-2880864 ☆

دلاری ہوتی ہے۔ نیکیوں پر سکون و طمانیت کا حاصل ہونا اور گناہوں پر نادم و پشیمان اور پریشان رہنا بھی فطرت کے سلیم ہونے کا بین ثبوت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ بھی اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیکی وہ ہے، جس سے دل میں اطمینان ہو اور گناہ وہ ہے، جو دل میں کھٹکے۔ لیکن یہی شخص جب اس جرم کو بار بار کرتا رہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کے اندر کی یہ کشمکش دم توڑ دیتی ہے، پھر وہ گناہوں اور جرائم کا اس قدر خوگر ہو جاتا ہے کہ کسی بھی قسم کے گناہ پر اُسے ندامت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود کو حق پر سمجھنے لگتا ہے۔

لہٰذا جب یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ انسان میں جرائم کرنے اور زمین پر شر و فساد پھیلانے کی رغبت موجود ہے اور جرائم معاشرے کی بگاڑ اور امن و امان کو غارت کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، تو ان کی روک تھام اور سدِّ باب کے لئے شریعت نے حدود و قصاص اور تعزیرات کا نظریہ دیا۔ ان حدود و تعزیرات کے مقاصد میں انسان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت واضح کرنے اور مجرم کو قرار واقعی سزا دے کر اُسے آخرت کی سزا سے بچانے کے ساتھ ساتھ ایک اہم مقصد جرائم کو ختم کرنا اور معاشرے میں امن و آشتی کو پروان چڑھانا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۹ سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ حدود و قصاص کے نفاذ میں ہی انسانیت کی بقا مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ☆ ترجمہ: اور اے عقل مند لوگو! تمہارے لئے خون کا بدلہ (مشروع کرنے) میں زندگی ہے تاکہ تم (ناحق قتل کرنے سے) بچو۔ اور قرآن مجید کی سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۴۴، ۴۵، ۴۶ میں بالترتیب اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے مطابق فیصلہ نہ کرنے کو کفر، ظلم اور فسق وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ قارئین کرام کی معلومات کے لئے یہ بھی تحریر کرتا چلوں کہ حدود و قصاص اور تعزیرات دونوں ہی سزاؤں کی صورتیں ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ حدود و قصاص کی سزائیں شریعت کی متعین کردہ ہیں، جن میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کا کسی کو اختیار نہیں بلکہ بعینہٖ اسے نافذ کیا جائیگا۔ البتہ تعزیرات کا نفاذ حاکم وقت یا قاضی کی صوابدید پر ہوتا ہے اور وہ اس کا تعین جرم کی نوعیت

مجرم کے سابقہ ریکارڈ اور عرف (Customary Practice) وتعامل کو مدِ نظر رکھ کر سکتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود وقصاص کے بلا تفریق نفاذ سے لوگوں میں جرائم کے ارتکاب کی رغبت کم ہو جاتی ہے اور کیوں نہ ہو، جب ایک شخص کو بیچ چوراہے پکڑ کر کے لوگوں کے سامنے شریعت کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق سزا دی جائے تو وہاں پر موجود کوئی بھی شخص اس جرم کو کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ گویا ایک شخص (جو کہ مجرم ہے) کو سزا دے کر پورے معاشرے کو ارتکاب جرم سے بچایا جا سکتا ہے اور حدود وتعزیرات کے نفاذ میں سب سے اہم مقصد یہی ہے۔ اسلامی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں میں حدود وتعزیرات کو عملاً نافذ کیا جاتا رہا اُس وقت تک ان میں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس تناظر میں اگر خلافتِ راشدہ کے دور کو دیکھا جائے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ مبارک ہمیں بے مثال ویکتا نظر آتا ہے، جس میں حدود وقصاص سے لے کر تعزیرات تک کا عملی نفاذ نظر آتا ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنی نگرانی میں حدود وتعزیرات قائم فرمایا کرتے تھے۔ موجودہ زمانے میں سعودی عرب میں کسی حد تک حدود وتعزیرات کو عملاً قائم کیا جا رہا ہے، جس کے مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں کہ وہاں جرائم کی شرح دوسرے مسلم ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ وہاں کے لوگوں میں اپنی جان، مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا احساس اس قدر زیادہ ہے کہ وہاں پر دکاندار بلا خوف وخطر اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر نماز کی ادائیگی اور دوسرے کاموں کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اگر دوسرے اسلامی ممالک بھی اسی طرح کا طرزِ عمل اپنائیں تو یقیناً بہت فائدہ ہوگا۔

آج ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اولاً تو اسلامی حدود وتعزیرات کو معطل کر دیا گیا اور کسی قدر ان کا نفاذ ہے بھی تو حقیقی معنوں میں ان کے ثمرات معاشرے میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قانون وقت کے گذرنے کے ساتھ اپنی اہمیت وافادیت کھو بیٹھا ہے جیسا کہ بعض نام نہاد مغرب زدہ دانشوروں کا خیال ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب کہیں قوی مفاہمتی تکم

نا سے (National Reconciliation Order-NRO) کے نام سے مجرموں کے لئے گنجائش نکالنے کی غیر شرعی اور غیر قانونی کوششیں ہورہی ہوں، کہیں سیاسی مفادات اور کہیں ذاتی مفادات محفوظ ہوں، قومی خزانے کو لوٹنے والے کا جرم ثابت ہوجانے اور عدالتِ عالیہ سے سزا مل جانے کے باوجود صدارتی حکم نامہ (Executive Order) کے تحت معافی کا پروانہ دیا جارہا ہو، میڈیا پر جرم اور مجرم کی بھرپور تشہیر ہورہی ہو لیکن اس پر سزا نہ دی جارہی ہو یا ملنے والی سزا کی تشہیر جرم اور مجرم کی تشہیر کے مقابلے میں بالکل نہ ہو، اسی طرح جب مجرم کے دل سے سزا کے ملنے کا خوف ختم ہوجائے بلکہ جرم کرنے پر اُسے تحفظ ملنے کا یقین ہو تو پھر جرائم کیسے ختم ہونگے اور حدود و تعزیرات کے اثرات معاشرے پر کس طرح مرتب ہونگے۔

آج پاکستان میں ہر طرف قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم ہے، اس کی یہی وجہ تو ہے کہ مجرم کو کسی کا خوف نہیں وہ خود کو شرعی و ملکی قوانین سے بالاتر سمجھتے ہیں لہذا جو چاہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل (Transprency International) کی حالیہ رپورٹ میں پاکستان کو ۳۴ واں بدعنوان ترین ملک قرار دیا گیا ہے جبکہ گذشتہ سال اسے دنیا کے بدعنوان ترین ممالک میں ۴۲ ویں نمبر میں شامل کیا گیا تھا۔ اسی طرح دی نیشنل کرپشن پرسپشن سروے (The National Corruption Perception Survey) کی رپورٹ 2009 عیسوی کے مطابق گذشتہ تین سالوں میں پاکستان میں جرائم اور بدعنوانی کی شرح میں ۴۰۰ گنا تک اضافہ ہوا ہے اور یہ بدعنوانی نچلی سطح سے لے کر اوپر تک زندگی کے ہر شعبے میں ناسور کی طرح پھیلتی چلی جارہی ہے۔ ہمارے ہاں حال تو یہ ہے کہ جسے موقع مل رہا ہے وہ بدعنوانی میں مبتلا ہوکر ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے کسی کو ملک و ملت کی فکر نہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جنھیں اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر ہے اور ملک و ملت سے حقیقی محبت ہے۔ رپورٹ کے مطابق بدعنوانی پولیس اور توانائی (جس میں بجلی، گیس اور پیٹرول وغیرہ شامل ہیں) میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ حدود و تعزیرات کا عدم نفاذ اور قانون کی عدم بالادستی اس کی وجہ ہے۔ لہذا حقیقت تو یہ ہے آج بھی معاشرتی

بگاڑ اور بد امنی کا خاتمہ عدل و انصاف پر مبنی قانون اور حدود و تعزیرات کے منصفانہ اور شفاف نفاذ سے ہی ممکن ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارے ملک میں قانون کی حکمرانی (Rule of Law) نہیں بلکہ حکمرانوں کا قانون (Law of Ruler) ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ جرم و سزا کے حوالے سے اسلام کا ایک بنیادی قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جرم کو ظاہر ہونے سے پہلے حتی الوسع ختم کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس کے ظاہر ہونے سے دوسرے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور جرائم کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اگر کسی پر فرد جرم عائد کردیا جائے، تو پھر شریعت کا منشاء یہ ہے کہ مجرم کو ہر حال میں سزا دی جائے کیونکہ جرم کے ثبوت کے بعد اگر مجرم کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت برتی گئی یا اُسے سزا نہ دی گئی تو پھر دوسرے لوگ بھی جرم کو ہلکا سمجھ کر کرینگے، جو معاشرتی بگاڑ کا باعث بنے گا۔ اس اُصول کے تناظر میں اگر گذشتہ چھ ماہ کا ریکارڈ جمع کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ میڈیا پر جرائم کے ایسے کئی واقعات منظر پر لائے گئے اور ان کی خوب پرچار بھی کی گئی مثلاً سانحہ سیالکوٹ، کراچی میں روزانہ ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کے واقعات اور اسی طرح کے دوسرے جرائم پر مبنی واقعات۔ لیکن میڈیا پر صرف جرم کو دکھایا جا رہا ہے اس کی سزا نہیں لہذا یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ جرائم کی سزا میں روز افزوں اضافہ تو ہو رہا ہے لیکن کمی نہیں۔ جرم و سزا کی تشہیر کے حوالے سے یہ عدمِ توازن لٹیروں اور قاتلوں کی حوصلہ افزائی کا باعث بن رہا ہے۔ اس پر سیاست دان، میڈیا کے ذمہ داران، علماءِ کرام اور معاشرے کے دوسرے بااختیار افراد کو غور کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

اِنْ شَاءَ اللّٰہ

(یہ کلمہ کہنے کی اہمیت و افادیت اور نہ کہنے کا نقصان اور خسارہ)

از قلم: صوبیدار میجر (ر) محمد افضل منیر (ایم۔اے)☆

معنی اور مفہوم:

''ان شاء اللہ'' یہ ایک عربی کلمہ ہے جس کے معنی اور مفہوم سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں۔ حالانکہ ہمارے اسلامی معاشرہ میں اپنی گفتگو کے دوران اسکا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ اور بعض لوگوں کی زبان سے تو یہ کلمہ بلا نیت و ارادہ پھسل جاتا ہے۔ لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ بلکہ صدق دل سے اور خالص نیت و ارادے سے اسکا استعمال ضروری ہے۔

''ان شاء اللہ'' کا معنی ہے ''اگر اللہ نے چاہا'' (تو میں یہ کام کروں گا) گویا یہ کلمہ بول کر انسان اپنے کام میں اللہ تعالیٰ کی مشیت، رضامندی اور خوشنودی شامل کر لیتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کی درخواست کرتا ہے اور اپنی تمام تر توانائیوں اور کوششوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ جب بندہ یہ کلمہ کہہ لیتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید اسکے شامل حال ہو جاتی ہے، اور وہ کام خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم اور نظر عنایت سے سہل و آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اس کلمہ کے استعمال کو ترک کر دیتا ہے اور اپنے عزم و ارادہ کی پختگی پر ناز و گھمنڈ کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ جرأت و بہادری سے اس کام پر مکمل دسترس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے بسا اوقات شدید ناکامی کے باعث سخت ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات یہی ہیں کہ جب انسان مستقبل میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ

☆0321-5108424

یا وعدہ کرے تو صدقِ نیت اور خلوصِ دل سے ''ان شاء اللہ'' کہے تاکہ مشیتِ خداوندی اور تائیدِ ایزدی اس کی حامی و ناصر بن جائے۔

''ان شاء اللہ'' کہنے میں ایک یہ راز بھی مضمر ہے کہ انسان اپنے پروردگار کے سامنے نہایت عجز و انکسار کا اظہار کرتا ہے۔ اپنی کم مائیگی اور بے سروسامانی کا اعلان کرتے ہوئے اپنے رب کریم کے دامنِ لطف و رحمت سے وابستہ ہونے کا عندیہ دیتا ہے، نیز اپنی تہی دامنی اور تنگ دامانی کے باعث اپنے رحمان و رحیم اور قادر و کریم پروردگار سے توفیق و قدرت کا ملتجی ہوتا ہے۔ گویا اپنے رب قدیر سے التماس کرتا ہے کہ اے میرے خالق و مالک سب طاقتیں اور قدرتیں، سب قوتیں اور شوکتیں تیرے قبضہ قدرت میں ہیں۔ میں ایک بے بس اور بے کس ادنیٰ سا انسان ضعیف النسیان نہایت عاجز اور ناتواں ہوں۔ تیری توفیق اور مدد شاملِ حال ہوئی تو میرے سامنے پہاڑ بھی رائی کی مانند ہے لیکن اس کے برعکس اگر تیری توفیق میری رفیقِ کار نہ بنی تو میرے لیے رائی بھی پہاڑ ہے۔

موقع و محل:

''ان شاء اللہ'' کہاں اور کب کہنا چاہیے لہذا اس کے موقع و محل کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض احباب کم علمی اور نا سمجھی کی وجہ سے بے موقع اور بے محل اسکے مفہوم و معنی کے برعکس یہ کلمہ استعمال کر جاتے ہیں اور اس طرح وہ یا اسکی افادیت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا پھر بعض اوقات ان کے گنہگار ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، جس سے اجتناب از حد ضروری ہے۔

یہ کلمہ ''ان شاء اللہ'' کہنے کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل اُمور کو ذہن میں رکھا جائے۔

۱۔ ایسا کام جس کے کرنے کا ارادہ ہو، اسکا تعلق زمانہ مستقبل سے ہو۔ یعنی یوں کہہ سکتا ہے کہ میں ''ان شاء اللہ'' مسجد بنواؤں گا، یا ''ان شاء اللہ'' مکان خریدوں گا۔ وغیرہ

۲۔ اس کام کا تعلق امرِ خیر سے ہو۔ یعنی اس میں نیکی اور بھلائی کا عنصر ہو۔ خواہ اپنی ذات کیلیے ہو یا اور لوگ بھی اس میں شریک ہوں۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ لہذا کوئی ایسا معاملہ جس میں اللہ

تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہو تو ایسے موقع پر ''ان شاء اللہ'' کہنا سخت ترین گناہ ہے کیونکہ وہ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف کر رہا ہے۔ مثلاً معاذ اللہ کوئی شخص یوں کہے میں ''ان شاء اللہ'' چوری کروں گا یا شراب پیوں گا تو ایسا کہنا انتہائی غلط ہے۔ عین ممکن ہے کہ عملاً ایسا کہنے والا دائرہ کفر میں داخل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایسی بات کہنے سے محفوظ فرمائے۔

۳۔ ایسا امر خیر ہو جس کے بارے میں مشیت الٰہی پہلے سے معلوم نہ ہو۔ لہٰذا جس امر خیر کے لیے حکم الٰہی موجود ہے تو اس کے لیے بھی ''ان شاء اللہ'' کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ہی مشیت الٰہی ہے۔ مثلاً کسی آدمی کو آپ نماز، روزہ وغیرہ احکام الٰہیہ کی تلقین کرتے ہیں تو وہ آدمی اس کے جواب میں یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ''ان شاء اللہ'' نماز پڑھوں گا۔ کیونکہ نماز کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کا حکم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ تم نماز ادا کرو۔ تم پر کوئی الگ سے وحی تو نازل نہیں ہوگی۔

ایسے آدمی کو چاہیے کہ اپنی سستی کوتاہی اور بے عملی کا اقرار کرے اور شیطانی مکر و فریب سے بچنے کیلیے اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق کا طالب ہو کر پابندی سے نماز ادا کرنے پر کمربستہ ہو جائے۔

۴۔ اگر آدمی کسی ایسے امر خیر کے بارے میں بات کر رہا ہو جس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو تو پھر بھی وہ ''ان شاء اللہ'' نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ''ان شاء اللہ'' مسجد بنوائی تھی۔ بلکہ ایسی صورت میں الحمدللہ کے ساتھ بات شروع کرنی چاہیے۔ مثلاً یوں کہے میں نے الحمدللہ مسجد بنوائی تھی۔ قرآن کریم میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حصول سعادت کیلیے ایک مثال ذکر کر رہا ہوں۔

جنتی لوگ جنت میں جائیں گے وہاں کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھیں گے اور دوزخیوں کے احوال سے مطلع ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالاتے ہوئے کہیں گے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا''۔ (پ ۸، اعراف: ۴۳)

یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے اس کی راہ دکھائی۔

ہدایت چونکہ مل چکی ہے اور اسکا تعلق زمانہ ماضی سے ہے اس لیے اہل جنت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو گئے اور اس ہدایت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اصول بھی یہی ہے کہ ماضی میں واقع

ہونے والے ہر امر خیر کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے کہ اسی کی توفیق وتائید سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اس میں میری کوئی بہادری اور کمال نہیں۔ اگر کوئی شخص نادانی یا کم علمی کے باعث اسے اپنی بہادری اور کمال کا مظہر قرار دے تو قوی اندیشہ ہے کہ وہ اپنے اس عمل کے ثواب سے محروم ہو جائے۔

لہذا اپنے ہر نیک عمل کے بارے میں یوں کہے کہ میں یہ عمل (کام) اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رحمت سے ہی کر سکا۔ جس طرح کہ جناب ذوالقرنین نے دیوار بنانے کے بعد فرمایا!

''هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ'' ۔ (پ ۱۶۔ الکھف: ۹۸)

یہ دیوار کی تعمیر میرے رب کی رحمت کی وجہ سے ہوئی ہے۔

اور سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف بن برخیا نے جب پلک جھپکنے کی دیر میں تخت بلقیس حاضر کر دیا تو آپ نے فرمایا:

''هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ'' ۔ (پ ۱۹: النمل: ۴۰)

یہ۔۔۔ تخت بلقیس کا قلیل ترین وقت میں یہاں پہنچنا۔۔۔ میرے رب کے فضل سے ہوا ہے۔

ہاں! اگر آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا تو قطعاً قطعاً اللہ تعالیٰ کی طرف اسے منسوب نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا مشرکین کی عادت تھی۔ قرآن کریم میں مشرکین کا یہ شیوہ مذکور ہے کہ وہ اپنے اعمال شرکیہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے!

''سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا'' (پ ۸: الانعام: ۱۴۸)

عنقریب مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے۔

ان کا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم نے جو کچھ کیا یا ہمارے آباؤ اجداد نے جو کچھ کیا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا۔ گویا یہ دلیل ہے کہ وہ اس سے راضی ہے۔ (استغفر اللہ)

بلکہ ایسی باتوں کو اپنے نفس کی شامت اعمال سمجھنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں ہے! وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (پ ۵ النساء: ۷۹)

یعنی جو تمھیں برائی پہنچتی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کی وجہ سے ہے۔

۵۔اور اگر اس امر خیر کا تعلق زمانہ حال سے ہو تو پھر یوں کہنا چاہیے۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ جیسا کہ قرآن کریم میں سورہ کہف کی آیات ۳۲ تا ۴۴ میں ایک مسلمان اور کافر کے درمیان ایک مکالمہ درج ہے۔ اس مکالمہ کی کیفیت یوں بیان کی گئی کہ ایک کافر اپنے باغ کی زرخیزی اور اس کے سر سبز و شاداب ہونے پر فخر و غرور کرتا ہے۔ اور اپنے مالدار اور طاقتور ہونے پر ناز اور گھمنڈ کرتا ہے۔ تو مسلمان اسے وعظ و نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

''وَلَوْ لَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ''۔(پ۱۵،الکہف:۳۹)

ترجمہ از کنز الایمان: کیوں نہ ہوا کہ جب تو اپنے باغ میں گیا، تو کہا ہوتا، جو اللہ چاہے، ہمیں کچھ زور نہیں مگر اللہ کی مدد کا۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت صدر الافاضل مراد آبادی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں!

''اگر تو باغ کو دیکھ کر۔ ماشاء اللہ۔ کہتا اور اعتراف کرتا کہ یہ باغ اور اس کے تمام محاصل و منافع اللہ تعالٰی کی مشیت اور اس کے فضل و کرم سے ہیں اور سب کچھ اسکے اختیار میں ہے۔ چاہے اسکو آباد رکھے، چاہے ویران کرے۔ ایسا کہتا تو تیرے حق میں بہتر ہوتا۔ تو نے ایسا کیوں نہیں کیا؟'' (تفسیر خزائن العرفان)

مگر اس کافر نے مسلمان کی نصیحت کو قبول نہ کیا بلکہ نخوت و اعونت سے اس کی گردن اکڑی رہی۔ اور تقریباً اکثر مالداروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کو اپنے علم و ہنر کا کمال اور اپنی ذات کا استحقاق سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ قارون نے اپنے مال و دولت کے بارے میں کہا کہ:

''اِنَّمَا اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ''۔(پ۲۰،القصص:۷۸) یہ مال و دولت تو مجھے اپنے علم کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔

تو اللہ تعالٰی جو کہ علی کل شیء قدیر۔ ہر چیز پر قادر ہے اس نے اسکے تمام اموال و اسباب سمیت اسے زمین میں دھنسا کر اعلان کر دیا:

"فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ "۔(پ۲۰،القصص:۸۱) تو ہم نے اسے (یعنی قارون کو) اور اسکے گھر کو زمین میں دھنسادیا۔

تو یہی حال اور انجام اس کافر کا بھی ہوا۔اللہ تعالیٰ نے اس کے انجام بد کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

"وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ○ (پ۱۵،الکہف:۴۲) اور اس کے پھل گھیر لیے گئے تو وہ اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا۔اس لاگت پر جو اس نے باغ پر خرچ کی تھی اور وہ (باغ) اوندھے بل گرا ہوا تھا۔اور کافر کہہ رہا تھا،اے کاش! میں نے اپنے رب کا کسی کو شریک نہ کیا ہوتا۔

مگر اب پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

یہ تو بندے پہلے سوچنا چاہیے کہ جو قادر مطلق دے سکتا ہے وہ واپس بھی لے سکتا ہے۔

ان شاء اللہ کہنے کی اہمیت:

"ان شاء اللہ" کہنے کی اہمیت کے حوالے سے تین باتیں اپنے ذہن میں رکھیں اور پھر اندازہ فرمالیں کہ اس کلمہ کی کتنی بڑی اہمیت ہے جس سے ہم عموماً صرف نظر کیے رکھتے ہیں۔پہلے یہ تین پوائنٹ نوٹ فرمالیں پھر حسب مقدور ان کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱) اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا۔

۲) اللہ تعالیٰ نے خود بھی اس کلمہ کو استعمال فرمایا۔

۳) انبیائے کرام نے بھی اس کلمہ کو استعمال کرنے کا التزام رکھا۔

اب ان تینوں کی مختصری توضیح پیش خدمت ہے۔

۱۔قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الف)۔وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔(پ۱۵،الکہف:۲۳) کسی شیء کے بارے میں (حتمی طور پر) ہرگز یہ نہ کہو کہ میں کل یہ (ضرور) کروگا،مگر یہ کہ جب اللہ چاہے) یعنی یوں کہو جب اللہ چاہے گا تو یہ کام کروں گا۔

حضرت صدرالافاضل رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی جب کام کا ارادہ ہو تو یہ کہنا کہ ''ان شاء اللہ'' ایسا کروں گا۔ بغیر ''ان شاء اللہ'' کے نہ کہے''۔ (خزائن العرفان)

اس آیت مبارکہ کے شان نزول کے بارے میں آپ رقم طراز ہیں:

''اہل مکہ نے رسول کریم ﷺ سے اصحاب کہف کا حال دریافت کیا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا! کل بتاؤں گا۔ اور ''ان شاء اللہ'' نہیں فرمایا تھا کئی روز وحی نہیں آئی۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی''۔ (خزائن العرفان)

اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ اس آیت مبارکہ میں تاکید کس قدر ہے۔ ایک تو فعل نہی ہے اور دوسرا اس پر نون تاکید ثقیلہ لگایا گیا ہے، جس کے باعث تاکید میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اسکا اندازہ اس ایت کے ترجمہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

(ب)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ ۔ (پ۱۵، الکہف: ۲۴) اپنے رب کو یاد کرو جب تم بھول جاؤ۔

اسکا مفہوم یہ ہے کہ دوران کلام اگر ''ان شاء اللہ'' کہنا یاد نہیں رہا تو جب یاد آئے تو ''ان شاء اللہ'' کہہ لے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک اس مجلس میں رہے تو ''ان شاء اللہ'' کہہ سکتا ہے۔ (ماخوذ از خزائن العرفان)

۲۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود بھی اس کلمہ ''ان شاء اللہ'' کو استعمال فرمایا ہے۔ سورہ فتح میں مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری دی گئی اور شہر مکہ میں داخل ہونے کا یقین دلایا گیا۔ صلح حدیبیہ سے قبل سرکار دو عالم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی معیت میں مکہ معظمہ داخل ہوئے۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب سے بیان فرمایا تو صحابہ کرام نہایت خوش ہوئے اور یہ خیال کیا کہ وہ اسی سال خواب کی تعبیر دیکھ لیں گے، اور مکہ معظمہ میں بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرف ہوں گے۔ لیکن جب صلح حدیبیہ کی صورت میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے بغیر واپس آنا پڑا تو منافقوں نے استہزا کرتے

شروع کر دیا۔ جس سے صحابہ کرام سخت دل گرفتہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

"لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ "۔۔۔۔الآیۃ۔(پ ۲۶، الفتح: ۲۷)

بے شک اللہ نے سچ کر دکھایا اپنے رسول کا سچا خواب (اے مسلمانو!) بیشک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے اگر اللہ چاہے، امن وامان سے۔(ترجمہ از کنزالایمان)

گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پختہ اور مؤکد بیان کرتے ہوئے کلمہ "ان شاء اللہ" کے ساتھ ذکر فرمایا اور اپنی مشیت کی مہر ثبت فرمادی۔

۳۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا طرزِ عمل بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان مبارک ہستیوں نے دورانِ کلام اسی کلمہ "ان شاء اللہ" کو لازمی استعمال فرمایا۔ ذیل میں قرآن کریم سے ہی ماخوذ انبیائے کرام کے اقوال پیش خدمت ہیں۔

(ا)۔ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر کے فرمانروا بنے اور تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے تو اپنے والدین کریمین کو اپنے بھائیوں کو ان کی آل اولاد سمیت مصر میں سکونت اختیار کرنے کے لیے بلایا۔ جب وہ مصر کے قریب پہنچے تو آپ خود ان کے استقبال کیلیے مصر سے باہر نکلے اور انہیں مصر میں داخل ہو کر سکونت اختیار کرنے کے بارے میں یوں کہا:

"وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ "۔(پ ۱۳، یوسف: ۹۹) اور حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کہا، ان شاء اللہ مصر میں امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

یعنی آپ لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کی اجنبیت کا اندیشہ، وطن سے دوری کی فکر، اور بے گانگی کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہاں آپ کو امن وسکون اور سلامتی حاصل ہوگی اور اپنے وطن جیسا آرام واطمینان ملے گا۔

(ب)۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے سامنے اپنے خواب کا ذکر فرمایا کہ اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کو ذبح کر رہا ہوں اور

نبی کا خواب چونکہ حکم الٰہی ہوتا ہے۔ اس لیے اب تم بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنے عظیم باپ کے سامنے فدویانہ انداز میں گزارش کی:

''قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ''۔ (پ۲۳، الصافات ۱۰۲:)

اے پیارے ابا جان! جس بات کا آپ کو حکم ہوا ہے آپ اس کی تعمیل کیجئے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنے حلقوم ناز پر چھری چلنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اسے اپنے لیے ایک عادت خیال فرمایا۔ لیکن اس مشکل ترین کام میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کا سہارا لیا۔ اس کام کے مشکل ہونے کا ذکر خود رب کائنات نے فرمایا:

''اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ''۔ (پ۲۳، الصافات:۱۰۶) بے شک یہ ایک بہت بڑی (مشکل) آزمائش تھی۔

یہ مشکل جہاں بیٹے کے لیے تھی، وہاں باپ کیلیے بھی شاید اس سے زیادہ مشکل تھی، کیونکہ جس باپ کو بڑھاپے کی عمر میں اسماعیل علیہ السلام جیسا ہونہار اور فرمانبردار فرزند نصیب ہوا ہو، جو اسکے بڑھاپے کا سہارا بننے والا ہو، اسکے ریشمیں حلقوم پر چھری رکھنا بڑے ہی دل گردے کا کام تھا۔ لیکن جب باپ بیٹے دونوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رضا مندی کو اپنا نصب العین بنالیا، تو یہ اتنی بھاری مشکل آسان ہوگئی اور پھر وفدیناہ بذبح عظیم کہہ کر رب کریم نے اپنے عظیم انعامات اور مژدہ قبولیت سے سرفراز فرمادیا۔

(ج)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کو چھوڑ کر مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ راستے میں میں ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ آپ نے وہاں دو نیک سیرت خواتین دیکھیں جو ایک جانب اپنے جانوروں کو سنبھال رہی تھیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ وہ کہنے لگیں کہ جب یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے جائیں گے تو باقی بچا

بچا پانی ہم اپنے جانوروں کو پلا لیتی ہیں، کیونکہ یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد کنویں کو ایک بھاری پتھر سے ڈھانک جاتے ہیں جسے اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔

وہ بھاری پتھر جسے دس آدمی بمشکل اٹھاتے اور رکھتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تن تنہا وہ پتھر اٹھایا، کنویں سے پانی نکال کر ان خواتین کے جانوروں کو خوب سیراب کرنے کے بعد ایک کنارے آرام کی غرض سے نکل گئے۔

وہ دونوں نیک نہاد خواتین حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں تھیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آج تم جانوروں کو پانی پلا کر جلدی واپس آ گئی ہو۔ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بتایا کہ اس طرح ایک نیک طینت فرشتہ صورت انسان نے ہماری مدد کی، اس وجہ سے آج ہم جلدی گھر لوٹ آئی ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام فراست نبوت سے سارا معاملہ سمجھ گئے اور اپنی ایک صاحبزادی کو فرمایا کہ جاؤ اور اس نووارد کو بلا کر لے آؤ۔

حضرت شعیب علیہ السلام اس وقت ضعیف العمر تھے۔ اولاد صرف دو بیٹیوں پر مشتمل تھی۔ اس لیے آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میرے پاس آٹھ یا دس سال تک قیام فرمائیں۔ تو اس کے بدلے میں اپنی ایک صاحبزادی کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں گا۔ تو اس گفتگو میں آپ نے فرمایا:

"سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (پ۲۰، القصص: ۲۷) ان شاء اللہ تم مجھے نیک لوگوں میں پاؤ گے۔

(د)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم لدنی (علم مکاشفہ) تھا، تو آپ نے حضرت خضر سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ عرصہ آپ کے ساتھ رہ کر اس علم کے بارے میں معلومات حاصل کر لوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے علم مکاشفہ کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عجیب و غریب واقعات دیکھیں گے تو خاموش نہیں رہ سکیں گے، چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جب ان سے اس بات کا برملا اظہار کر دیا تو جواباً حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے خاموش رہنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"قَالَ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ اللَّهُ صَابِرًا ۝ (پ۱۵، الکہف: ۶۹) فرمایا ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

اس سے یہ بات مستفاد ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان واقعات کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے جو بے تابی کا مظاہرہ فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے عین مطابق تھا۔

ان شاء اللہ کہنے کی افادیت:

اس تحریر کے آغاز میں عرض کر دیا ہے کہ ان شاء اللہ کہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہو جاتی ہے۔ ذیل میں اس مؤقف کی وضاحت قرآن و حدیث کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

۱)۔ قرآن کریم میں سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے حوالے سے ایک گائے کا ذکر ہے۔ اسکا مختصر پس منظر یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک مالدار شخص تھا، اسکے چچازاد بھائی نے بطمع وراثت اسکو قتل کر کے کسی دوسری بستی کے دروازے پر ڈال دیا اور خود صبح اس کے خون کا مدعی بن گیا۔ لوگوں نے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ حقیقت حال ظاہر فرمائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کریں اور اس کے گوشت کا کوئی حصہ مقتول کے جسم کے ساتھ لگائیں تو مقتول زندہ ہو کر بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔

بنی اسرائیل اس حکم کی تعمیل میں لیت و لعل کرنے لگے اور گائے کے بارے میں طرح طرح کے سوال و جواب کرنے لگے۔ انکا مقصد یہ تھا کہ گائے ذبح کرنے کا حکم ٹل جائے۔ کج بحثی میں اس قدر بڑھ گئے کہ ہر سوال میں استہزا کی جھلک نظر آتی ہے اور اپنے رسول معظم کی گستاخی اور بے ادبی کا پہلو نمایاں ہو رہا ہے جس میں نافرمانی اور عدم تعمیل کا عنصر غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سوال کے جواب میں سے مزید کوئی نہ کوئی سوال گھڑ لیتے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل کج بحثی میں نہ الجھتے اور کوئی سی گائے بھی ذبح کر

دیتے تو حکم الٰہی پر عمل ہو جاتا لیکن بمصداق ۔۔۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔۔۔ جوں جوں ان کا سلسلہ سوال دراز ہوتا گیا، گائے ذبح کرنے کا معاملہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا، لیکن حکم ربی چونکہ اٹل تھا اس لیے جب بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ گائے ذبح کرنا ناگزیر ہے جس سے چھٹکارا ناممکن ہے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں نیاز مندی کے ساتھ درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے اسی مطلوبہ گائے کے مکمل اوصاف اور خصائص دریافت کریں اور آخر میں کہا:

"وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ○ (پ ۱، البقرہ: ۷۰) اور ہم ان شاء اللہ یقیناً راہ یاب ہو جائیں گے۔

جب انھوں نے یہ کلمہ ان شاء اللہ استعمال کیا تو انہیں حکم الٰہی کی بجا آوری کی توفیق نصیب ہوگئی۔ حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ ان شاء اللہ کا کلمہ استعمال نہ کرتے تو وہ کبھی بھی مطلوبہ گائے تک رسائی اور رہنمائی نہ حاصل کر پاتے۔ (ماخوذ از خزائن العرفان، ضیا القرآن)

۲)۔ سورہ کہف کی آیات ۹۳ تا ۹۸ کا مطالعہ فرمائیں انکا ماحصل یہ ہے کہ جناب ذوالقرنین اپنی فتوحات کے سلسلہ میں ایک قوم کے پاس گئے اس قوم نے اپنی ایک تکلیف اور مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یاجوج ماجوج کی قوم نے ہمارے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہم ان کی اذیت اور ایذا رسانی سے بہت پریشان ہیں۔ انکی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ ٹڈی دل کی طرح نکلتے ہیں اور ہر طرف پھیل جاتے ہیں۔ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، کھیتیاں ویران کر دیتے ہیں اور خشک ساز و سامان لاد کر لے جاتے ہیں۔ انسانوں سمیت، درندوں، وحشی جانوروں حتیٰ کہ سانپوں اور بچھوؤں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ لہذا ہمارے ساتھ اگر آپ کوئی بھلائی کر سکتے ہیں تو ان کے شر سے ہمیں بچائیں، اور ان کے شر اور فساد سے بچنے کیلیے بہترین صورت یہ ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط فصیل (دیوار) بنادیں۔

چنانچہ حضرت ذوالقرنین علیہ السلام نے ان کی تجویز کو قبول کیا اور لوہے اور تانبے وغیرہ کو پگھلا کر ایک نہایت مضبوط دیوار کھڑی کر دی جس کے باعث اس قوم کو یاجوج ماجوج کی ایذا رسانیوں سے نجات حاصل ہوگئی اور انہیں سکون واطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ جب وہ قوم آپ کے سامنے تشکر

واحسان کا اظہار کرنے لگی تو آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

''قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝ (پ۱۶، الکہف: ۹۸)

کہا یہ میرے رب کی رحمت (سے ممکن ہوا) ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اسے پاش پاش کر دے گا۔ اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جناب ذوالقرنین نے اس عظیم کارنامے کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اسے اپنے رب کی رحمت اور مہربانی سے تعبیر کیا۔ (یہ اشارہ پہلے گذر چکا ہے) نیز آپ نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ دیوار اگرچہ بہت مضبوط ہے لیکن اسکے باوجود ایک نہ ایک دن اس نے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانا ہے اور یہ کب ہونا ہے اسکے بارے میں حدیث شریف سے ہمیں یوں رہنمائی ملتی ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ!

یاجوج ماجوج روزانہ اس دیوار کو توڑتے ہیں اور دن بھر محنت کرتے ہیں جب اس کو توڑنے کے قریب ہو جاتے ہیں تو ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ چلو باقی کل توڑ لیں گے، دوسرے روز آتے ہیں تو بحکم الٰہی وہ دیوار پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ قیامت کے قریب جب ان کے خروج کا وقت آئے گا (اللہ تعالیٰ کے وعدے اور مشیت کے مطابق) تو ان میں سے کوئی کہنے والا یوں کہے گا کہ اب چلو ان شاء اللہ باقی کل توڑ لیں گے۔۔۔تو۔۔۔اب۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنے کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اس دن کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور اگلے دن انہیں اتنی دیوار ٹوٹی ہوئی ملے گی جتنی کہ وہ پہلے دن توڑ گئے تھے۔

آمدم برسر مطلب۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنے سے بندے کی محنت اکارت نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید حاصل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ان شاء اللہ کہنے کا التزام رکھیں۔

ان شاء اللہ نہ کہنے کا نقصان:

جس طرح ان شاء اللہ کہنے سے فوائد حاصل ہوتے ہیں اسی طرح ان شاء اللہ نہ کہنے سے نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ قرآن کریم سے ماخوذ ایک واقعہ کا مطالعہ فرمائیں جو

ہمارے اس بیان کی واضح دلیل ہے۔

ا۔ پارہ ۲۹ سورہ القلم میں آیات ۱۷ تا ۲۰ کو غور سے پڑھیں ان آیات میں ایک واقعہ کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ:

یمن سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر مقام صنعا میں سر راہ ایک باغ تھا جس کا نام ضروان تھا۔ اسکا مالک ایک مرد صالح تھا جو باغ کے میوے کثرت سے فقراء کو دیتا تھا۔ جب باغ میں جاتا تو فقراء کو بلا لیتا۔ تمام گرے پڑے فقراء لے لیتے اور باغ میں بستر بچھا دیئے جاتے اور جو خالص اپنا حصہ ہوتا اس میں سے بھی دسواں حصہ فقراء کو دے دیتا۔ اسی طرح کھیتی کاٹتے وقت بھی اس نے فقراء کے بہت زیادہ حقوق مقرر کر رکھے تھے۔ اس کے تین بیٹے تھے (جب اسکا انتقال ہو گیا) تو اس کے بیٹے اس کے وارث ہوئے۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ مال قلیل ہے اور کنبہ بہت ہے۔ اگر والد کی طرح ہم بھی خیرات جاری رکھیں گے تو تنگدست ہو جائیں گے۔ انہوں نے آپس میں مل کر قسمیں کھائیں کہ کل صبح سویرے منہ اندھیرے گھر سے نکل چلیں گے اور لوگوں کے اٹھنے سے پہلے اپنی فصل اور میوے سنبھال لیں گے۔ کیونکہ فقراء اور مساکین مانگ مانگ کر تنگ کر دیتے ہیں۔ منہ اندھیرے نہ کوئی فقیر آئے گا نہ مانگے گا۔ اس مشاورت میں انہوں نے قسمیں کھا کر اپنے عزم مصمم کا اظہار کیا۔ مگر ان شاء اللہ نہ کہا۔ قرآن میں ان کا تذکرہ یوں کیا گیا:

"اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۝ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ (پ ۲۹، القلم: ۱۷، ۱۸)

جب انہوں نے قسم کھائی کہ ضرور صبح ہوتے اسکے کھیت کاٹ لیں گے۔ اور ان شاء اللہ نہ کہا۔

تو ان شاء اللہ نہ کہنے کا کیا نقصان ہوا۔ ذرا اگلی آیات ملاحظہ فرمائیں:

"فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۝

تو اس باغ پر تمہارے رب کی طرف سے ایک آفت آئی جبکہ وہ ابھی سوئے تھے۔ تو وہ باغ صبح تک ویرانی اور بربادی کا منظر پیش کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی کہاں بھاگ سکتا ہے اسکی خفیہ تدبیر بہت سخت ہوتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ

ہمیں اپنے ہر کام اور ارادے میں۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنا نہیں بھولنا چاہیے تاکہ اپنے معاملات کے فوائد سے متمتع ہوسکیں اور ان کے نقصانات سے محفوظ رہ سکیں۔

گذشتہ سطور میں جو معروضات پیش کی گئی ہیں ان کی تہہ میں مستور یہ حقیقت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔نہ کہنے سے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہیں ہوتی اور انسان اپنے مقاصد کے حصول میں عموماً خاطر خواہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتا۔

۳)۔آپ نے پڑھا کہ بنی اسرائیل گائے کے ذبح کرنے کے معاملے میں موشگافیاں نکالتے رہے اور جب تک انہوں نے۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔نہیں کہا تو انکا معاملہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا، جس سے بخوبی اور با آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔نہ کہنے سے مسائل میں دشواری اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔

۴)۔یاجوج ماجوج کے بارے میں بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ وہ لوگ جناب ذوالقرنین کی بنائی ہوئی مضبوط ترین دیوار کو توڑنے میں مصروف ہیں۔اور اب تک انہیں صدیاں بیت گئی ہیں مگر انہیں کاطرخواہ کامیابی حاصل نہیں ہورہی ہے۔کیونکہ وہ ان شاء اللہ نہیں کہتے البتہ جب وہ ان شاء اللہ کہیں گے تو دیوار توڑنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

حاصل کلام:

اس ساری عرضداشت کا نتیجہ اور خلاصہ یہ کہ!

۱۔ ان شاء اللہ کہنا اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی اپنے کلام میں ان شاء اللہ استعمال فرمایا۔

۳۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا بھی یہی معمول رہا ہے کہ جب اپنے کسی ارادے کا اظہار فرماتے تو۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کا کلمہ ضرور استعمال فرماتے۔

۴۔ جب کسی کام کیلیے۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کا کلمہ استعمال کیا جائے تو اس کے مثبت اثرات اور بابرکت ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔ ''ان شاء اللہ'' کا استعمال ترک کرنے سے معاملات میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات ناقابل تلافی نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔
لہذا یہ ضروری ہے کہ اپنے معاملات میں اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے کسی نیک کام کے کرنے کا ارادہ ظاہر کریں تو۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔اس میں ضرور استعمال کریں۔ یا کسی سے کوئی وعدہ یا معاہدہ کریں تو۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہنا ہرگز نہ بھولیں۔ اور اگر بالفرض اس وقت یاد نہیں رہا تو جب یاد آئے تو فوراً۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہہ لیں۔ اس عمل سے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو جائے گی اور وہ کام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوگا۔

میرے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے کے لوگ۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کام کرنے کے ارادے سے کہتے تھے مگر موجودہ زمانہ میں کسی کام کو ٹرخانے کیلیے یا ٹال مٹول کرنے کے لیے۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہہ لیتے ہیں اور دن بدن لوگوں کی یہ روش بڑھتی جا رہی ہے۔

قارئین کرام سے میری دست بستہ گذارش ہے کہ ٹالنے کی غرض سے کبھی بھی۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کا کلمہ استعمال نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کرنے سے آپ کسی ایسے وبال یا مصیبت میں گرفتار ہو جائیں جس سے گلو خلاصی ناممکن ہو جائے اور پچھتاوا حاصل ہو۔ اس لیے جب یہ کلمہ استعمال کریں تو صدق دل سے کام کرنے کی نیت سے۔۔۔ان شاء اللہ۔۔۔کہیں۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

تحقیق تاریخ
ولادت ووصال مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم

تحریر: ابواُسامہ ظفر القادری بکھروی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین اما بعد

حضور ﷺ کی تاریخ ولادت کا بیان:

شاعر دربار رسالت حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا فرمائی۔ ساٹھ سال آپ نے جہالت میں گزارے اور ساٹھ سال بحیثیت ایک سچے مومن کے آپ کو زندگی گزارنے کی مہلت دی گئی۔ آپ فرماتے ہیں! ''میری عمر ابھی سات آٹھ سال تھی مجھ میں اتنی سمجھ بوجھ تھی کہ جو میں دیکھتا اور سنتا تھا وہ مجھے یاد رہتا تھا۔ ایک دن علی الصبح ایک اونچے ٹیلے پر یثرب میں ایک یہودی کو میں نے چیختے چلاتے ہوئے دیکھا وہ یہ اعلان کر رہا تھا: ''یا معشر یهود فاجتمعوا الیه۔ اے گروہ یہود سب میرے پاس اکٹھے ہو جاؤ۔ یہودی اسکا اعلان سنتے ہی بھاگ کر اس کے پاس اکٹھے ہو گئے اور اس سے پوچھا بتاؤ کیا بات ہے۔ اس نے کہا! ''طلع نجم احمد الذی ولد به فی هذه اللیلة ای الذی طلوعه علامة علی ولادته ﷺ فی تلک اللیلة فی بعض الکتب القدیمة''۔ اس نے کہا کہ وہ ستارہ طلوع ہو گیا جس نے اس شب کو طلوع ہونا تھا۔ جو بعض کتب قدیمہ کے مطابق احمد (ﷺ) کی ولادت کی رات ہے۔ (ضیاء النبی ج ۲ ص ۳۰، ۳۱)

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کا یوم میلاد دوشنبہ یعنی سوموار کا دن تھا۔ اس پر بھی علماء اُمت کا تقریباً اتفاق ہے۔ وہ بابرکت مہینہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ہوئی ربیع الاول کا تھا۔ اب ہم دلائل کی روشنی میں دیکھیں گے کہ ربیع الاول کی تاریخ کون سی تھی؟

صحیح ترین تاریخ ولادت ۱۲ ربیع الاول ہی ہے:

۱۔امام ابن جریر طبری جو فقید المثال مفسر، بالغ نظر مورخ بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں! ''ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنین عام الفیل لاثنتی عشرة لیلۃ مضت من شهر ربیع الاول ''۔رسول کریم ﷺ کی ولادت سوموار کے دن ربیع الاول شریف کی بارہویں تاریخ کو عام الفیل میں ہوئی۔(تاریخ طبری ج ۲ص ۱۲۵)

۲۔علامہ ابن خلدون جو علم تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں امام تسلیم کیے جاتے ہیں بلکہ فلسفہ تاریخ کے موجد بھی ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں! ''ولد رسول الله ﷺ عام الفیل لاثنتی عشرة لیلۃ خلت من ربیع الاول لاربعین سنۃ من ملک کسری انو شیروان ''۔رسول اللہ ﷺ کی ولادت عام الفیل کو ماہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی۔نوشیرواں کی حکومت کا چالیسواں سال تھا۔(تاریخ ابن خلدون ج ۲ص ۷۱۰)

۳۔عالم اسلام کے سب سے پہلے مشہور سیرت نگار امام محمد بن اسحاق (علامہ ابن ہشام/متوفی ۲۱۳ ہجری) اپنی 'سیرۃ النبوۃ' میں رقم طراز ہیں! ''ولد رسول الله ﷺ یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلۃ خلت من شهر ربیع الاول عام الفیل ''۔رسول کریم ﷺ سوموار بارہ ربیع الاول کو عام الفیل میں پیدا ہوئے۔(السیرۃ النبویہ ابن ہشام ج ۱ص ۱۷۱)

۴۔علامہ ابوالحسن بن محمد الماوردی ارشاد فرماتے ہیں! ''لانه ولد بعد خمسین یوماً من الفیل وبعد موت ابیه فی یوم الاثنین الثانی عشرة من شهر ربیع الاول ''۔واقعہ اصحاب فیل کے پچاس روز بعد اور آپ کے والد کے انتقال کے بعد حضور ﷺ بروز سوموار بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔(اعلام النبوۃ ص ۱۹۲)

۱۲ ربیع الاول بروز سوموار کو ولادت رسول ﷺ قرار دینے والوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیں:

۱)۔علامہ ابن جوزی: الوفا ابن جوزی ص ۹۰ (۲۔امام الحافظ ابو الفتح محمد بن محمد بن عبد اللہ شافعی: عیون الاثر ج ۱ص ۲۶ (۳۔محمد رضا امین، قاہرہ یونیورسٹی: محمد رسول اللہ ص ۱۹

۴)۔حافظ ابن کثیر: سیرت ابن کثیر ج ۱ص ۱۹۹ (۵۔امام حاکم: المستدرک ج ۲ص ۶۰۳

۶)۔ابن جوزی: بیان میلاد النبی ﷺ ص۳۱ (۷۔شیخ محمد ابو زہرہ: خاتم النبیین ج۱ ص۱۱۵
۸۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی: ماثبت من السنۃ ص۹۸ (۹۔علامہ ابن کثیر: البدایہ والنہایہ ج۲
ص۲۶۰ (۱۰۔ملا علی قاری: المورد الروی ص۹۶ (۱۱۔امام یوسف نبہانی: حجۃ اللہ علی العالمین
ج۱ ص۲۳۱ (۱۲۔امام قسطلانی: مواہب اللدنیہ ص۳۴ (۱۳۔نواب صدیق حسن خان بھوپالی
(غیر مقلد): الشمامۃ العنبریہ ص۷ (۱۴۔عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی: مختصر سیرت رسول
(۱۵۔مفتی محمد شفیع دیوبندی: سیرت خاتم الانبیاء ص۱۸ (۱۶۔علامہ یوسف نبہانی: انوار محمدیہ ص۱۸
(۱۷۔شیخ محمد الصبان: نور الابصار ص۹ (۱۸۔محمد رستم قاسمی: سیرت پاک ص۳۲
(۱۹۔محمد صادق سیالکوٹی (غیر مقلد): سید الکونین ص۵۹ (۲۰۔علامہ نور بخش توکلی: سیرت الرسول
عربی ص۳۳ (۲۱۔عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندی: تاریخ اسلام ص۳۵ (۲۲۔ملا معین کاشفی: معارج
النبوت ص۸۰ (۲۳۔امام زرقانی: زرقانی علی المواہب ج۱ ص۱۳۲ (۲۴۔محمد صادق ابراہیم
عرجون: محمد رسول اللہ ﷺ ج۱ ص۱۰۲ (۲۵۔پیر محمد کرم شاہ الازہری: ضیاء النبی ﷺ ج۲ ص۳۳

امام بخاری و امام مسلم علیہ الرضوان کے استاذ حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا کہ!

''عن عفان عن سعید بن میناء عن جابر و ابن عباس انھما قالا ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من شھر ربیع الاول''۔حضرت جابر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عام الفیل سوموار کے دن ۱۲ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔(مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ ضیاء النبی ج۲ ص۳۷، سیرت ابن کثیر ج۱ ص۱۹۹، بلوغ الامانی شرح فتح الربانی ج۲ ص۱۸۹ بیروت، البدایہ والنہایہ ج۲ ص۲۶۰ بیروت)

سند کا تعارف: پہلا راوی ابوبکر بن ابی شیبہ ہے۔انکے متعلق امام ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا۔محدث ابن حبان کہتے ہیں کہ ابوبکر عظیم حافظ حدیث تھے۔دوسرے راوی عفان ہیں۔انکے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ عفان ایک بلند پایہ امام ثقہ، صاحب ضبط و اتقان ہیں۔تیسرے راوی سعید بن مینا ہیں ان کا شمار بھی ثقہ راویوں میں ہوتا

ہے۔ (خلاصۃ التہذیب ص ۱۴۳، تقریب ص ۱۲۶)

چوتھے راوی دو صحابہ کرام ہیں اور ان کے ثقہ ہونے پر اجماع اُمت ہے۔ لہذا ان دو صحابہ کرام سے جب صحیح سند کے ساتھ ولادت کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول بروز سوموار ثابت ہے تو پھر کسی ماہر فلکیات کا قول کیا معنی رکھتا ہے۔ اور علماء کی کثیر تعداد نے ،مفسرین، سیرت نگاروں نے ۱۲ ربیع الاول ہی کو رسول اللہ ﷺ کی ولادت مانا ہے۔ دیوبندی حضرات کے لیے تو انکے علماء کی تحقیق ہی کافی ہے جو پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ غیر مقلدین حضرات کے لیے ان کے علماء کے اقوال کے ساتھ ساتھ صحیح سند کے ساتھ حدیث نقل کی جا چکی ہے۔ اگر یہ واقعی اہل حدیث ہیں تو یہ حدیث انکے لیے کافی ہونی چاہیے۔

جمہور علماء کا مسلک:

علاوہ ازیں جمہور علماء کا مسلک بھی یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول ہی ہے ملاحظہ فرمایئے: (السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۹۳، زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۱۳۲، الفتح الربانی ج ۲ ص ۱۸۹)

اہل مکہ و مدینہ کا معمول:

۱۲ ربیع الاول ہی کو حضور ﷺ کے مکان شریف پر حاضر ہو کر میلاد شریف کا قدیم اہل مکہ کا معمول رہا ہے۔ (زرقانی ج ۱ ص ۱۳۲، سیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۹۳، المورد الروی ص ۹۵، ماثبت من السنۃ ص ۹۸، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۴، تواریخ حبیب الہ وغیرہ)۔

اسی طرح ۱۲ ربیع الاول ہی کو اہل مدینہ اور دیگر شہروں کے مسلمانوں کا میلاد شریف منانے کا معمول رہا ہے ملاحظہ فرمایئے: (سیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۹۳، زرقانی علی المواہب ص ۱۳۲)

ان تمام حوالا جات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت مبارک ۱۲ ربیع الاول ہی ہے۔ غیر مقلدین اور علماء دیوبند کے اکابر بھی ۱۲ ربیع الاول کو ہی راجح قرار دیتے ہیں۔ غیر مقلدین کے پیشوا جناب نواب صدیق حسن خان بھوپالی کہتے ہیں: "ولادت شریف مکہ مکرمہ میں وقت طلوع فجر روز دوشنبہ دوازدھم ربیع الاول عام الفیل کو ہوئی۔ جمہور علماء کا یہی قول

ہے۔ ابن جوزی نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے۔ (الشمامۃ العنبریہ من مولد خیر البریہ ص ۷)
علماء دیوبند کے عالم مفتی محمد شفیع (کراچی) اپنی کتاب سیرت خاتم الانبیاء میں فرماتے ہیں!
"اس پر اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت ماہ ربیع الاول میں دوشنبہ کے دن ہوئی لیکن تاریخ کے تعین میں چار اقوال مشہور ہیں: دوسری، آٹھویں، دسویں، بارھویں مشہور قول بارھویں تاریخ کا ہے۔ یہاں تک کہ ابن الجزاز نے اس پر اجماع نقل کر دیا اور اسی کو کامل ابن اثیر میں اختیار کیا گیا۔ (سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۰۱ بر حاشیہ)۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی بھی ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ کے متعلق فرماتے ہیں جمہور اہل علم میں یہ تاریخ مشہور ہے (سیرت سرور عالم ص ۹۳، ۹۴)
۱۲ ربیع الاول تاریخ ولادت پر محدثین کا اجماع: امام زرقانی، ابن کثیر، امام ابن جوزی، علامہ قسطلانی، علامہ جمال حسینی، ملا علی قاری، امام ابن سید الناس، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شیخ ابو زہرہ مصری، امام طیبی، علامہ ابن اثیر، علامہ طبری، علامہ جامی، امام بیہقی، ملا معین کاشفی مصری وغیرہم نے ۱۲ کے قول کو صحیح راجح اور معمول بہا کہا ہے اور قول پر اجماع و اتفاق نقل کیا ہے!" وھذا ھو المشھور عند الجمھور ولا علی الصحیح بمکۃ عند طلوع الفجر یوم الاثنین لاثنی عشر ،وھو الذی علیہ العمل وبالغ ابن الجوزی وابن الجزاز فنقلافیہ الاجماع "۔ اور یہ جمہور کے مشہور اور صحیح تاریخ ولادت مکہ میں طلوع فجر کے وقت بروز سوموار ۱۲ ربیع الاول ہے اسی پر سب کا عمل ہے اور ابن جوزی و ابن الجزاز نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹، زرقانی شرح مواہب ج ۱ ص ۱۳۲، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۴، میلاد النبوی جوزی ص ۴۰، عیون الاثر ج ۱ ص ۲۷، معارج النبوت ج ۱ ص ۸۵، خاتم النبیین ص ۱۱۵، تاریخ طبری، دلائل النبوت للبیہقی ج ۱ ص ۸۳، ماثبت من السنہ ص ۹۸)
تاریخ وصال کی تحقیق: عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ ۱۲ ربیع الاول ہی کو حضور ﷺ کا وصال ہوا۔ اور دور حاضر میں بھی کچھ لوگ یہی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ اس ضمن میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے جو کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ

عنہ سے منسوب ہے کہ آپ ﷺ کا وصال ربیع الاول کو ہوا۔ (البدایہ والنھایہ:۲۵۶)

جواب: اس روایت سے متعلق یہ عرض ہے کہ اس کی سند میں محمد بن عمر الواقدی ایک راوی ہے جس کے متعلق امام اسحاق بن راہویہ، امام علی بن مدینی، امام ابوحاتم، امام نسائی نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ واقدی اپنی طرف سے حدیثیں گھڑ لیتا تھا۔ امام یحییٰ بن معین نے کہا کہ واقدی ثقہ نہیں، یعنی قابل اعتبار نہیں۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا! واقدی کذاب ہے، حدیثوں میں تبدیلی کر دیتا تھا۔ امام بخاری اور امام ابوحاتم رازی نے کہا کہ واقدی متروک ہے۔ مرہ نے کہا کہ واقدی کی حدیث نہ لکھی جائے۔ ابن عدی نے کہا واقدی کی حدیثیں تحریف سے محفوظ نہیں۔ ذہبی نے کہا واقدی کے سخت ضعیف ہونے پر ائمہ جرح التعدیل کا اجماع ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۲۵)

لہذا بارہ ربیع الاول کو وفات بتانے والی روایت ساقط ہے اس لیے قابل قبول نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کسی بھی طریقہ سے ۱۲ ربیع الاول کو ثابت نہیں ہوتی۔ تمام امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال مبارک سوموار کو ہوا۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۹۳، روایت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اگر سوموار والے دن ۱۲ ربیع الاول بن جاتی ہے پھر تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۲ تاریخ سوموار کے دن کسی صورت نہیں بنتی کیونکہ حضور ﷺ نے حج فرض ہونے کے بعد زندگی میں ایک ہی حج ادا فرمایا۔ جس کو حجۃ الوداع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حج ۹ ذوالحجہ یوم عرفہ جمعۃ المبارک کو پڑھا گیا۔ جیسا کہ مسلم شریف ج ۲ ص ۳۲۰ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ لہذا ۹ ذوالحجہ بروز جمعۃ المبارک ۱۰ ھجری سے ۱۱ ھجری کے ربیع الاول تک کل تین مہینے ہیں۔ اور ۱۱ ھجری کے ربیع الاول میں سوموار والے دن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا۔ تو اگر ۹ ذوالحجہ بروز جمعہ سے گن کر ربیع الاول تک لایا جائے اور تینوں مہینوں کے چاند چاہے انتیس رکھے جائیں یا تیس یا جس طرح کوئی چاہے مگر سوموار والے دن کسی صورت ۱۲ تاریخ نہیں بنتی۔ اکابرین علماء دیوبند بھی اس بات پر متفق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں "بارہویں جو مشہور ہے وہ حساب درست نہیں ہوتا

کیونکہ اس سال ذوالحجہ کی نویں جمعہ کو تھی اور وفات دوشنبہ ثابت ہے پس جمعہ کو نویں ذوالحجہ ہو کر بارہ ربیع الاول دوشنبہ کو کسی طرح نہیں ہو سکتی''۔ (نشر الطیب ص ۲۴۱ حاشیہ)

اسی قانون کے تحت مولانا زکریا سہارنپوری فرماتے ہیں!''۱۲ ربیع الاول وفات کی تاریخ کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بعض محدثین نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا وصال دو ربیع الاول کو ہوا بلفظہ (خصائل نبوی شرح اردو شمائل ترمذی ص ۲۸۱ مطبوعہ لاہور)

مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں!''بالجملہ بودن دوازدھم ربیع الاول بروز دوشنبہ بوجہ من الوجوہ صحیح نمی تواند شدہ''۔ بارہ ربیع الاول بروز دوشنبہ وفات کئی وجوہ کی وجہ سے صحیح نہیں۔ (مجموعہ فتاوی عبدالحی لکھنوی ج ا ص ۳۵۲)

مفتی رشید احمد صاحب ''ضرب مومن'' ج ۵ شمارہ نمبر ۲۳، ۱۵ تا ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ مطابق ۸ تا ۱۴ جون ۲۰۰۱ء میں لکھتے ہیں!''اس میں صرف ۳ مہینے کا حساب ہے اور بالکل بدیہی ہے جسے عامی سا شخص بھی آسانی سے نکال لے۔ ذوالحجہ کی نویں تاریخ جمعہ کو تھی۔ اسکے بعد آپ ﷺ کی وفات تک صرف ۳ چاند بنتے ہیں۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ان کا حساب ان پڑھ سے ان پڑھ بھی نکال سکتا ہے۔ تینوں چاند ۲۹ کے لگالیں تو پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول نہیں بنتی۔ دو انتیس کے لگائیں ایک تیس کا تو نہیں بنتی''۔

مولانا محمد حسین نیلوی دیوبندی (سرگودھا) نے بھی ۱۲ ربیع الاول کو وفات تسلیم نہیں کیا۔ دیکھئے: (ندائے حق ج ۱)۔

ان تمام اکابرین علماء دیوبند سے تو ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن نہیں بنی تو نئے آنے والے متاخرین نے کیسے بنالی؟۔ اسی قانون اور قاعدہ کو مختلف محدثین نے پیش فرمایا جس کے تحت بارہ ربیع الاول کو وفات نہیں بنتی اور یہی حقیقت ہے۔ ہاں اگر کوئی پیر والے دن ۱۲ ربیع الاول کو وفات ثابت کر دکھائے تو ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے دن کو رات ثابت کرنا۔

۱) اگر تینوں مہینے تیس کے مانے جائیں تو: ۵ ذوالحجہ کو سوموار بنتا ہے، پھر ۳ محرم کو سوموار بنتا ہے، پھر یکم صفر کو پیر بنتا ہے اور ۶ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۱۳ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔

۲) اگر تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں تو: ۵ ذوالحجہ کو پیر بنتا ہے، ۴ محرم کو پیر بنتا ہے، ۳ صفر کو پیر بنتا ہے، ۲ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۹ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔

۳) ۲ مہینے ۲۹ کے اور ایک ۳۰ کا ہو تو: ۵ ذوالحجہ کو پیر بنتا ہے، ۴ محرم الحرام کو پیر بنتا ہے اور ۳ صفر کو پیر بنتا ہے، یکم ربیع الاول کو پیر بنتا ہے، ۸ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۱۵ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔

۴) ۲ مہینے ۳۰ دن کے ایک مہینہ ۲۹ دن کا ہو تو: ۵ ذوالحجہ کو پیر بنتا ہے، ۳ محرم الحرام کو پیر بنتا ہے، یکم صفر کو پیر بنتا ہے، ۷ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے اور ۱۴ ربیع الاول کو پیر بنتا ہے۔ مگر ۱۲ ربیع الاول کو کسی صورت پیر نہیں بنتا۔ تو معلوم ہوا کہ ۱۲ ربیع الاول کو وفات النبی ﷺ کہنا درست نہیں۔

مذکورہ قانون اور محدثین: اس قانون کے تحت محدثین و مؤرخین نے ۱۲ ربیع الاول کو حضور ﷺ کی وفات تسلیم نہیں کی ہے۔ ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱) حضرت العلام الامام السہیلی متوفی ۵۸۱ ھ نے یہ ہی قانون اپنی مشہور زمانہ کتاب ''الروض الانف'' ج ۲ ص ۳۷۲ مطبوعہ ملتان میں پیش فرمایا ہے۔

۲) اسی طرح حضرت علامہ امام نور الدین علی بن احمد السمہودی متوفی ۹۱۱ ھ نے اپنی کتاب ''وفاء الوفاء'' ج ۱ ص ۳۱۸ میں بیان فرمایا۔

۳) یہ قانون حضرت علامہ امام شمس الدین الذہبی نے ''جز السیرۃ النبویہ'' ص ۳۹۹، ۴۰۰ میں پیش کیا ہے۔

۴) امام ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۰۶ طبع بیروت میں لکھا ہے۔

۵) امام علی بن برہان الدین الحلبی نے ''سیرت حلبیہ'' ج ۳ ص ۳۴۷ میں لکھا ہے۔

۶) یہی قانون امام یافعی نے اپنی کتاب ''مراۃ الجنان'' میں لکھا ہے۔

۷) یہ ہی قانون امام ابن رجب حنبلی دمشقی نے اپنی کتاب لطائف المعارف میں نقل کیا اور فرمایا! ''کذالک لم یصح ان یکون یوم الاثنین ثانی عشر ربیع الاول''۔ (بحوالہ فتاوی عبدالحی ج ۱ ص ۳۰۱)

۸) اسی قانون کو امام عبد اللہ محمد الزرندی المدنی نے اپنی کتاب ''اعلام بسیرۃ النبی علیہ السلام'' میں نقل فرمایا ہے۔ لہذا محدثین و مورخین کے نزدیک ۱۲ ربیع الاول رسول اللہ ﷺ کی وفات کا دن نہیں ہے۔

دیوبندی مکتبہ فکر کے سرکردہ عالم مفتی رشید احمد صاحب لکھتے ہیں! '' تو ربیع الاول کی ابتداء میں پیر کے دن جو تاریخیں صحیح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے اکثر نے ۲ ربیع الاول کو اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کتب تاریخ میں دراصل یوں لکھا تھا۔ **ثانی شھر ربیع الاول**: شہر مہینے کو کہتے ہیں یعنی ربیع الاول کی دو تاریخ۔ مگر بعد میں کسی ناقل سے لکھنے یا پڑھنے میں غلطی ہو گئی۔ اس نے اسکو اس طرح پڑھ لیا ''ثانی عشر ربیع الاول'' ثانی عشر کہتے ہیں ۱۲ کو۔ اصل لفظ ''شہر'' تھا اسے عشر پڑھ لیا گیا۔ اور اس طرح ۲ کا ۱۲ بن گیا۔ اور یہ غلط بات پھیل گئی۔ بعض نے اختلاف مطالع کی تاویل کی ہے جو کہ باطل ہے۔ (ضرب مومن ۱۵ تا ۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۲ ہجری بمطابق ۸ تا ۱۴ جون ۲۰۰۱ء)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ۱۲ ربیع الاول حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کا دن نہیں بلکہ ۲ ربیع الاول کا دن ہے۔ اور ہم نے بھرپور دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ۱۲ کو وفات نہیں بلکہ ۲ ربیع الاول کو وفات ہے کیونکہ ۱۲ کو سوموار کا دن نہیں بنتا۔ سوموار کو حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ثابت ہے اور سوموار کو ۱۲ نہیں بلکہ ۲ ربیع الاول بنتا ہے۔ اللہ کریم حق بات تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!!

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

مدینے سے میدان کربلا تک

امام حسین رضی اللہ عنہ کی سواری

ابواُسامہ ظفر القادری بکھروی

جب بھی محرم الحرام کا مہینہ آتا ہے ماتمی جلوسوں میں ''ذوالجناح'' کا وجود ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں شامل گھوڑے کو ''شعائر اللہ'' کا درجہ دیدیا جاتا ہے۔ جو کہ تحقیقاً بے اصل ہے۔ عام واعظین اور ذاکرین اس کا تذکرہ بڑے مقدس انداز میں کرتے ہیں اور کربلا کے واقع کو بیان کرتے ہوئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے بارے میں مختلف ڈرامائی حکایات بیان کی جاتی ہیں جو کہ یقیناً اُن نفوس قدسیہ کے شایان شان ہرگز نہیں۔ اگر ہم بالغ نظری سے کتب شیعہ کا مطالعہ کریں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سید الشہداء جناب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اس سفر کے دوران اُونٹنی پر سوار تھے۔ آیئے ان کتب کے مختلف اوراق کی ورق گردانی کرتے ہیں:

۱) مدینہ سے آغاز سفر اونٹنی پر اور کربلا میں اونٹنی: ''ثم ان محمد ابن حنفیہ سمع ان اخاہ الحسین یرید العراق فبکی بکاء شدیدا ثم قال لہ ان اھل الکوفۃ قد عرفت غدرھم بابیک واخیک فان قبلت قولی اقم بمکۃ فقال یا اخی انی اخشی ان تقاتلنی جنود بنی امیہ فی مکۃ فاکون کالذی یستباح دمہ فی حرم اللہ ثم قال یا اخی فسر الی یمن فانک امنع الناس بہ فقال الحسین علیہ السلام یا اخی سا نظر فیما قلت فلما کان وقت السحر عزم علی المسیر الی العراق فاخذ محمد ابن الحنفیۃ زمام ناقتہ وقال یا اخی ماسبب ذالک انک عجلت''۔ (ذبح عظیم ص۱۶۵ متجر کتب خانہ اثنا عشری لاہور) ترجمہ: جب محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے سنا کہ ہمارے بھائی جناب امام حسین رضی اللہ عنہ ملک عراق کی طرف تشریف لے جانے کا قصد رکھتے ہیں تو آپ زار وقطار روئے۔ پس آپ نے عرض کی اے بھائی آپ اہل کوفہ کے غدر کو اپنے پدر بزرگوار اور برادر عالی مقام کے ساتھ خوب جانتے ہیں۔ پس

اگر میری عرض پذیر فرمائیں تو مکہ میں قیام فرمائیں۔ جناب امام حسین نے فرمایا کہ مجھ کو خوف ہے کہ لشکر بنو امیہ مجھ کو مکہ میں قتل نہ کر ڈالے اور کہیں میں وہ شخص نہ ہوں کہ جس کا خون بہانا حرم محترم میں مباح ہو۔ محمد ابن حنفیہ نے کہا کہ آپ یمن کی طرف تشریف لے جائیں کہ وہاں کے لوگ مخالفوں کو آپ تک نہ آنے دیں گے۔ امام عالی مقام نے فرمایا کہ اے برادر عزیز اگر میں پتھر میں بھی سما جاؤں تاہم یہ بے دین مجھ کو وہاں سے نکال لیں گے اور مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ پھر امام حسین علیہ السلام نے فرمایا! اے بھائی جو تم نے کہا ہے میں اس میں غور کروں گا۔ مگر جب صبح ہوئی تو حضرت نے سفر عراق کا قصد مصمم فرما لیا۔ یہ خبر پا کر محمد بن حنفیہ آئے اور انھوں نے آپ کے ناقہ (اونٹنی) کی مہار پکڑ لی۔

معلوم ہوا کہ آپ مدینے سے روانہ ہونے لگے تو اونٹنی پر سوار تھے۔

۲) امام حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں اونٹنی پر: ''فقال علیہ السلام ھذہ کربلا موضع کرب و بلاء ھذا مناخ رکابنا و محط رحالنا و مقتل رجالنا '' (کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمۃ ۲/ ۴۷ مطبوعہ تبریز طبع جدید، مناقب ابن شہر آشوب ۴/ ۹۷ مطبوعہ قم طبع جدید)

ترجمہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہی کربلا ہے اور یہی تکلیف وامتحان کا مقام ہے۔ ہمارے اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ، ہمارے کجاوے اتارنے کا مقام اور نوجوانوں کی شہادت گاہ ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کربلا میں اونٹوں پر سوار تھے۔

۳) ''قال الحسین و ما اسم ھذا المکان؟ قالوا لہ کربلاء قال ذات کرب و بلاء ولقد مرابی بھذا المکان عند مسیرہ الی صفین وانا معہ فوقف فسأل عنہ فاخبر باسمہ فقال ھھنا محط رکابھم و ھھنا مھراق دمائھم ''۔ (الاخبار الطوال ص ۲۵۳ مطبوعہ بیروت طبع جدید) ترجمہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اس جگہ کے بارے میں دریافت فرمایا۔ لوگوں نے عرض کی یہ کربلا ہے۔ فرمایا تکلیف وامتحان والی جگہ۔ میرے والد گرامی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) جنگ صفین کی طرف جاتے ہوئے اس جگہ سے گزرے۔ میں بھی آپکے ساتھ تھا۔ تو کچھ دیر ٹھہر گئے۔ اس جگہ کے بارے میں لوگوں سے پوچھا۔ آپکو اس کا نام بتایا گیا تو فرمایا یہ جگہ ان کے اونٹوں کے بٹھانے کی ہے

اور یہ جگہ ان کے خون سے لت پت ہوگی۔

فائدہ: (۱) ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ اُونٹوں پر سوار تھے۔

۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علم لدنی سے یہ معاملہ ملاحظہ فرمایا اور بیان کیا۔

۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا اس کو من وعن ذکر کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ کربلا میں آپ گھوڑے پر سوار نہ تھے بلکہ اونٹنی پر سوار تھے۔

۴) اہل تشیع کے مستند و معتبر مؤرخ اور تاریخ کربلا کے پہلے مصنف کا بیان: "فقال الحسین واللہ لا اعطی بیدی اعطاء الذلیل ولا افر فرار العبید ثم تلا انی عذت بربی وربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب ثم اناخ راحلتہ وامر عقبۃ بن سمعان ان یعقلہا بفاضل زمامہا"۔ (مقتل ابی مخنف ص ۵۵ مطبوعہ حیدریہ نجف اشرف طبع قدیم) ترجمہ: امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم! میں ذلیل آدمی کی طرح اپنا ہاتھ (کسی کی بیعت میں) نہ دونگا اور میں غلاموں کی طرح راہ فرار اختیار کروں گا۔ اور یہ کہہ کر آپ نے قرآنی آیت پڑھی: "میں ہر متکبر سے تمہارے اور اپنے رب کی پناہ چاہتا ہوں، جو متکبر قیامت کا منکر ہے"۔ پھر امام حسین نے اپنی سواری بٹھائی۔ اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اس (اُونٹنی) کے پاؤں باندھ دے۔ تو اس نے بچی ہوئی نکیل کی رسی سے اُسے باندھ دیا۔

فائدہ: سواری صرف اونٹ کی بٹھائی جاتی ہے نہ کہ گھوڑے کی، اور پاؤں بھی اُونٹ کے باندھے جاتے ہیں نہ کہ گھوڑے کے۔ معلوم ہوا کہ اہل تشیع کے مستند مؤرخ نے بھی تسلیم کیا کہ امام حسین اُونٹنی پر سوار تھے۔

رِکَابٌ کا معنی: ۱) المنجد ص ۳۰۳ مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی میں ہے: رِکَابٌ۔ سواری کے اونٹ

۲) لسان العرب ۱/۳۳۰ مطبوعہ بیروت میں ہے: والرکاب. الابل التی یسار علیہا واحدتہا راحلۃ ولا واحدلہا من لفظہا. واجمعہا رکب بضمّ الکاف مثل کتب۔

ترجمہ: رکاب وہ اونٹ ہیں جن پر سفر کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا واحد راحلۃ ہے اور لفظ رکاب سے لفظی طور

پر اس کا واحد نہیں۔ اس کی جمع رکب بروزن کتب ہے۔

رِحَالٌ کا معنی: (۱) المنجد صفحہ ۳۵۷ طبع فرید بک ڈپو دہلی انڈیا میں ہے:

الرحال: کجاوہ بنانے والا۔ بہت سفر کرنے والا۔

الرحل۔ کجاوہ۔ پالان۔ الراحلة سواری کے لائق اونٹ۔

۲) لسان العرب ۴/۱ ۲۷ مطبوعہ بیروت میں ہے:

الرحل: مرکب للبعیر والناقة وجمعهٔ ارحل ورحال ۔ ترجمہ: رَحْلٌ۔ اونٹ اور اونٹنی پر بیٹھنے اور سفر کرنے کے لیے بنائے گئے کجاوے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَرْحُلٌ اور رِحَالٌ آتی ہے۔

مقتل ابی مخنف کا بیان: فلما نظر الطرماح اخذ بزمام ناقة الحسین وانشاء یقول.

یاقتی لا تجزعی من زجری　　وشمری قبل طلوع الفجر

بخیر رکبان وخیر سفر　　حتیٰ تحلی بکثیر الفخر

(مقتل ابی مخنف صفحہ ۳۵۔ ۳۶ مطبوعہ نجف اشرف طبع قدیم)

ترجمہ: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جب میدان کربلا میں تشریف لے آئے تو حُر آپکی نگرانی کرتے ہوئے آپکے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ایک اور محب "طرماح" نے جب امام موصوف کو آتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھا اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی اُونٹنی کی لگام ہاتھ میں تھامے معذرت کرتے ہوئے چند اشعار کہے۔

ترجمہ: اے میری اُونٹنی! میری ڈانٹ ڈپٹ سے پریشان نہ ہونا اور طلوع فجر سے قبل بہترین سوار کو لے کر بہترین سفر پر روانہ ہو جا یہاں تک کہ تو بہت بڑے فخر سے مزین ہو جائے۔

۶) اس واقعہ کو محمد بن علی ابن شہر آشوب نے بھی بیان کیا ہے لکھتے ہیں!

یا ناقتی لا تجزعی من زجری　　وامض بنا قبل طلوع الفجر

بخیر فتیان وخیر سفر　　آل رسول اللہ اهل الخیر

(مناقب ابن شہر آشوب ۴/۹۵ مطبوعہ قم طبع جدید)

ترجمہ: اے میری اُونٹنی! میری ڈانٹ ڈپٹ سے پریشان نہ ہونا۔ ہمیں بہترین سواروں کے ساتھ طلوعِ فجر سے قبل یہاں سے بہترین سفر کی طرف لے چل۔ وہ بہترین سوار اللہ کے رسول کی آل ہیں۔ جو صاحبِ خیر ہیں۔

۷) تاریخ روضۃ الصفاء میں ہے:

''امام حسین فرمود۔ مرگ نزدمن آسان تراست از ملاقات یا ابن زیاد۔ بعد از اں فرمود تا شتراں بار کردند و مردم خود را سوار ساختہ روئے بجانب حجاز جہاد''۔ (تاریخ روضۃ الصفاء ۳/۷۹ ۵ مطبوعہ لکھنؤ) ترجمہ: جب حُر نے امام عالی مقام کو ''ابن زیاد'' کے پاس چلنے کا مشورہ دیا تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا! میرے لیے ابن زیاد کے ساتھ ملاقات کرنے کی نسبت جام شہادت نوش کر لینا آسان ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا: ساتھیوں! سامان اُونٹوں پر لادو۔ اور اپنے ساتھیوں کو سوار کر کے حجاز کی طرف روانہ ہو چلو۔

تفسیر لوامع التنزیل میں ہے:

''جاء الشمر فی قبیلة عظمة یقاتله ثم حال بینه وبین رحله''۔ (تفسیر لوامع التنزیل ۱۳/۹۱) ترجمہ: شمر ایک بہت بڑی جماعت لے کر جنگ کیلیے آیا اور نواسہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپکی اُونٹنی کے درمیان حائل ہو گیا۔

ان سطور میں اہلِ تشیع کی مستند کتب کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ امام حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے روانہ ہوئے تو ان کے پاس اُونٹنی تھی۔ راستے میں بھی اُونٹنی پر سوار تھے۔ کربلا میں پہنچے تو اُونٹنی پر سوار تھے۔ اُترے تو اُونٹنی سے اُترے۔ شمر نے روکا تو اُونٹنی پر سوار تھے۔ تو گھوڑا کہاں سے آ گیا؟۔۔۔۔ یقیناً ''ذوالجناح'' کے تصور کو عام کرنے کیلیے اس جھوٹ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عزوجل سمجھ عطا فرمائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔!

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

یا ایھا الناس قد جاءکم برھان من ربکم

ربیع الثانی، جمادی الاول
جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ
اپریل تا جون ۲۰۱۲ء

قرآنی آیات و رکوعات میں اعداد کی اختلاف
ایک تحقیقی مضمون مدیر اعلیٰ کے قلم سے

C-295 میں ترمیم کیوں؟
قانون توہین رسالت میں میڈیا کے شبہات کا ازالہ

کچھ علم حدیث کے بارے میں
شائقین علم حدیث کے لئے معلوماتی تحریر

تہذیب جدید کے گمراہ کن مغالطے

اسلام اور رسک مینجمنٹ

قبر سے حصول فیض

غوث پاک کی گیارہویں
شیخ الحدیث والتفسیر علامہ پیر غلام رسول قاسمی کے لاجواب دلائل اور مخالفین کو دعوت فکر

تذکرہ مولانا پیر محمد اشرف نقشبندی علیہ الرحمہ

منحة الحي في كشف ظلمات زبير علي زئي
حافظ زبیر علی زئی کے اعتراضات کا خوبصورت رد
فیصل خان کے قلم سے

قادیانیت انگریزی استعمار کی ضرورت اور پیداوار

التحقیقات الاسلامیہ فاؤنڈیشن

کتابی سلسلہ

افکار حق کا ترجمان

واہ کینٹ

مجلہ البرہان الحق

شمارہ 2

مدیر

سید بادشاہ تبسم بخاری ایم۔اے

0300-5097394

مجلس مشاورت

علامہ پیر سید غلام مصطفیٰ شاہ

صاحبزادہ حافظ محمود احمد دریادی

علامہ مفتی محمد عبدالسلام قادری

علامہ مفتی محمد ضیاء الرحمٰن قادری

علامہ مفتی کامران مسعود رضوی

مجلس ادارت

مفتی رضاء المصطفیٰ ظریف القادری (گوجرانوالہ)

علامہ پیر غلام رسول قاسمی نقشبندی (سرگودھا)

علامہ مفتی حافظ سردار علی خان (واہ کینٹ)

سید صابر حسین شاہ بخاری (اٹک)

علامہ مفتی سید صابر حسین (کراچی)

محمد سعید مجاہد آبادی (لاہور)	حاجی محمد سعید (ہری پور)
مولانا حافظ ظہور الحق (راولپنڈی)	محمد ظفر (ویسٹ یونیورسٹی اسلام آباد)
قاری محمود الحسن (گوجر خان)	مولانا حافظ طاہر محمود (UET ٹیکسلا)
حافظ محمد طارق قمر (اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)	مولانا آصف محمود اعوانی (رواٹ)

نوٹ: نفس مضمون کی تمام تر ذمہ داری مضمون نگار پر ہوگی

Email:alburhanwah@gmail.com

Email:zaf.wah786@gmail.com

مکتبہ فیضان سنت دکان نمبر 28 میلاد چوک واہ کینٹ

0343-5942217

0302-5122663

فہرست

اداریہ

صدائے دل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

''البرُھان سے البرُھان الحق تک''

معزز قارئین! جب ہم نے ایک مجلّہ کے اجرا کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے مختلف اہل علم و دانش سے مشاورت اور غور وخوض کے بعد اسکا نام ''البرُھان'' رکھنے پر اتفاق کیا۔ جو کہ قرآن مجید کی آیت ''قد جاء کم برھان من ربکم'' سے ماخوذ ہے۔ دیگر شہروں کے ساتھ ساتھ لاہور کے دوستوں سے بھی اس حوالے سے ہم رابطے میں تھے۔ ہمیں کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس نام سے پہلے ہی لاہور سے ایک مجلّہ ایک دوسرے مکتبہ فکر کے لوگوں کی طرف سے شائع ہو رہا ہے اور نہ ہی ہمارے علم میں یہ بات تھی۔ جب ہمارا مجلّہ ''البرُھان'' کا پہلا شمارہ چھپ کر تقسیم ہو رہا تھا کہ جنوری کے آخر میں محترم جناب ڈاکٹر نور احمد شاہتاز صاحب مؤسس مجلّہ ماہنامہ ''فقہ اسلامی'' کراچی سے واہ کینٹ تشریف لائے تو میں نے انہیں مجلّہ البرُھان پیش کیا۔ دیکھنے پر جہاں انہوں نے خوشی کا اظہار کیا، پسند بھی فرمایا اور اس حوالے سے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا وہاں ہی یہ بھی بتایا کہ اس نام سے پہلے ہی لاہور سے ایک مجلّہ چھپ رہا ہے۔ لہذا آپ یا تو نام تبدیل کریں یا اس کے ساتھ کسی لفظ کا اضافہ کریں تا کہ فرق واضح ہو جائے۔ انہوں نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے کراچی واپس جا کر اس مجلّے کی ایک کاپی بھی روانہ فرما دی۔ ادھر لاہور سے محترم جناب محمد سعید مجاہد آبادی نے بھی مذکورہ مجلّہ کا ایک شمارہ بھیج دیا۔ چونکہ لاہور سے شائع ہونے والا مجلّہ ''البرھان'' رجسٹرڈ ہے۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہو گیا کہ ہم اپنے مجلّہ کا نام اس سے منفرد کرنے کے لیے اس کے ساتھ کسی لفظ کا اضافہ کریں۔ چنانچہ باہمی مشاورت سے

ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم آئندہ ''البرھان الحق'' کے نام سے اپنا کام جاری رکھیں گے۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

راقم مجلہ ''البرھان'' کا پہلا شمارہ حضرت علامہ پیر عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے جامعہ رضویہ انوار العلوم واہ کینٹ حاضر ہوا تو اس وقت قبلہ پیر صاحب کے پاس ایک بزرگ چند احباب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ رخصت ہو گئے تو پیر عبدالقادر صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ صاحب سرحد کی فلاں گدی کے سجادہ نشین ہیں۔ بے چارے حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا علاقہ چھوڑ آئے ہیں۔ اس پر مجھے بھی بڑا افسوس ہوا اور اپنے دکھ کا اظہار بھی کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اس کے ذمہ دار بھی تو یہی حضرات ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں کما حقہ دینی کام نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تقریباً سارا سرحد بدمذہبوں کے شکنجے میں آ چکا ہے۔ ان بدمذہبوں نے ان حضرات کو اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کا اصول یہی ہے کہ

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

حضرت اقبال بھی یہی فرما گئے ہیں کہ ؏

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اب بھی اگر ہم بیدار نہ ہوئے اور خواب خرگوش کے مزے لیتے رہے تو اس ''کینسر'' سے ہم بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ خدارا ہوش کیجئے۔ خود بیدار ہو کر عوام اہل سنت کو بھی بیدار کیجئے۔ حالات کا تجزیہ کیجئے مضمرات و مفادات پر نگاہ رکھئے۔ اپنی قوت کو مجتمع کیجئے اور آگے بڑھیے ورنہ ؏

تمہاری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں

اللہ کا شکر ہے کہ حکومت پاکستان نے جہاد کے نام پر مسلح تنظیموں کو غیر مسلح کرنا شروع کر دیا

ہے بصورت دیگر یہ اہل سنت پر یلغار کے لیے پوری منصوبہ بندی کر چکی تھیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

جب مجلہ ''البرھان'' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کو اس قدر پزیرائی ملے گی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر تمام کاپیاں تقسیم ہو گئیں اور ہر طرف سے مزید کاپیاں بھیجنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ کئی اہم علمی دوست اس سے محروم رہ گئے اور ہم پوری کوشش کے باوجود بھی ان کو ایک کاپی پیش نہ کر سکے۔ لہذا ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کوئی کام پوری لگن اور محنت سے کیا جائے تو انسان کو مایوسی نہیں ہوتی بلکہ کامیابی قدم چومتی ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس دفعہ ہم تعداد اشاعت میں اضافہ کر رہے ہیں اُمید ہے کہ حسب سابق علمائے کرام ،مشائخ عظام اور معزز قارئین اس کو پزیرائی بخشیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ آمین!۔

علامہ مفتی محمد عابد جلالی پر قاتلانہ حملہ

فروری **2011**ء کے وسط میں گوجرانوالہ میں بعض شرپسند عناصر نے ممتاز عالم دین حضرت علامہ مولانا مفتی محمد عابد جلالی پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس حملے میں آپ بال بال بچ گئے۔ ہم اس بزدلانہ حرکت کی بھرپور مذمت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ناپاک عزائم رکھنے والے فسادیوں سے تمام علماء اہل سنت کو محفوظ ومامون فرمائے۔

نوٹ: صفحات کے بالائی حصہ پر نمبر شمار کا تعلق موجودہ شمارہ سے ہے جبکہ زیریں حصہ پر موجود نمبر شمار کا تعلق جلد سے ہے۔

افضل شاہد اعوان (مدیر اعلیٰ اعزازی)

افضل شاہد اعوان (مدیر اعلیٰ امرازی) ☆

قرآنی آیات ورکوعات میں اعدادی اختلاف

> یہ مضمون پہلی بار روزنامہ پاکستان اسلام آباد میں ۲۱ فروری ۱۹۹۵ء کو شائع ہوا تھا۔ بعد میں ماہنامہ ''کنز الایمان'' لاہور بابت جولائی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ماہنامہ ''مشعل ہدایت'' لاہور میں جنوری تا جون ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں شامل اشاعت ہوا۔ اب مزید اضافوں کے ساتھ قدرے تفصیل سے پھر ہدیہ قارئین ہے۔ (مضمون نگار)

بعض اوقات کچھ غلط باتیں اتنی مشہور ہو جاتی ہیں کہ عوام تو عوام خواص بھی انہیں صحیح سمجھنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتحال قرآنی آیات ورکوعات کی تعداد کے سلسلے میں سامنے آئی ہے۔ جب کسی سے پوچھا جاتا ہے کہ قرآنی آیات اور رکوعات کی تعداد کتنی ہے تو وہ فوراً کہتا ہے کہ آیات کی تعداد 6666 ہیں اور رکوع 540 ہیں۔ اسی طرح قرآن سے متعلق کتب میں عموماً یہی تعداد لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک ہر کلاس کے نصاب میں بھی یہی تعداد لکھی ہوئی ہے حتیٰ کہ ریڈیو، ٹی وی کے معلوماتی اور مقابلے کے پروگراموں میں بھی یہی تعداد بتائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ کئی جید علمائے کرام اور صاحبان علم و دانش نے بھی اپنی کتب میں یہی تعداد درج کی ہے۔

چنانچہ مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب نے لکھا ہے کہ ا ''کوفیوں کے نزدیک جن کی قرأت اس دیار ہند میں مروج ہے مشہور قول کے مطابق قرآن مجید کی آیات کی تعداد 6666 ہے''۔ [1]

پروفیسر عبد الصمد صارم الازھری نے لکھا ہے کہ ! ''قرآن مجید میں کل 6666 آیتیں ہیں''۔ [2]

☆) 0300-9129852

۱) آداب حاملین قرآن حاشیہ ص ۱۹   (۲) تاریخ القرآن ص ۱۵۴

سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں آیات کی تعداد 6666 ہی لکھی ہے۔اسی طرح سیارہ ڈائجسٹ لاہور اور ماہنامہ ''ندائے اہل سنت'' لاہور کے قرآن نمبروں میں بھی یہی تعداد درج کی گئی ہے۔غرضیکہ ہم آج تک یہی سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اس ضمن میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو وزارت مذہبی امور نے اخبارات کو ایک پریس ریلیز جاری کیا تھا جس میں جملہ ناشرین قرآن کریم صوبائی محکمہ ہائے اوقاف اور تعلیمی و تدریسی اداروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ حکومت پاکستان کے جاری کردہ نسخہ قرآن مجید مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے مطابق آیات کی تعداد 6236 ہے لہذا اسے ہی صحیح تصور کریں اور سرکاری و غیر سرکاری دستاویز میں اسی تعداد کو بطور حوالہ درج کریں۔میں یہ پڑھ کر ششدر رہ گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ 430 آیات کا فرق ہو جو کہ معمولی نہیں ہے۔چنانچہ یہ صورتحال کئی حضرات کے سامنے رکھی لیکن کوئی بھی ماننے کیلئے تیار نہ تھا اور حکومت کے اس اعلان کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔آخر میں نے سوچا کہ کیوں نہ خود آیات شمار کر کے دیکھ لوں تاکہ غلط فہمی دور ہو جائے۔چنانچہ میں نے جب آیات شمار کیں تو مجموعہ واقعی 6236 آیا۔اب سوائے تسلیم کے کوئی چارہ نہ تھا لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ برس ہا برس سے میری طرح لاتعداد لوگ غلط اعداد و شمار کو دل و دماغ میں بٹھائے ہوئے تھے لیکن کسی نے بھی یہ زحمت گوارا نہ کی کہ خود بھی تحقیق کر لے۔اگر ہر سورت سے پہلے لکھی گئی بسم اللہ کو بھی ایک آیت مان کر 113 مزید آیات کو بھی شامل کیا جائے تو پھر بھی آیات کی تعداد 6666 نہیں بنتی۔

پروفیسر محمد اکرم مدنی کے مطابق سعودی عرب کی وزارت حج و اوقاف کی طرف سے شائع کردہ قرآن مجید جس کو ''مصحف المدینۃ النبویہ'' کا نام دیا گیا ہے کے آخر میں ایک سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے جس پر سعودی عرب کے پندرہ علماء و شیوخ پر مشتمل پروف ریڈنگ کمیٹی کے دستخط موجود ہیں۔اس سرٹیفکیٹ کے ایک عربی پیرا کا ترجمہ پروفیسر صاحب نے

اس طرح کیا ہے!

''اس مصحف شریف میں تعداد آیت کا طریقہ کوفیوں والا ہے جو عبداللہ بن حبیب سلمی نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ امام شاطبی کی کتاب ''ناظمۃ الزہر'' اور دیگر کتب میں ہے جو کہ علم الفواصل (وقف شمار آیات) کے متعلق لکھی گئی ہیں اور ان کے طریقے کے مطابق آیات کی گنتی 6236 ہے''۔ ۱

مصر کے مطبوعہ ایک قرآن مجید کے آخر میں دیئے گئے ضمیمے کا ایک عربی پیرا اور اس کا ترجمہ بھی اس حوالے سے بڑا اہم ہے:

''واتبعت في عد آياته طريقة الكوفين عن ابى عبد الرحمن عبد الله بن حبيب السلمى عن على بن ابى طالب حسب ما ورد فى كتاب "ناظمة الزهر للام الشاطبى و شرحها لابى عبد رضوان المخللاتى و كتاب ابى القاسم عمربن محمد ابن عبد الكافى و كتاب تحقيق البيان لاستاذ الشيخ محمد المتولى شيخ القراء بالديار المصرية سابقا واى القرء ان على طريقتهم ٦٢٣٦''۔

ترجمہ: (اس نسخہ قرآن میں) آیات کی تعداد کے ضمن میں اہل کوفہ کا وہ طریقہ اپنایا گیا جو ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب السلمی سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جیسا کہ امام شاطبی کی کتاب ''ناظمۃ الزہر'' اور اس کی شرح جو ابو عبد رضوان مخللاتی کی ہے۔ نیز ابو القاسم عمر بن محمد ابن عبد الکافی کی کتاب اور استاذ شیخ محمد المتولی جو مصر بھر میں سابقہ شیخ القراء ہیں ان کی کتاب ''تحقیق البیان'' میں مذکور ہے۔ ان کے طریقہ کے مطابق قرآن مجید کی آیات 6236 ہیں''۔ ۲

---

۱) ماہنامہ منہاج القرآن لاہور نومبر ۱۹۹۶ء بعنوان قرآنی آیات و رکوعات کی صحیح تعداد

۲) ضمیمہ قرآن مجید مطبوعہ مصر الحاج شوق عطا مصطفےٰ القاہرہ غرہ شعبان 1400ھ 1980ء

1974ء میں شائع ہونے والے انجمن حمایت اسلام لاہور کے قرآن پاک کے ضمیمے میں ہے!

''والآیہا در ہمہ قرآن بر تعداد کوفیاں کہ قرأت ایشاں دریں جا متلواست شش ہزار دو وصد وسی و شش اند''۔

ترجمہ: اور ان تمام آیات قرآنی کی تعداد کوفیوں کی قرأت کے مطابق جو یہاں مروج ہے 6236 ہے۔

شروع میں تو ان اعداد و شمار کو اکثر اہل علم نے زیادہ اہمیت نہیں دی البتہ بعض حضرات نے اس طرف توجہ دی ہے چنانچہ پہلی دفعہ میرا یہ مضمون جب مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۹۵ء کو روزنامہ پاکستان میں شائع ہوا تو اس کے بعد نومبر ۱۹۹۶ء کے ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور میں پروفیسر محمد اکرم مدنی کا ایک مضمون بعنوان ''قرآنی آیات و رکوعات کی صحیح تعداد'' شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنی تحقیق کے مطابق آیات کی تعداد 6236 اور رکوعات کی تعداد 558 ہی ثابت کی ہے۔

حضرت علامہ منیر احمد یوسفی نے ماہنامہ ''سیدھا راستہ'' لاہور بابت فروری ۱۹۹۷ء میں اپنی اور اپنے کچھ دوستوں کی مشترکہ تحقیق کے بعد آیات کی تعداد 6236 ہی لکھی ہے۔

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر ''تبیان القرآن'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ! ''بعض جید محققین کی رائے ہے کہ کل آیات کی تعداد 6236 ہے''۔

قرآنی آیات و رکوعات کی تعداد کے سلسلہ میں یہ بے احتیاطی دیکھ کر قرآنی حروف کے ان اعداد و شمار پر یقین کرنا مشکل ہو گیا ہے جو کہ ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں اگرچہ قرآنی آیات و رکوعات کی تعداد کے سلسلہ میں مختلف روایات موجود ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید کی آیات کی تعداد میں جو اختلاف مولانا محمد عبدالغفور فاروقی نے

''بستان ابو اللیث سمرقندی'' کے حوالے سے نقل کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

آیات مکی (حسب شمار علمائے مکہ)	آیات عراقی	آیات بصری	آیات کوفی	آیات شامی	آیات عامہ
6212	6214	6216	6236	6250	6666 [1]

اسی طرح کے اعداد و شمار علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں نقل کیے ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد لکھتے ہیں!

''علم القرأت کے لیے اسلام کے ابتدائی دور میں پانچ درسگاہیں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ اور شام میں قائم تھیں۔ ہر درسگاہ نے آیات قرآنی کی تعداد الگ الگ بتائی جو درج ذیل ہے۔

☆ مکہ معظمہ کے مکتب خیال کے بموجب قرآن مجید کی آیات کی تعداد 6212 ہے۔

☆ اسمٰعیل بن جعفر مدنی کے بموجب آیات کی تعداد 6214 ہے۔

☆ بصرہ کے مسلمانوں نے عاصم بن حجاج کی پیروی کی جو اولین ایمان لانے والوں میں تھے ان کے بموجب قرآنی آیات کی تعداد 6216 ہے۔

☆ کوفہ کے مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیرو تھے۔ اس مکتب خیال کے بموجب قرآن مجید میں 6236 آیات ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر اسی کی پیروی کی جاتی ہے۔

☆ شام کے مسلمان حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی پیروی کرتے تھے جو ابتدائی ایمان لانے والوں میں سے تھے۔ اس مکتب خیال کے بموجب قرآنی آیات کی تعداد 6250 ہے۔ [2]

---

۱) حدائق البیان فی معارف القرآن ص ۳۲ مطبوعہ کاشف پبلشرز لاہور

۲) احسن البیان فی علوم القرآن ص ۱۶ مطبوعہ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور

یہ یاد رہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے قرآن کریم میں نہ کوئی کمی بیشی ہوئی ہے اور نہ قیامت تک ہوگی کیونکہ اسکی حفاظت کا ذمہ خود خالق کائنات نے لے رکھا ہے۔ قرآن مجید کی اس خوبی کا اعتراف اپنے تو اپنے غیروں کو بھی ہے۔ بعض کتب تفاسیر اور احادیث میں متن قرآن کے اختلاف کے بارے میں جو بعض روایات ملتی بھی ہیں تو وہ وضعی اور روایت و درایت کے لحاظ سے غیر واضح اور نا قابل اعتبار ہیں۔

الحمد للہ پوری اُمت مسلمہ قرآن پاک کے ایک ایک لفظ پر متفق ہے۔ تاہم قرآن مجید کی آیات کی تعداد کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے تو اس اختلاف کا یہ نتیجہ نہیں ہے کہ بعض شمار کرنے والے عبارت قرآنی میں اضافہ اور بعض اس میں کمی کا اظہار کرتے ہیں بلکہ درحقیقت وقوف نبوی کے تعین میں جس پر مدار شمار آیات کا ہے اختلاف پیدا ہو گیا ہے کوئی ایسے وقوف کا شمار موافق اس روایت کے جو اس تک پہنچی زیادہ بیان کرتا ہے اور کوئی کم۔ جو لوگ کمی کا اظہار کرتے ہیں وہ متعدد آیتوں کو ایک آیت شمار کرتے ہیں اس لیے گوشوارہ پر میزان آیتوں کی کم ہو جاتی ہے"۔[1]

ڈاکٹر صبحی صالح "علوم القرآن" میں زرکشی کے حوالے سے لکھتے ہیں!

"علاوہ ازیں علماء نے آیات کی تعداد میں بھی اختلاف کیا ہے۔ زرکشی البرہان ج ا ص ۲۵۱۔۲۵۲ پر لکھتے ہیں: اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کو آیات کے اختتام سے آگاہ کرنے کے لیے نبی ﷺ ہر آیت کے خاتمہ پر وقف فرمایا کرتے تھے۔ جب صحابہ اواخر آیات سے آگاہ ہو گئے تو آپ آیات کو ملا دیتے جس سے سامع یہ خیال کرتا کہ شاید یہاں آیت ختم نہیں ہوئی"۔[2]

علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی نے لکھا ہے کہ!

---

۱) حدائق البیان فی معارف القرآن ص ۳۲: از مولانا محمد عبد الغفور فاروقی

(۲) علوم القرآن حاشیہ نمبر ۲ ص ۱۳۹ اردو ترجمہ از غلام احمد حریری

''آیات کو شمار کرنا بہت مشکل اور دقیق کام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ آیت کی طرف پر وقف فرماتے تھے اور بعض اوقات دو آیتوں کو ملا کر پڑھتے جس سے سننے والا یہ گمان کرتا کہ یہ ایک آیت ہے''۔ ۱

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں تحت مادہ قرآن درج ہے کہ!

''آیات کی تعداد میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ بعض دفعہ کچھ آیات کے اختتام پر فصل کرتے اور بعض دفعہ وصل فرماتے تھے چونکہ بعض لوگوں نے فصل کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے وصل کا لہذا تعداد میں کمی بیشی ناگزیر تھی''۔ ۲

یہی وجہ پروفیسر عبدالصمد صارم الازہری نے ''تاریخ القرآن'' میں اور پیر سید محمد جرجیس الحسن شاہ نے ''کنز القرآن'' میں لکھی ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر میں ہے کہ! ''آیت کی بناوٹ میں جملوں کی بناوٹ اور تکمیل پیش نظر نہیں رہی۔ قرآن کریم کے بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ ایک جملہ کئی آیات کے بعد مکمل ہوتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی آیت میں کئی کئی جملے آجاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی حد بندی زور کلام اور آہنگ کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے''۔

گذشتہ سطور میں مختلف علاقوں کے حوالے سے آیات کی مختلف تعداد نقل کی گئی ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ 6666 کی تعداد کسی سے بھی مروی نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعداد کیونکر مشہور ہوگئی؟۔ میرے خیال میں اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں:

---

۱) تبیان القرآن ص ۱۰۹ جلد اول

۲) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص ۳۲۸ جلد ۱۶/ ۱ مطبوعہ دانش گاہ پنجاب لاہور

اولاً: آسانی کے لیے چاروں ہندسوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے Round Figure میں 6666 کہہ دیا گیا ہے جس طرح کہ قرآن پاک کے نزول کا زمانہ تقریباً 22 سال 5 ماہ اور 14 دن ہے لیکن اس کو آسانی کے لیے Round Figure میں 23 سال کہہ دیا جاتا ہے۔

ثانیاً: بعض حضرات نے حکم کے لحاظ سے آیات کی تقسیم اس طرح کی ہے:

آیات وعدہ: 1000، آیات وعید: 1000، آیات امر: 1000، آیات نہی: 1000، آیات امثال: 1000، آیات قصص: 1000، آیات تحریم: 250، آیات تحلیل: 250، آیات تسبیح: 100، آیات متفرقہ: 66۔

ان سب کا مجموعہ 6666 بنتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ قرآن پاک کے اندر کئی آیات ایسی ہیں کہ ان کے اندر وعدہ بھی ہے اور ساتھ ہی وعید بھی۔ لازمی بات ہے کہ ایسی آیات وعدہ کی آیات میں بھی شمار ہونگی اور وعید کی آیات میں بھی۔ مثلاً

''لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ وَلَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ ''۔ یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا اور اگر تم ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

پہلے حصے میں انعام کا وعدہ ہے اور دوسرے حصے میں عذاب کی وعید ہے۔ اسی طرح کئی آیات ایسی ہیں کہ ان میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ ظاہر ہے ایسی آیات کا شمار آیات امر میں بھی ہوگا اور آیات نہی میں بھی۔ مثلاً

''وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا''۔ اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔

اس آیت کے پہلے حصے میں امر ہے اور دوسرے حصہ میں نہی ہے۔ لہذا یہ آیت اور اس طرح کی دیگر تمام آیات، آیات امر میں بھی شامل ہوں گی اور آیات نہی میں بھی۔ لازمی بات ہے کہ اس طرح کئی آیات جب دو دو دفعہ شمار ہوں گی تو آیات کا مجموعہ اصل آیات کی

تعداد سے زیادہ آئے گا۔ اگر چہ 6666 کی تعداد آیات کی اقسام کے لحاظ سے ہے لیکن اسکو قرآن کی کل آیات کے طور پر مشہور کر دیا گیا۔

یہ بھی یاد رہے کہ اقسام کے لحاظ سے جو تقسیم ملتی ہے یہ حدیث پاک میں مذکور نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی کاوش ہے مجھے لگتا ہے کہ یہ تعداد بھی تخمینی ہے قطعی نہیں۔ اس لیے کہ سطور بالا میں آیات وعدہ، وعید، امر، نہی، امثال اور قصص میں سے ہر ایک کی تعداد ایک ایک ہزار بتائی گئی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا کوئی اہتمام نہیں فرمایا کہ جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ سب کی تعداد ہزار ہزار ہی ہو کم زیادہ نہ ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں بھی Round Figure کا کلیہ استعمال کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی صاحب علم وقت نکال کر احکام کے لحاظ سے نئے سرے سے آیات کا شمار کرے تا کہ حقیقی تعداد سامنے آسکے۔ اسی طرح قرآنی حروف اور کلمات کے اعداد و شمار جو مختلف کتب میں مذکور ہیں وہ بھی قطعی نہیں ہیں بلکہ تخمینی ہیں انہیں بھی دوبارہ سوچ بچار اور احتیاط کے ساتھ شمار کیا جائے تو انکے مشہور کردہ اعداد و شمار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

جب تحقیق کے بعد مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ قرآن مجید کی آیات 6666 نہیں بلکہ 6236 ہیں تو سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ رکوعات کی مشہور کردہ تعداد بھی غلط ہو۔ چنانچہ جب میں نے انہیں شمار کیا تو یہ معلوم ہوا کہ یہ 540 نہیں بلکہ 558 ہیں۔ یہ میرے لیے ایک اور انکشاف تھا۔ حالانکہ مولوی محبوب عالم نے اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں سیارہ ڈائجسٹ اور ماہنامہ ندائے اہل سنت لاہور کے قرآن نمبروں اور دیگر کئی کتب میں رکوعوں کی تعداد 540 ہی لکھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ فتاویٰ عالمگیری جو کہ انتہائی معتبر اور مستند فتاویٰ ہے اس میں بھی یہی 540 کی تعداد درج ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

''ان المشائخ رحمهم الله جعلوا القران خمس و اربعين ركوعاً واعملوا ذلک فی المصاحف حتیٰ يحصل الختم فی ليلة السابع

والعشرین ''۔ مشائخ پر اللہ کی رحمت ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کو پانچ سو چالیس رکوعوں پر تقسیم کیا اور مصاحف میں علامتیں بنادیں تاکہ تراویح میں قرآن مجید کا ختم ستائیسویں شب میں ہوسکے''۔ ا

ڈاکٹر حسن الدین احمد لکھتے ہیں! ''تراویح میں پہلے دس آیات پڑھنے کا عمل تھا۔ بعد میں اس طرح ہوا کہ جہاں مطلب ختم ہوتا وہاں رکوع کر دیا جاتا۔ اس طرح پانچ سو چالیس رکوع ہوئے۔ بعض نے یہ عمل حضرت عثمان سے اور بعض نے حضرت عمر سے منسوب کیا ہے''۔ ۲

لیکن سید قاسم محمود نے لکھا ہے کہ! ''رکوعوں کا تعین بنی اُمیہ کے عہد میں فضلا نے کیا تھا۔ ان کی تقسیم وتعین میں معنی ومفہوم تعداد آیات اور مضمون تینوں کا لحاظ رکھا گیا ہے''۔ ۳

مذکورہ بالا حوالوں کے علاوہ دیگر کئی ایسی کتب موجود ہیں جن میں رکوعوں کی تعداد 540 ہی لکھی گئی ہے۔ البتہ سید قاسم محمود نے اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں رکوعوں کی تعداد 558 ذکر کی ہے۔ مولانا قاری حمید الرحمٰن نے اپنی کتاب ''خلاصہ مضامین سور القرآن'' میں رکوعوں کی تعداد 540 کے ساتھ ساتھ 558 کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شروع کے ادوار میں رکوعوں کی تعداد 540 ہی ہو اور بعد میں 18 رکوعوں کی تعداد کو مزید بڑھا دیا گیا ہو۔ شاید پہلے تیسویں پارے کی دو دو چھوٹی سورتوں کے بعد رکوع کی علامت لگائی گئی ہو اور بعد ازاں ہر سورت پر علامت رکوع لگانے سے یہ تعداد بڑھ گئی ہو اور یوں یہ تعداد 540 سے بڑھ کر 558 ہوگئی ہو۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو ہمارے ہاں جتنے بھی نسخے قرآن

---

۱) بحوالہ علوم القرآن ص ۲۰۱: از ڈاکٹر حسن الدین احمد

۲) احسن البیان فی علوم القرآن ص ۲۰ مطبوعہ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور

۳) اسلامی انسائیکلو پیڈیا ص ۲۰ ۱۳ مطبوعہ لاہور

پاک کے موجود ہیں چاہے وہ کسی بھی مکتبہ فکر کے ادارے سے شائع کردہ ہوں ان کے مطابق رکوعوں کی تعداد 558 ہی ہے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان اور پاکستان میں اس وقت رکوعوں کی جو تقسیم مروج ہے اسکے بموجب رکوعوں کی تعداد 558 ہے''۔ [1]

اس وقت کسی بھی کمپنی کا مطبوعہ قرآن مجید لے لیں اس میں رکوع کی تعداد 558 اور آیات کی تعداد 6236 ہی بنتی ہے۔ البتہ تاج کمپنی اور اولیس کمپنی لاہور کے مطبوعہ قرآن مجید کے بعض نسخوں کے مطابق سورہ نساء اور سورہ انعام کی آیات کی تعداد بالترتیب 177 اور 166 لکھی ہے جبکہ دیگر کمپنیوں نے بالترتیب 176 اور 165 لکھی ہے۔ ان کمپنیوں میں انجمن حمایت اسلام لاہور اور ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے سورہ نساء اور سورہ انعام کی جس جس عبارت کو بالترتیب آیت نمبر 173 اور آیت نمبر 73 کہا ہے تاج کمپنی اور اولیس کمپنی نے انہی عبارات کو دو دو آیات قرار دیا ہے البتہ تاج کمپنی کے بعض ایسے نسخے بھی موجود ہیں جن میں سورہ نساء اور سورہ انعام کی آیات کی تعداد بالترتیب 176 اور 165 ہی بتائی گئی ہے۔ تاہم یہ فرق دور کیا جانا چاہیے تاکہ نمبر شمار کے حوالے سے مطلوبہ آیت تلاش کرنے میں کسی کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ سعودی عرب اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے مطبوعہ قرآن پاک میں سورہ فاتحہ سے قبل موجود ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کو آیت نمبر ایک قرار دیا گیا ہے اور اس سمیت سورہ فاتحہ کی سات آیات بتائی گئی ہیں جبکہ باقی کمپنیوں نے بسم اللہ کے بغیر سورہ فاتحہ کی سات آیات تسلیم کی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ عموماً سورہ فاتحہ کے جس متن کو آیت نمبر 6 اور آیت نمبر 7 کہا گیا ہے سعودی عرب اور انجمن حمایت اسلام کے مطبوعہ قرآن پاک میں ان دونوں آیات کو ایک ہی آیت قرار دیا گیا

---

[1] احسن البیان فی علوم القرآن ص ۲۰

ہے۔ اگر چہ ایسی مختلف روایات موجود ہیں جنہیں مختلف ادارے اپنے اپنے موقف کے حق میں پیش کر سکتے ہیں لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ہی بات پر اتفاق کر کے اس فرق کو دور کیا جائے اور تمام ادارے قرآن کریم کی طباعت ایک ہی طریقے اور ایک ہی انداز سے کریں۔ قرآن پاک کے تمام نسخوں میں ہر لحاظ سے مطابقت اور یکسانیت ہونی چاہیے ہمارے علماء کرام، محققین اور حکومت کو خصوصی توجہ دینی چاہیے تا کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے اور تخریبی و انتشاری ذہن رکھنے والے لوگ اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھا سکیں یہ بھی از حد ضروری ہے کہ قرآنی آیات کی تعداد 6236 اور رکوعوں کی تعداد 558 ہی لکھی اور پڑھی جائے اور اسے ہی عام کیا جائے۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

بقیہ (غوث پاک کی گیارہویں)

خوشی میں دسویں محرم کو روزہ رکھا اور اس روزے کا حکم بھی دیا (بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۶۸، مسلم جلد ۱ صفحہ ۳۵۹)۔ ان سب احادیث میں دن مقرر کرنے کا ثبوت موجود ہے۔ ثالثاً دن مقرر کرنے میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ اعلانِ عام ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اجتماع ہو سکے۔ چنانچہ منکرین کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے کہ جو کام کسی خاص وقت میں کیا جاتا ہے وہ اس وقت یاد بھی آجاتا ہے اور ضرور انجام پاتا ہے۔ نہیں تو سالہا سال گزر جاتے ہیں کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اس قسم کی مصلحتیں ہر بات میں ہیں جن کی تفصیل بہت لمبی ہے (الی ان قال)۔ حضرت غوث پاک قدس سرہ کی گیارہویں، دسواں، بیسواں، چہلم، برسی وغیرہ اور توشہ حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمت اللہ علیہ اور شیرینی حضرت بوعلی قلندر رحمت اللہ علیہ، شب برات کا حلوہ اور ایصال ثواب کے دوسرے طریقے اسی قاعدے پر مبنی ہیں (فیصلہ ہفت مسئلہ صفحہ ۲۱ تا ۲۳)۔

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی ☆

(قسط 2)

کچھ علم حدیث کے بارے میں

علم حدیث سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اس لیے کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی عجالہ نافعہ میں فرماتے ہیں!

''چونکہ (حدیث) ایک قسم کی خبر ہے۔ اور خبر سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال رکھتی ہے۔ اس لیے اس علم کو حاصل کرنے کیلیے دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ حدیث کے راویوں کے حالات کی چھان بین اور ان سے واقفیت حاصل کرنا۔ اور دوسری (ضروری) بات یہ ہے کہ حدیث کا مطلب سمجھنے کیلئے نہایت احتیاط سے کام لینا۔ کیونکہ اگر پہلی بات میں کوتاہی رہ گئی تو سچے اور جھوٹے میں تمیز نہ رہے گی اور اگر دوسری بات میں احتیاط نہ کی گئی اور اس میں ذرا سی بھی کوتاہی ہو گئی تو مراد غیر مراد سے خلط ملط ہو جائے گی۔ اور ان دونوں صورتوں میں اس بلند پایہ علم سے جس فائدہ کی توقع تھی وہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ بلکہ فائدہ کی بجائے الٹا نقصان ہو گا۔ خود بھی گمراہ ہو گا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا''۔ (حاشیہ شرح نخبۃ الفکر ص ۲۷)

سند کی تعریف:

متن حدیث کے طریق کا بیان سند کہلاتا ہے۔ طریق کا معنی ہے ''راستہ'' یعنی جو کہ مطلوب تک پہنچا دے۔ اب ناموں کا وہ سلسلہ جو کہ متن تک پہنچا دے وہ حدیث کا طریق ہوا۔ اسے اسناد کہتے ہیں۔ یعنی الفاظ حدیث سے پہلے ناموں کا سلسلہ اسناد کہلاتا ہے۔

☆) 0344-7519992

متن کی تعریف:

جس (مضمون) پر اسناد وکلام ختم ہو جائیں اسے متن کہتے ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۲۷) یعنی جہاں اسناد ختم ہو جائے اسے متن کہا جاتا ہے۔

مثلاً: حدثنا ابو الیمان قال اخبرہ شعیب قال حدثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ یہ اسناد ہے۔ اور ان رسول اللہ ﷺ قال والذی نفسی بیدہ الخ متن ہے۔

حدیث کی تعریف:

حدیث کے لغوی معانی جدید کے ہیں۔ جسے قدیم کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گفتگو، بیان، واقعہ اور قصہ بھی مراد لیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں حدیث کا لفظ بمعنی گفتگو، بیان، بات، واقعہ کے معنی کے ساتھ سورۃ الکہف۔ ۶، سورۃ التحریم۔ ۳، سورۃ طٰہٰ۔ ۹، سورۃ البروج۔ ۱۷، اور سورۃ المرسلات۔ ۵۰ میں استعمال ہوا ہے۔

حدیث کے اصطلاحی معنی نبی کریم ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کے ہیں۔ صحابہ کرام وتابعین کے قول، فعل اور تقریر کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کو خبر واثر بھی کہتے ہیں۔

قولی حدیث: ۔ ایسی حدیث جس میں حضور ﷺ کا قول ذکر کیا گیا ہو۔

فعلی حدیث: ۔ ایسی حدیث جس میں حضور ﷺ کا فعل ذکر کیا گیا ہو۔

تقریری حدیث: ۔ ایسی حدیث جس میں حضور ﷺ نے اپنے سامنے ہونے والے کسی امر کے حوالے سے کچھ فرمایا ہو۔

اسی طرح صحابہ وتابعین کے حوالے سے بھی یہی بات ہے۔ یعنی انکے قول وفعل وتقریر کو حدیث یا خبر یا اثر کہا جائے گا۔

طرق کے لحاظ سے حدیث کی دو قسمیں ہیں:

(۱) متواتر (۲) آحاد (خبر واحد)

۱) متواتر:۔ وہ حدیث جسکے روایت کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر کثیر ہوں کہ ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کر لینے کو عقل سلیم محال سمجھے۔

۲) آحاد (خبر واحد):۔ وہ حدیث یا احادیث جس کے راوی اس قدر کثیر نہ ہوں۔

اقسام تواتر:۔

۱) تواتر اسناد (۲) تواتر طبقہ (۳) تواتر عمل (۴) تواتر مشترک (تواتر معنوی)

۱) تواتر اسناد:۔ یہ ہے کہ شروع سند سے آخر سند تک حدیث کو ایسی جماعت روایت کرے جس کا اجتماع جھوٹ پر محال ہو۔ جیسے حدیث من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار۔ علامہ ابن الصلاح علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس کو ۶۲ صحابہ کرام نے روایت کیا ہے۔ علامہ نووی نے شرح صحیح مسلم میں فرمایا ہے کہ قریباً دو سو صحابہ نے روایت کیا ہے۔ یونہی ختم نبوت کی احادیث ہیں۔ جو کہ ڈیڑھ سو سے زائد ہیں۔ تیس کے قریب صحاح ستہ میں ہیں۔

۲) تواتر طبقہ:۔ جیسے تواتر قرآن ہے کیونکہ قرآن مجید شرقاً غرباً، درساً، تلاوۃً، حفظاً و قرأۃً متواتر ہے۔

۳) تواتر عمل:۔ یہ ہے کہ حضور ﷺ سے لیکر آج تک ہر زمانہ میں اتنی بڑی جماعت نے اس پر عمل کیا ہو کہ اتنے لوگوں کا اتفاق جھوٹ یا غلط بات پر محال ہو۔ جیسے وضو کے اندر مسواک کرنا سنت ہے اور اسکی سنیت کا اعتقاد فرض ہے کیونکہ یہ تواتر عملی سے ثابت ہے۔

۴) تواتر مشترک (تواتر معنوی):۔ یہ کہ راویوں کے الفاظ اس میں مختلف ہوں یعنی راویوں کی ایک جماعت ایک واقعہ کو روایت کرتی ہو اور دوسری جماعت دوسرے واقعہ

کو۔اور اگر یہ سب واقعات کسی قدر مشترک پر مشتمل ہوں تو اس کو تواتر مشترک یا تواتر معنوی کہتے ہیں۔مثال کے طور پر راویوں کی ایک جماعت روایت کرے کہ حاتم طائی نے سو دینار بخشے تھے اور دوسری جماعت یوں بیان کرے کہ سو اُونٹ بخشے تھے اور تیسری جماعت بتائے کہ بیس گھوڑے بخشے تھے۔تو اب یہ تمام روایات اس بات میں مشترک ہیں کہ حاتم طائی نے اپنے مال سے کوئی سی چیز بخشی تھی جو اس کی سخاوت کی دلیل ہے۔عقائد میں اسکی مثال سماع موتی کی ہے۔

خبر واحد کی پہلی تقسیم:۔خبر واحد اپنے منتہٰی کے اعتبار سے تین قسم پر ہے:

۱)مرفوع (۲)موقوف (۳)مقطوع

۱)مرفوع:۔یہ وہ حدیث ہے جس میں حضور ﷺ کے قول، فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

۲)موقوف:۔یہ وہ حدیث ہے جس میں صحابی رضی اللہ عنہ کے قول، فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

۳)مقطوع:۔یہ وہ حدیث ہے جس میں تابعی علیہ الرحمہ کے قول، فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

خبر واحد کی دوسری تقسیم:۔خبر واحد راویوں کی تعداد کے اعتبار سے بھی تین قسم ہے:

۱)مشہور (۲)عزیز (۳)غریب

۱)مشہور:۔محدثین کی اصطلاح میں مشہور سے مراد وہ حدیث یا روایت ہے جسے بیان کرنے والے تین یا زیادہ افراد ہوں۔اور یہ تعداد تمام طبقات میں اسی طرح قائم رہے۔لیکن متواتر کی حد کو نہ پہنچے۔مثال کے طور پر حدیث ''ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ ''مشہور ہے۔اہل علم کے ہاں مشہور ہونا اور عامۃ الناس کے ہاں مشہور ہونا۔اس قسم کی کتب درج ذیل ہیں۔

۱)التذکرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ:از حافظ بدرالدین زرکشی

۲)الآلی المنثورۃ فی الاحادیث المشہورۃ:از حافظ ابن حجر عسقلانی

۳)المقاصد الحسنہ:از حافظ السخاوی

۴)کشف الخفاء:ازعجلونی الجراحی

۵)النوافع العطرۃ فی الاحادیث لمشتہرۃ :ازقاضی محمد بن احمد الصنعانی (معجم ص ۴۱۴)

۲)عزیز:۔وہ حدیث جس کے راوی سند کے تمام طبقات میں دو سے کم نہ ہوں لیکن اگر کسی طبقے میں اس سے زیادہ ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔تاہم ضروری یہ ہے کہ یہ تعداد کسی بھی طبقے میں دو سے کم نہ ہو خواہ وہ ایک ہی طبقہ ہو۔مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بروایت بخاری و مسلم"ان رسول اللہ ﷺ قال لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین"۔اسکی سند اس طرح ہے:
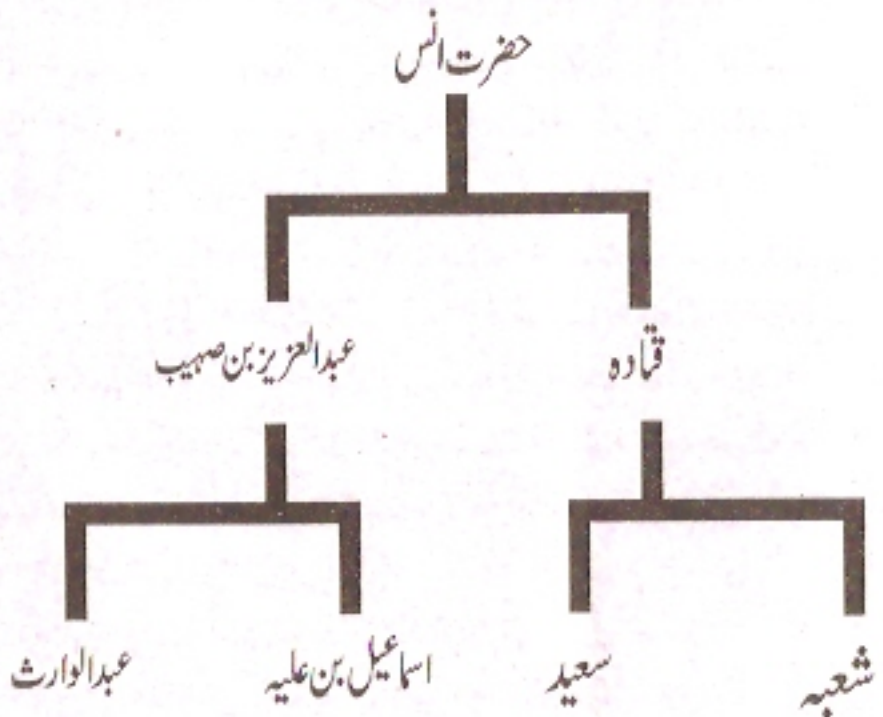
کے یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دو راوی قتادہ اور عبدالعزیز روایت کرتے ہیں پھر قتادہ سے شعبہ اور سعید روایت کرتے ہیں۔ جبکہ عبدالعزیز سے دو راوی اسماعیل اور عبد الوارث پھر ان سب سے کئی افراد روایت کرتے ہیں۔

۳) غریب:۔ وہ حدیث ہے جسے روایت کرنے والا صرف ایک شخص ہو۔ یعنی وہ حدیث جسے روایت کرنے میں کوئی شخص اکیلا اور منفرد ہو اور یہ کیفیت اسکی سند کے تمام طبقات میں یا بعض میں ہو۔ یا کسی ایک طبقے میں صرف ایک راوی رہ جائے۔ اگر کہیں ایک سے زیادہ راوی بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اعتبار کم سے کم تعداد کا ہوتا ہے۔ اکثر علماء ''الغریب'' کو ''الفرد'' کا نام بھی دیتے ہیں۔ پھر اسکی دو قسمیں ہیں:

ا) الفرد مطلق (ب) الفرد النسبی

ا) الفرد المطلق:۔ وہ حدیث جس میں غرابت (تفرد) سند کی ابتداء میں ہو یعنی آغاز سند میں ہی روایت کرنے والا کوئی اکیلا شخص ہو۔ مثلاً حدیث ''انما الاعمال بالنیات'' (بخاری و مسلم) کی روایت میں صحابی رسول حضرت عمر بن خطاب منفرد ہیں۔

۲) الفرد النسبی:۔ وہ حدیث جسکی سند کے درمیان کے کسی طبقے میں کوئی راوی اکیلا رہ جائے۔ یعنی ابتداء اور اصل سند میں روایت کرنے والے (صحابہ) تو بہت ہوں لیکن بعد کے کسی طبقے میں کوئی راوی اپنے مشائخ سے روایت کرنے میں اکیلا رہ جائے۔

خبر واحد کی تیسری تقسیم:۔ خبر واحد اپنے راویوں کی صفات کے اعتبار سے سولہ قسم ہے:

ا) صحیح لذاتہ:۔ وہ حدیث ہے جس کے کل راوی عادل، کامل الضبط ہوں اور اس کی سند متصل ہو۔ معلل و شاذ ہونے سے محفوظ ہو۔ اسکو صحیح یا صحیح لذاتہ کہتے ہیں۔

۲) حسن لذاتہ:۔ وہ حدیث ہے جسکے راوی میں صرف ضبط ناقص ہو باقی سب شرائط صحیح لذاتہ کے اس میں موجود ہوں۔

۳) ضعیف:۔ وہ حدیث ہے جس کے راوی میں حدیث صحیح و حسن کی شرائط نہ پائی

جائیں۔

کسی بھی حدیث کے ضعیف قرار دینے کیلئے مختلف اسباب ہیں یہ اسباب مجموعی طور پر ان دو امور میں واقع ہوتے ہیں۔

۱) راوی میں عیب (۲) سند میں سقوط

۴) صحیح لغیرہ:۔ اُس حدیث حسن لذاتہ کو کہا جاتا ہے جسکی سندیں متعدد ہوں۔

۵) حسن لغیرہ:۔ اس حدیث ضعیف کو کہا جاتا ہے جسکی سندیں متعدد ہوں۔

۶) موضوع:۔ وہ حدیث جسکے راوی پر حدیث نبوی میں جھوٹ بولنے کا طعن ہو۔ یعنی کسی راوی میں یہ عیب ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولتا ہے اور من گھڑت باتیں آپ ﷺ کی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کی روایت موضوع ہے۔

۷) متروک:۔ وہ حدیث جس کا کوئی راوی ایسا ہو جس پر جھوٹے ہونے کی تہمت ہو تو اس کی روایت کو متروک کہتے ہیں۔

۸) شاذ:۔ وہ حدیث جس کا راوی ثقہ ہو مگر ایک ایسی جماعت کثیرہ کی مخالفت کرتا ہو جو اس سے زیادہ ثقہ ہیں۔

۹) محفوظ:۔ وہ حدیث جو شاذ کے مقابل ہو۔

۱۰) منکر:۔ وہ حدیث ہے جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعت ثقات کے مخالف روایت کرے۔

۱۱) معروف:۔ وہ حدیث جو منکر کے مقابل ہو۔

۱۲) مُعَلَّل:۔ وہ حدیث جس میں کوئی ایسی علت خفیہ ہو جو صحت حدیث میں نقصان دیتی ہو۔ اسکو معلوم کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔

۱۳) مُضطرِب:۔ وہ حدیث جس کی سند یا متن میں ایسا اختلاف واقع ہو کہ اس میں ترجیح یا تطبیق نہ ہو سکے۔

۱۴)مقلوب:۔ وہ حدیث جس میں بھول سے متن یا سند کے اندر تقدیم یا تاخیر واقع ہو گئی ہو۔ یعنی لفظ مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کیا گیا ہو۔ یا بھول کر ایک راوی کی جگہ دوسرا راوی رکھا گیا ہو۔

۱۵)مُصَحَّف:۔ وہ حدیث جس میں باجود صورت خطی باقی رہنے کے لفظوں ، حرکتوں و سکونوں کے تغیر کی وجہ سے تلفظ میں غلطی واقع ہو جائے۔

۱۶)مُدْرَج:۔ وہ حدیث جس میں کسی جگہ راوی اپنا کلام درج کر دے۔

خبر واحد کی چوتھی تقسیم:۔ خبر واحد سقوط و عدم سقوط راوی کے اعتبار سے سات قسم ہے:

۱)مُتَّصِل:۔ وہ حدیث کہ اس کی سند میں راوی پورے مذکور ہوں۔

۲)مُسْنَد:۔ وہ حدیث کہ اس کی سند رسول اللہ ﷺ تک متصل ہو۔

۳)مُنْقَطِع:۔ وہ حدیث کہ اسکی سند متصل نہ ہو بلکہ کہیں نہ کہیں سے راوی گرا ہوا ہو۔

۴)مُعَلَّق:۔ وہ حدیث جس کی سند کے شروع سے ایک راوی یا کثیر راوی گرے ہوئے ہوں۔

۵)مُعْضَل:۔ وہ حدیث جس کی سند کے درمیان میں سے کوئی راوی گرا ہوا ہو یا ایک سے زائد راوی پے در پے گرے ہوئے ہوں۔

۶)مُرْسَل:۔ وہ حدیث جس کی سند کے آخر سے کوئی راوی گرا ہوا ہو۔

۷)مُدَلَّس:۔ وہ حدیث جسکے راوی کی یہ عادت ہو کہ وہ اپنے شیخ یا شیخ الشیخ کا نام چھپالیتا ہو۔

نقشہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

قبولیت اور عدم قبولیت کے لحاظ سے حدیث کی تقسیم

از قلم: کرنل (ر) الطاف محمود ہاشمی ☆

(قسط 1)

قبر سے حصولِ فیض

یہ 21 جولائی 2003ء /20 جمادی الاول 1424ھ، پیر کے دن کی بات ہے کہ میں واہ کینٹ سے لاہور میں سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر رات بسر کرنے حاضر۔ میں حضرت داتا صاحب کے چہرہ مبارک کے سامنے پشت قبلہ کی جانب کیے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں اور مراقبہ والا ماحول بن نہیں پا رہا تھا، لہٰذا وقت گذاری کے لیے آتے جاتے لوگوں کی حاضری کے انداز کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ اپنے پیچھے پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک پیارا سا بچہ نظر پڑا جو سر جھکائے، آنکھیں بند کیے اس جہان و مافیہا اور اس کے شور شرابے سے مکمل طور پر بے نیاز کسی تصور میں گم بیٹھا تھا۔ میری نظر اس پر ٹک گئی کیونکہ تمام ہجوم میں یہی بچہ ایسا نظر آیا جس کے مطالبات (اگر کچھ ہوں گے) تو باقی لوگوں سے مختصر بھی ہوں گے اور سادہ بھی۔ میں اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا تاکہ اس سے اس بے نیازی کا راز پوچھ سکوں۔ لیکن اس کیفیت میں اس کی توجہ اُس کے مقصد سے ہٹانا رسمِ دنیا کے بھی خلاف تھا اور آدابِ موقع کے بھی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد اس نے سر اٹھایا، دائیں بائیں دیکھا اور غالباً ''وطن سے واپسی'' کا سفر شروع کیا۔ جب وہ مکمل طور پر واپس آ گیا تو میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے السلام علیکم کہا۔ اس نے سلام کا جواب دیا۔ نام اور وطن دریافت کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا ''ایاز بیٹے! یہ سر جھکا کر آپ کن خیالوں میں مگن تھے؟'' چکوال سے آئے ہوئے گیارھویں جماعت کے اس طالب علم نے جواب دیا

(☆) 0300-5570547

کہ مراقبہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اُس نے مراقبہ کہاں سے سیکھا ہے؟ ایاز نے تھوڑے فاصلے پر تازہ شیو شدہ، سر پر رومال باندھے، کسی اور جہان میں مستغرق، لوگوں سے بے نیاز، سر سینے پر ڈھلکا ہوا، چار زانو بیٹھے، کسی خیال میں منہمک تیں کے پیٹے میں ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''یہ میرے بھائی عامر ہیں۔ ایک بھائی ان سے بھی بڑے ہیں جو کندیاں میں حضرت مولانا خان محمد صاحب کے خلفاء میں سے ہیں، ہم نے مراقبہ ان سے سیکھا ہے۔'' میں نے کسی خیال کے پیشِ نظر اس سے پوچھا کہ آپ کے شیخ آپ لوگوں کو یہاں آنے سے منع نہیں کرتے؟ اس نے جواب دیا ''نہیں! وہ فرماتے ہیں کہ جب بھی لاہور جاؤ تو داتا صاحب ضرور حاضری دیا کرو۔'' میں نے ایاز سے مزید سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اٹھ کر ذرا تھکاوٹ دور کرنے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو دونوں بھائی پھر اسی انہماک میں چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ اس عمر میں ان کو کیا لگ گئی ہے کہ آدھ گھنٹہ انہیں کسی چیز کا ہوش نہ تھا اور اپنی حالت یہ تھی کہ اپنے علاوہ ہر چیز کا ہوش تھا۔ جب اس نے سر اٹھایا اور اٹھ کر باہر نکلنے لگا تو میں نے سلام لیا، مصافحہ کیا۔ عامر نے بڑی محویت سے بتایا کہ اس کے بڑے بھائی گھنٹوں کے حساب سے دو زانو بیٹھ کر مراقبہ کرتے ہیں۔ اس کو اس بات کا قلق تھا کہ اس سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا۔ میں نے نہایت دلچسپی سے ایاز سے پوچھا کہ مراقبہ کیا ہوتا ہے؟ وہ تھوڑا ہچکچایا۔ عمر کے فرق اور بچپنے کی بنا پر وہ الفاظ کی ادائی پر پوری قدرت نہیں پا رہا تھا ''مراقبہ میں صاحبِ مزار کی جانب متوجہ ہو کر اُن سے فیض لیتے ہیں۔'' میں سوچ میں پڑ گیا کہ دنیا میں تو ہر چیز آنکھیں کھول کر لی جاتی ہے، یہ فیض عجیب شے ہے جو آنکھیں بند کر کے لی جا رہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ جہاں پاکیزہ اور قادر ترین ذات اپنے محبوب ﷺ کو سیر کے لیے سورج کی روشنی کی بجائے شبِ اماوس(۱) کا انتخاب فرمائے تو یقیناً اس جہان میں کچھ ایسا ضرور ہوگا جو

(۱) ایسی تاریک رات جس میں چاند بھی نظر نہیں آتا۔

آنکھیں بند کر کے لینا پڑتا ہوگا۔

فیض کے لفظی معنی ہیں ابل پڑنا، پھوٹ نکلنا، چھلکنا، کناروں سے گذر جانا۔ نور کے منبع سے شعاعوں کے نکلنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے...... فیض کا لفظ فعلِ خدا، فعلِ ارواحِ سافلہ (زمینی ارواح) اور فعلِ انسان اول سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن فعلِ خدا کے لیے مستعمل ہو تو لامحالہ اس کا بلند ترین مفہوم مراد ہوتا ہے۔ ۱

جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر، قرآنِ پاک کی تلاوت، اللہ تعالیٰ کے حبیب پاک ﷺ کی اتباع کے ساتھ ساتھ ذکر و اذکار اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و خوض اور تدبر کرتا ہے (عموماً مراقبہ کی صورت میں) تو اللہ تعالیٰ اسے نور سے نوازتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اس نور اور اس کے حصول کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ یُؤْتِکُمْ کِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِہٖ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ وَیَغْفِرْلَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ''۔ ۲

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور (سچے دل سے) اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لے آؤ۔ (اس کے نتیجہ میں) اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دہرا حصہ عطا فرمائے گا اور تمہارے لیے ایک نور بنا دے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے اور (وہ) تمہیں بخش دے گا۔ اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان انوار کے ورود کا تذکرہ قرآنِ پاک میں جا بجا ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَا ط''۔ ۳

ترجمہ: کیا وہ شخص جو (پہلے) مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے نور بنا دیا

---

۱) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد 15: صفحہ 1083 (۲) سورۃ الحدید آیت نمبر 28

۳) سورۃ الانعام آیت نمبر 123

جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے، اس (شخص) جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں گھرا ہوا ہو اور ان سے نکلنے والا نہ ہو؟۔

''فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O [1]

ترجمہ: جو لوگ (قرآن پاک پر) ایمان لائیں گے اور اس کی تائید اور مدد کریں گے اور اس نور کی پیروی کریں گے جو اس (قرآن پاک) کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

حدیث پاک میں بھی اس نور اور فیض کا تذکرہ موجود ہے: ''اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ''۔ (ترمذی)

ترجمہ: مومن کی فراست سے بچا کرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔] انہیں انوار کو عرف عام میں ''فیض'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

صرف فیض کا ورود ہی کیا، ایمان پر ثابت قدم رہنے والے پر آج بھی اللہ تعالیٰ فرشتے اتارتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ O نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ. وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ O''۔ [2]

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو۔ اور تمہیں (اس) جنت کی بشارت ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اس میں تمہارے لیے ہر وہ شے ہے جس کو تمہارا جی چاہے اور

1) سورۃ الاعراف آیت نمبر 157 (۲) حم السجدہ آیت نمبر 30 تا 31

تمہارے لیے اس میں ہر وہ شے ہے جو تم مانگو گے۔ یہ میزبانی اُس غفور رحیم کی طرف سے ہے۔

یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ یہ فیض ہر مسلمان پر اطاعتِ الٰہی، اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ، ایمان کی مضبوطی، اللہ تعالیٰ کی توفیق اور آزمائشوں پر استقامت کے موافق وارد ہوتا ہے۔ ورودِ فیض کا نتیجہ شرحِ صدر ہوتا ہے۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ط فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ O [1]

ترجمہ: کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ نور پر چل رہا ہے اُس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جسے فیض اور (اس کے نتیجہ میں) شرحِ صدر عطا ہوا ہی نہ ہو؟ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل ذکرِ الٰہی سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

قرآنِ کریم کی اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ورودِ انوار سے شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے جبکہ ورودِ انوار اللہ تعالیٰ کے ذکر کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے انوار اور شرحِ صدر کی منزل عطا فرمائی ہے اُن کی بہت سی مثالیں قرآنِ پاک میں ملتی ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سینکڑوں میل دور سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو سونگھ لینے کا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے: وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ O [2]

ترجمہ: (یوسف علیہ السلام نے فرمایا) میری یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو، ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔ اور جونہی قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا (تو ادھر کنعان میں) ان کے والد نے فرمایا کہ میں

1) سورۃ الزمر آیت نمبر 22 (۲) سورۃ یوسف آیت نمبر 94

یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، اگر تم مجھے بیوقوف خیال نہ کرو۔

یہ شرح صدر ہے کہ سینکڑوں میل دور سے بیٹے کی خوشبو سونگھی جا رہی ہے، قمیض سے سفید آنکھوں میں بینائی لوٹائی جا رہی ہے۔ بھلا قمیضوں سے بینائی کا علاج ہوتا ہے؟ جی ہاں جب انوار اور شرح صدر حاصل ہو جائے تو یہ سب کچھ ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو گمان گذرے کہ یہ واقعات تو انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہیں جو وحی سے مقام دیے گئے تھے، اولیاء اللہ اس معاملہ میں کیا مقام رکھتے ہوں گے؟ قرآن پاک نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے کہنے پر آصف بن برخیا (سلیمان علیہ السلام کے امتی) 2300 کلومیٹر دور یمن سے ملکہ بلقیس کا تخت پلک جھپکنے میں بیت المقدس میں اٹھا لائے۔ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ O قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ''۔ ۱؎

ترجمہ: (حضرت سلیمان علیہ السلام نے) فرمایا۔ اے میرے درباریو! تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لائے گا، اس سے پہلے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ ...... اب ایک ایسا شخص بولا جس کے پاس کتاب کا علم تھا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے لا پیش کرتا ہوں۔ جونہی انہوں نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو فوراً پکار اٹھے ''یہ میرے رب کا فضل ہے۔''

آصف بن برخیا نبی نہیں انسان تو تھے، یہ فیضان اتنا موثر ہے کہ اگر یہ نہایت مختصر سے جانور پر پڑ جائے تو اس کی آواز اور بصارت کو میلوں دور تک وسعت دے دیتا ہے، جانوروں میں جانور بھی وہ جس کی آنکھیں زمین کے ساتھ لگی ہیں، اوپر اور دور دیکھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں، یعنی چیونٹی۔ نگاہ و فیضِ نبوت پڑنے کی دیر ہے کہ یہ چیونٹی سلیمان

---

۱) سورہ نمل آیت نمبر 38,40

علیہ السلام اور ان کے لشکر کو میلوں دور سے دیکھ بھی رہی ہے، انہیں سن بھی رہی ہے اور سمجھ بھی رہی ہے۔ جس جانور کی آواز آج کی ترقی یافتہ سائنس ہزار کوشش کے باوجود سننے سے قاصر ہے، سلیمان علیہ السلام اس کی آواز کئی کلومیٹر دور سے سن رہے ہیں۔ قرآن پاک اس حقیقت کا اظہار یوں کرتا ہے: قَالَتْ نَمْلَةٌ يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا ''۔[1]

ترجمہ: ایک چیونٹی نے (دوسری چیونٹیوں سے) کہا ''اے چیونٹیو! اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمان (علیہ السلام) اور ان کا لشکر بے خبری میں تمہیں کچل ہی نہ ڈالیں۔ سو اس کی بات پر سلیمان (علیہ السلام) مسکراتے ہوئے ہنس پڑے۔

یہاں غور طلب مقام یہ ہے کہ جونہی حضرت سلیمان علیہ السلام کی توجہ چیونٹی کی طرف مبذول ہوئی تو وہ چیونٹی جو چند انچ تک دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتی، کئی کلومیٹر دور نبی علیہ السلام اور ان کے لشکر کو صرف دیکھ ہی نہیں رہی، انہیں پہچان بھی رہی ہے۔ جب یہ توجہ اتنے معمولی جانور پر اثر انداز ہوئے بنا نہیں رہتی تو اگر انسان اس طرف توجہ دے تو وہ کیوں اس سے محروم رہے گا؟ یہ بات واضح ہوگئی کہ فیض، انوارات، نزولِ ملائکہ اور شرح صدر کا سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ اس کے اثرات ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم　حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل　بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

اور جنہیں وہ فیض میسر آجائے ان کے متعلق اقبال فرماتے ہیں:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو　ید بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

---

1) سورۃ النمل آیت نمبر 18، 19

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی ۔ الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی ۔ نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو ۔ کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

کشف المحجوب میں حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے ساتھ بیتے ہوئے انکشافات کا تذکرہ فرماتے ہیں: باب ''کراماتِ اولیاء'' میں لکھتے ہیں:

1۔ مجھے ایک مشکل درپیش تھی جس کا حل میرے لیے دشوار تھا لہٰذا میں شیخ ابوالقاسم کرمانی علیہ الرحمہ کی زیارت کے لیے طوس پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں اور عالمِ تنہائی میں میرا حال ایک ستون سے کہہ رہے ہیں۔ مجھے بغیر سوال کیے جواب مل گیا۔ میں نے پوچھا ''جناب شیخ! یہ آپ کسے کہہ رہے ہیں؟'' فرمایا ''ابھی ابھی اللہ تعالیٰ نے اس ستون کو زبان دی اور اس نے یہ سوال مجھ سے پوچھا (اور میں اس کا جواب دے رہا تھا)۔''

2۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں مہنا میں ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حسبِ عادت تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سفید کبوتر آیا اور قبر کے غلاف کے اندر چلا گیا۔ میں سمجھا کسی کا پالتو کبوتر اڑ کر چلا آیا ہے۔ غلاف اٹھا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا جس سے مجھے سخت تعجب ہوا۔ ایک رات شیخ مجھے خواب میں نظر آئے تو میرے پوچھنے پر فرمایا ''کبوتر میری صفائے معاملات ہے جو ہر روز میری ہم نشینی کے لیے زیرِ لحد آتا ہے۔''

راقم الحروف (الطاف محمود) قیامِ واہ کے عرصہ میں قریبی گاؤں گڑھی افغاناں میں پیر محمد اعظم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک بار سخت پریشانی کا سامنا تھا جو کسی صورت حل نہ ہو پا رہی تھی۔ لہٰذا خاص طور پر اپنی پریشانیوں کے حل کے لیے حاضر ہوا۔ اتنا عرصہ بہت قریبی تعلق رہنے کے باوجود کبھی ذاتی اور گھریلو معاملات اور پریشانیوں کا ذکر باہم نہ ہوا تھا۔ میرے شیخِ طریقت رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے:

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

کشف المحجوب میں حضرت داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے ساتھ بیتے ہوئے انکشافات کا تذکرہ فرماتے ہیں: باب ''کراماتِ اولیاء'' میں لکھتے ہیں:

1۔ مجھے ایک مشکل درپیش تھی جس کا حل میرے لیے دشوار تھا لہٰذا میں شیخ ابوالقاسم کرمانی علیہ الرحمہ کی زیارت کے لیے طوس پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کی مسجد میں تشریف فرما ہیں اور عالمِ تنہائی میں میرا حال ایک ستون سے کہہ رہے ہیں۔ مجھے بغیر سوال کیے جواب مل گیا۔ میں نے پوچھا ''جناب شیخ! یہ آپ کسے کہہ رہے ہیں؟'' فرمایا ''ابھی ابھی اللہ تعالیٰ نے اس ستون کو زبان دی اور اس نے یہ سوال مجھ سے پوچھا (اور میں اس کا جواب دے رہا تھا)۔''

2۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں مہنا میں ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حسبِ عادت تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سفید کبوتر آیا اور قبر کے غلاف کے اندر چلا گیا۔ میں سمجھا کسی کا پالتو کبوتر اُڑ کر چلا آیا ہے۔ غلاف اٹھا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا جس سے مجھے سخت تعجب ہوا۔ ایک رات شیخ مجھے خواب میں نظر آئے تو میرے پوچھنے پر فرمایا ''کبوتر میری صفائے معاملات ہے جو ہر روز میری ہم نشینی کے لیے زیرِ لحد آتا ہے۔''

راقم الحروف (الطاف محمود) قیامِ واہ کے عرصہ میں قریبی گاؤں گڑھی افغاناں میں پیر محمد اعظم شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک بار سخت پریشانی کا سامنا تھا جو کسی صورت حل نہ ہو پا رہی تھی۔ لہٰذا خاص طور پر اپنی پریشانیوں کے حل کے لیے حاضر ہوا۔ اتنا عرصہ بہت قریبی تعلق رہنے کے باوجود بھی ذاتی اور گھریلو معاملات اور پریشانیوں کا ذکر باہم نہ ہوا تھا۔ میرے شیخِ طریقت رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے:

"لوگ ہمارے پاس اس وقت آتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں اگر یہ لوگ فقراء کے پاس خوش وقتی کی حالت میں آئیں اور جب ان سے پوچھیں تو بتائیں کہ صرف ملنے کے لیے آئے ہیں تو اُن پر کبھی پریشانی نہ آئے۔" اس فرمان کی روشنی میں یہ نیت کر کے گیا کہ نہ تو پریشانیوں کا ذکر کرنا ہے اور نہ ہی دعا کے لیے کہنا ہے۔ حضرت نے مجھ سے کچھ سنے بغیر ہی ختم خواجگان منگوایا اور مجھے ایک جگہ دکھاتے ہوئے فرمایا "یہ پڑھا جائے تو اللہ تعالیٰ مہربانی فرما کر حاجت پوری فرما دیتا ہے۔" یہ لوگ ہیں جنھیں شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔ علامہ اقبال حضرت مجدد کے مزار پر حاضر ہوئے اور ان ورود انوار کے مشاہدہ ان الفاظ میں کیا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر   وہ خاک ہے کہ زیر فلک مطلع انوار

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے   اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار

حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے بعد وہ فیض جس طرح پردہ پوش ہو گیا لیکن اس کی ضرورت کے پیش نظر اس کے عام ہونے کی خواہش کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

اب وقت ہے کہ تیرا فیض عام ہوا ے ساقی

ابھی یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کے پاس فیض ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ چلتے ہیں اور قرآن پاک کے مطابق باقی مخلوق سے اسی بنا پر ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کی ایک جہت شریعتِ محمدی ﷺ پر عزیمت کے ساتھ عمل کرنا ہے اور دوسری جہت یقین محکم اور توکل علی اللہ پر ایسی پختگی ہے کہ وہ ماسواہ اللہ سے مکمل غنی اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ صرف پہلی جہت رکھنے والی شخصیات کی پہچان آسان ہے جبکہ دوسری جہت والوں کا پہچاننا ازحد مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ ایسے کامل انسانوں کی تلاش کے مشکل کام کی بجائے معروف بزرگوں، خاندانی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور گدی نشینوں کی غلام گردش کا شکار

ہونا سہل سمجھتے ہوئے اپنے جواہر ضائع کرتے ہیں۔ جو لوگ ان سلاسل سے وابستہ ہیں ان کا اگر سروے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پچانوے فیصد سے زائد لوگ باپ دادا کی وجہ سے ان گدیوں سے وابستہ ہیں، یہ وابستگان کبھی ان کی اہلیت کا ذکر نہیں کریں گے۔ باقی پانچ فیصد لوگ پہلے ہو چکے مریدوں سے جھوٹی سچی کرامتیں سن کر مرید ہو جاتے ہیں۔ پوری آبادی میں سے چند افراد ایسے ہوں گے جو فقط مشاہدہ الٰہی کے ذریعے حق الیقینی کی منزل طے کرنے کی غرض سے مرید ہوتے ہیں۔

یہ بات نہایت اعتماد اور ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ جن لوگوں کی ذات میں غنا اور بے نیازی ہے وہی اپنی آستینوں میں یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ جو شخص بے نیازی کے اس مقام پر فائز ہے اسے کیا پڑی ہے کہ ہماری طرف متوجہ ہو؟
علامہ اقبال انھیں لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں:

خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے

دراصل یہی کٹھن منزلیں ہمیں ایسے بندگانِ خدا سے دور رکھتی ہیں۔ یہ جو بات مشہور ہے کہ بابے چھپے ہوتے ہیں تو اس کی یہی وجہ سمجھ آتی ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق چاہیے ہوتا ہے جو بندے اور خدا کے درمیان حجابات اٹھا دے تو ان کے لیے یہ بابے نہ صرف مائل بہ کرم ہوتے ہیں بلکہ ان کی انتظار میں ہوتے ہیں۔ اگر انہیں طالب کی طلبِ صدق اور مضبوط قوتِ ارادی کا یقین ہو جائے تو بلا تامل پوری جھولی انڈیل دیتے ہیں۔ معمولی جائیداد کے لیے جھوٹ بولنے، مکر و فریب کرنے، وعدوں اور معاہدوں کی دھجیاں بکھیرنے، بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنے اور اپنے بچوں سے بڑوں کو گالیاں دلوانے والے اپنی پیری کو جتنا بھی وسیع کر لیں انہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور اس کے حبیب اکرم ﷺ کے حضور سے اس بے نیازی اور توکل سے حصہ ملنے کی کچھ توقع ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ پر توکل اور مخلوق سے بے نیازی ایک دن کے لیے خود پر طاری کر کے دیکھ لیجیے کہ

حصولِ فیض اور تعلق باللہ کتنا آسان یا مشکل ہے پھر اس جانب چلنے کا فیصلہ کیجیے۔

(جاری ہے)

بقیہ اسلام اور رسک مینجمنٹ

علیہ وسلم بڑی آسانی کے ساتھ وہاں سے نکل آتے ہیں۔ اسی طرح ہجرت کے دوران مدینہ منورہ جانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین دن تک غارِ ثور میں قیام کرنا اور مختصر شمالی راستے کی بجائے براستہ یمن طویل جنوبی راستے کا انتخاب فرمانا بھی خطرات کو کم کرنے کے لئے تھا۔ کیونکہ اس طریقے سے کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کے لئے شمالی راستے کو اختیار کیا، جس کی وجہ سے اُن کا وقت ضائع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو لے کر بآسانی مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

آج پوری دنیا میں رسک مینجمنٹ دوسرے علوم کی طرح باقاعدہ ایک علم (Science) کے طور پر متعارف کرایا جا رہا ہے، اسے مختلف شاخوں مثلاً ٹریولنگ میں تقسیم کرکے ہر ایک کی الگ وضاحت کی جارہی ہے۔ اس کے دائرہ کار کو وسیع کرنے، عام لوگوں تک اس کے بارے میں شعور و آگہی پیدا کرنے، اس کی اہمیت اُجاگر کرنے اور اس کے فوائد منتقل کرنے کی غرض سے دنیا بھر میں مختلف قسم کے کورسز کروائے جارہے ہیں اور باقاعدہ عملی و تربیتی پروگرامز اور سیمینارز کا انعقاد بھی ہو رہا ہے۔ انجینئرنگ، میڈیکل اور علم کے دوسرے تمام شعبہ جات میں اسے بطور ایک لازمی مضمون کے شامل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسلام میں رسک مینجمنٹ کے بارے میں مذکورہ بالا معلومات کی روشنی میں غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے منظم انداز میں نہ صرف رسک مینجمنٹ کا نظریہ دیا اور اس کی حقیقی اہمیت کو اجاگر کیا بلکہ اس کا عملی اطلاق بھی کرکے دکھایا۔ اسلام نے عقائد، عبادات اور معاملات ہر ایک میں رسک کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف اوقات میں رسک کو کور (cover) کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تحریر: علامہ قاری محمود الحسن اویسی قادری ☆

C_295 میں ترمیم کیوں؟

وطن عزیز پاکستان میں قرآن وسنت کی روشنی میں گستاخانِ انبیاءِ کرام کے لیے سزائے موت کا قانون بنا تو اہلِ ایمان کے دل باغ باغ ہوگئے۔ان کے قلوب واذہان مسرت وخوشی سے جھوم اٹھے اوران کی آنکھیں ٹھنڈک پاگئیں کہ اب کوئی دریدہ دہن محمِ آخرالزماں شفیعِ مجرماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والاصفات بلکہ کسی بھی نبی ورسول کی توہین، بے ادبی یا گستاخی کرنے کی جسارت وجرأت نہ کرنے پائے گا۔لیکن اسی ملکِ خداداد پاکستان میں جہاں مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چاہنے والے اور شیدائی خوش ہوئے وہاں جانے کیوں کچھ لوگ تڑپ اٹھے اورتب سے اب تک اس قانون میں ترمیم بلکہ تنسیخ کے درپے ہیں اوروقفے وقفے سے سر اٹھاتے رہتے ہیں لیکن جب بھی انہوں نے سر اٹھایا ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے'' کے مصداق غلامانِ مصطفیٰ نے ان کی سرکوبی کرڈالی۔آیئے ان لوگوں کے اعتراضات (شکوک وشبہات) کا بنظرِ انصاف ایک جائزہ لیتے ہیں۔پہلے ایک نظر اعتراضات پرڈال لیجئے پھران کا تجزیہ بھی کرینگے انشاءاللہ۔

پہلا اعتراض: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو رحمۃ للعالمین تھے۔اپنے دشمنوں اور راستے میں کوڑا کرکٹ ڈالنے والوں کو معاف فرمادیا کرتے تھے تو ہم سزا کیوں دیں؟

دوسرا اعتراض: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام لیا نہ ہی کسی کو سزا دلوائی۔

☆) 0321-5618894، خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرخان

تیسرا اعتراض :اس قانون کی وجہ سے بیرونی دنیا میں ہم وحشت گرد سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑایا جاتا ہے اور پاکستان کا وقار ختم ہو کر رہ گیا ہے۔

چوتھا اعتراض :اگر کسی سے گستاخانہ کلمات ادا ہو ہی جائیں تو ضروری نہیں کہ اس کی نیت بھی گستاخی کی ہو۔ ہو سکتا ہے اس سے غیر ارادی طور پر ایسے الفاظ صادر ہو گئے ہوں تو اس کے لئے بھی یہی سزا کیوں؟

پانچواں اعتراض :اگر کوئی اپنے الفاظ پر تہ دل سے نادم ہو کر توبہ کی طرف مائل ہو تو اسے تو اس سزا سے مستثنیٰ ہونا چاہئے۔

چھٹا اعتراض :اس قانون کی آڑ میں لوگ ذاتی دشمنوں پر جھوٹا الزام عائد کر کے انہیں تختۂ دار تک پہنچا دیتے ہیں۔

ساتواں اعتراض: یہ قانون اقلیتوں کے سر پر ایک ننگی تلوار ہے۔

آٹھواں اعتراض :ایسے مقدمات میں اگر ملزم بے گناہ بھی ہو تو جج صاحبان عوامی دباؤ کے پیش نظر صحیح فیصلہ نہیں دے سکتے۔

جواب نمبر **1**: اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمتہ للعالمین ہیں اور آپ نے جن لوگوں کے جرائم اور بے ادبیوں کو قابلِ معافی سمجھا اپنے حقوق معاف کرنے کا اختیار رکھتے ہوئے معاف فرما دیا اس لئے کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہر شخص اپنے حقوق معاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن اگر بندہ خود معاف نہ کرے تو بندے تو بندے رہے اللہ بھی معاف نہیں فرماتا۔ اس لئے آج کے دور میں اگر کوئی بدبخت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کا مرتکب ہو تو امت اسے معاف کرنے کی کسی صورت بھی مجاز نہیں۔

جواب نمبر **2**: جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے معافی کی مثالیں دینے والوں

کو شاید یہ معلوم نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے حکم سے اپنے کئی گستاخوں کو قتل بھی کروایا ہے۔ بغیر کسی تفصیل کے چند نام پیش خدمت ہیں جنہیں آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکماً قتل کروایا:

۱۔ کعب بن اشرف یہودی کو محمد بن مسلمہ ﷺ نے قتل کر کے حکم کی تعمیل فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ ابو رافع عبداللہ بن ابی الحقیق کو عبداللہ بن عتیق ﷺ نے قتل کر کے تعمیل حکم فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

۳۔ ایک گستاخ عورت کو حضرت زبیر ﷺ نے قتل کر کے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم پورا کیا۔ (مصنف عبدالرزاق)

۴۔ ایک اور گستاخ عورت کو قتل کرنے کا شرف حضرت خالد بن ولید ﷺ کو حاصل ہوا۔ (مصنف عبدالرزاق)

۵۔ ایک گستاخ مرد کو بھی حضرت خالد بن ولید ﷺ ہی نے حکمِ رسول پر قتل کیا۔ (دلائل النبوۃ)

۶۔ ایک گستاخ عورت کو قتل کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تو اسی کے قبیلہ کے ایک شخص نے اس کا کام تمام کر دیا۔ (شفاء شریف)

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام معافی کا اعلان فرمانے کے باوجود چار مردوں اور دو عورتوں کے قتل کا حکم دیا جن میں سے:

۷۔ عبداللہ ابن خطل کو غلاف کعبہ سے نکال کر سعید بن حارث ﷺ نے قتل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ (نسائی شریف)

۸۔ مقیس بن صبابہ کو بازار میں صحابہ کرام ﷺ نے قتل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

خوش کیا۔ (نسائی شریف)

جب کہ باقی دو حضرات عکرمہ بن ابی جہل اور عبداللہ بن ابی السرح قتل ہونے سے پہلے ہی بارگاہِ مصطفیٰ میں حاضر ہو کر معافی کے خواستگار ہوئے اور مشرف باسلام ہو کر غلامانِ مصطفیٰ میں شامل ہو گئے اور یوں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادرِ رحمت میں ہمیشہ کے لئے پناہ لے لی۔

یہ وہ بدبخت تھے جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکمِ خاص سے قتل کیا گیا۔

ان دلائل سے آج کا کوئی ''روشن خیال'' اور بزعمِ خویش ''اسلامک سکالر'' یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ٹھیک ہے جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا انہیں قتل کر دیا گیا لیکن ہمیں تو حکم نہیں دیا گیا تو ہم کسی کو یہ سزا کیسے دے سکتے ہیں۔ جواباً گزارش ہے کہ ان دلائل سے اولاً تو ہمیں گستاخانِ رسول کی سزا معلوم ہو گئی آئندہ جو بھی اس جرم میں گرفتار ہو گا اس کی سزا ایسی ہو گی۔ ثانیاً اگر کوئی بضد ہو کہ بغیر حکم کے یہ سزا نہیں دی جا سکتی تو اسے درج ذیل دلائل پر غور کرنا چاہئے جن میں صحابہ کرام ﷺ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیاتِ طیبہ میں خود ہی گستاخانِ رسول کو ٹھکانے لگا دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس عمل کو نہ تو غلط کہا اور نہ ہی قصاص یا دیت دلوائی۔ بلکہ ان کے عمل کو پسند فرمایا۔

۱۔ سیدنا عمر فاروق ﷺ نے ایک منافق (بظاہر مسلمان) کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ تسلیم نہ کرنے پر قتل کر ڈالا آپ کے اس عمل کو نہ صرف مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سراہا بلکہ خود خدا نے بھی اپنی لاریب کتاب میں تائید کر دی۔ (سورۃ النساء۔ ۶۵)

۲۔ ایک نابینا صحابی نے اپنے دو بچوں کی ماں (اپنی باندی) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گستاخی کرنے پر قتل کر دیا۔ (ابوداؤد شریف)

۳۔ ایک یہودیہ کو گستاخی پر ایک صحابی نے گلا گھونٹ کر ابدی نیند سلا دیا۔ (مشکوۃ شریف)

ممکن ہے ان روشن دلائل کے بعد کوئی عادی زدہ کلین شیو یہ کہہ بیٹھے کہ چلیں صاحب صحابہ نے جو جو کیا انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید تو حاصل ہو گئی۔ آپ بعد کی کوئی دلیل لائیے کہ کسی کو توہین رسالت پر یہ سزا دی گئی ہو۔ تو لیجئے قارئین کرام! دلائل حاضر ہیں ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں والی یمن مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہ نے گانوں میں توہین رسول کرنے والی ایک خاتون کے دانت بھی تڑوا دیئے اور اس کے ہاتھ بھی کٹوا دیئے۔ جب یہ خبر تاجدار صداقت ، خیر امت اور بعد الانبیاء افضل البشر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کاش تم ایسا نہ کرتے تو میں یقیناً اس کے قتل کا حکم دیتا۔ (شفاء شریف) معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک بھی شاتم رسول کی سزا قتل ہی ہے۔

۲۔ ایک شخص امامت کرتے ہوئے توہین رسالت کی نیت سے سورۃ عبس کی ابتدائی آیات پڑھتا تھا۔ جب تاجدار عدالت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے اس کی گردن اتروا دی۔ (روح البیان)

ایسے روشن اور کثیر دلائل کے بعد بھی اگر کوئی توہین رسالت کے مرتکب کی سزا ''قتل'' ماننے کے لئے تیار نہیں تو پھر اس دن کے لئے کوئی جواب سوچ لے جس دن مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن کے سوا کہیں پناہ نہ ملے گی۔ یہاں ایک اور شبہ پیدا کیا جا سکتا ہے کہ رحمۃ للعالمین ہوتے ہوئے آپ کسی سے ذاتی انتقام لے کیسے سکتے ہیں۔ قارئین کرام! یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی حیثیت فقط ایک فرد کی نہیں بلکہ آپ کی ذات بابرکات تو اسلام ، ایمان ، قرآن بلکہ خود رحمٰن کی پہچان کا نام ہے۔ جب ایسا ہے تو آپ کی بے ادبی دین کی بے ادبی بھی ہو گی

اور اسلام کی بھی۔ قرآن کی بھی اور خود رحمٰن کی بھی۔ کیا صدر پاکستان کی توہین کو پاکستان کی توہین نہیں سمجھا جاتا۔ اور کمرہ عدالت میں جج سے الجھنے کو توہین عدالت نہیں تصور کیا جاتا۔

یہاں پر ایک اور مغالطہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب آپ کی توہین اسلام، ایمان، قرآن اور رحمٰن کی توہین ہے تو پھر آپ نے بعض لوگوں کو معاف کیوں کر دیا۔ جواب بڑا آسان ہے کہ آپ نے رب ذوالجلال کے دیئے ہوئے علم سے جس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھا رب ذوالجلال کے دیئے ہوئے اختیار سے معاف فرما دیا۔ جس کا جتنا اور جس نوعیت کا جرم تھا آپ نے اس کے مطابق فیصلہ فرما دیا۔ ہمیں اس میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

یہاں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں کہ بعض حضرات اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام نہیں لیا البتہ جن لوگوں نے آپ کے مشن میں رکاوٹ ڈالی ان کو آپ نے کبھی معاف نہیں کیا حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ نے اپنے مشن کے مخالفین کے ساتھ ہمیشہ میدانِ جنگ میں مقابلہ و مقاتلہ کیا جبکہ اپنے ذاتی گستاخوں کو حکماً قتل کروایا۔ آپ کی ذات کی حیثیت اوپر واضح کی جا چکی ہے۔

جواب نمبر 3: تیسرے اعتراض کے جواب میں گزارش ہے کہ بیرونی دنیا کے ڈر سے کیا ہم ناموسِ رسالت کے تحفظ سے ہاتھ اٹھا لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گستاخوں کو کھلی چھٹی دے دیں؟ بیرونی دنیا اگر کل ہم سے خدا کو ایک ماننے پر ناراض ہو جائے تو کیا ہم خدا کو ماننا چھوڑ دیں گے؟ دوسری بات یہ ہے کہ بیرونی دنیا اپنے قوانین کیا ہم سے پوچھ کر اور ہماری پسند و ناپسند کو سامنے رکھ کر بناتی ہے؟ نہیں نا! تو ہم کس اصول کے تحت ان کے جذبات کے پابند رہیں؟ تیسری بات یہ کہ ان کا اپنا کردار کتنا شفاف

ہے۔ عراق، فلسطین، افغانستان اور کشمیر میں جو کچھ بیرونی دنیا کر رہی ہے دہشت گردی وہ ہے نہ کہ ناموسِ رسالت کا تحفظ۔ جہاں تک پاکستان کے وقار کا تعلق ہے خاکم بدہن اس قانون کو ختم کر کے اگر گستاخوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے اور گستاخیوں کو عام ہونے دیا جائے تو کیا پاکستان کا کھویا ہوا وقار بحال ہو جائے گا۔ ٹھنڈے دل سے سوچئے گا۔

جواب نمبر 4: چوتھے اعتراض کے بارے میں جان لیں کہ توہین کا اعتبار نیت پر نہیں الفاظ اور عرفِ عام میں ان کے مفہوم پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے والد صاحب کو گدھا کہہ دے اور والد صاحب کے پوچھنے پر کہے کہ میری نیت آپ کی توہین کرنا نہیں بلکہ آپ کی شرافت کا اظہار ہے۔ گدھا بھی شریف جانور ہے اور آپ بھی شرافت کا پیکر ہیں تو والد اس کی نیت کو دیکھے گا یا الفاظ کو۔ جب ما و شما کے لیے بولے جانے والے الفاظ ہی ہماری عزت یا ذلت کا فیصلہ کرتے ہیں نیت کا دخل نہیں مانا جاتا تو انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے لیے کلیہ و قاعدہ اس سے جدا کیوں۔ نیز قرآنِ مجید و فرقانِ حمید سے بھی یہی اصول ملتا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ صحابۂ کرام ﷡ نے ''راعنا'' کے الفاظ کبھی بھی گستاخی کی نیت سے نہ کہے تھے لیکن رب العزت نے انہیں بھی یہ کلمہ کہنے سے منع فرما دیا۔ اسکے بعد اگر کوئی اچھی نیت سے بھی کہتا تو گستاخی ہی ہوتی حالانکہ یہ کلمہ تو فی نفسہ گستاخی والا تھا بھی نہیں۔ آج اگر کوئی گستاخانہ کلمات بھی کہہ جائے اور پھر نیت درست ہونے کی آڑ لے تو اسے کیسے معاف کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر نیت اور ارادے کی اچھائی برائی کو درمیان میں ڈال دیا جائے تو یہ گستاخوں کو ایک ہتھیار تھما دینے کے مترادف ہوگا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی گستاخی کرے گا اور پھر غیر ارادی طور پر ایسا ہو جانے کا عذر کر کے چھوٹ جائے گا۔

جواب نمبر 5: پانچویں اعتراض کے حوالے سے عرض ہے کہ توبہ کا معاملہ سمجھنے سے پہلے دو

اصطلاحات کا جان لینا ضروری ہے:

(۱)۔ لزومِ کفر (۲)۔ التزامِ کفر

لزومِ کفر کے معنی ہیں "کفر کا لازم ہو جانا" اور التزامِ کفر کے معنی ہیں "کفر کو اپنے اوپر لازم کر لینا" ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ خود قائل کو اپنے ادا کردہ کلمات کے مفہوم کا پتہ نہ ہو۔ یہ لزومِ کفر کی صورت ہے۔ یعنی اس کے الفاظ تو کفریہ کہلائیں گے مگر اسے کافر نہیں کہا جائے گا۔ اسے اس کے الفاظ کی حقیقت بتا کر توبہ کی طرف راغب کیا جائے گا۔ اگر اپنے الفاظ کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً توبہ کر لے تو ٹھیک ہے۔ اور اگر ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے توبہ سے گریزاں رہے تو اس پر التزامِ کفر متحقق ہو جائے گا اور اب وہ کافر کہلائے گا اور سزا کا مستحق بھی ٹھہرے گا۔ اگر کسی شخص سے شانِ انبیاء میں عدمِ علم کی بنیاد پر کفریہ کلمات ادا ہو جائیں اور قوی دلائل و قرآئن سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ قائل کو معانی کا علم نہ تھا تو ایسے شخص کو سمجھایا جائے گا اور توبہ و رجوع کا موقع دیا جائے گا۔ اگر توبہ و رجوع کرے تو بہتر ورنہ التزامِ کفر متحقق ہو جائے گا اور وہ شخص مرتد ہو کر واجب القتل قرار پائے گا۔

جہاں تک صریح اور واضح الفاظ میں توہین و گستاخی کے مرتکب کی توبہ کا تعلق ہے اس کی جمہور فقہا کے نزدیک توبہ نہیں اور وہ واجب القتل ہے جبکہ فقہا کے ایک محدود طبقے کے نزدیک اگر کوئی فی الواقع اپنے شنیع و قبیح فعل پر نادم ہو کر مائل بہ توبہ ہو تو اس سے توبہ کرائی جائے گی تاہم سزا وہی رہے گی یعنی قتل ہی کیا جائے گا۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ جب سزا معاف نہیں تو توبہ کیوں کرائی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گستاخی کرنے والا اگر پہلے مسلمان ہو تو گستاخی کرتے ہی وہ مرتد ہو جاتا ہے اب نہ اسکی نمازِ جنازہ جائز رہتی ہے اور نہ کفن دفن۔ جب توبہ کرے گا تو اسکی مسلمانی واپس آ جائیگی اور بعد از قتل اسکی نمازِ جنازہ

پڑھنا بھی جائز ہو جائیگی اور کفن دفن بھی۔ نیز اگر سچے دل سے توبہ کی ہوگی تو بروز حشر بھی کام آسکتی ہے۔

جواب نمبر 6: چھٹے اعتراض کی بابت التماس ہے کہ اگر کوئی کسی پر جھوٹا الزام لگاتا ہے تو عدالت کا کام ہے کہ صحیح صورتِ واقعہ تک پہنچے۔ حقیقتاً اگر الزام جھوٹا ہو تو الزام لگانے والے کے لئے بھی شریعت میں مفتری کی سزا موجود ہے۔ جھوٹا الزام لگانے والوں اور ذاتی دشمنی کی بنیاد پر 295-C کی آڑ لینے والوں کو قانونِ شریعت کے مطابق سرِ عام سزا دی جائے تاکہ آئندہ کسی کو ایسی جرأت نہ ہو۔ اس مسئلہ کا یہ حل نہیں کہ توہینِ رسالت کا قانون ہی بدل دیا جائے یا ختم کر دیا جائے۔ ہمارے تھانوں میں روزانہ کتنی جھوٹی FIR درج کرائی جاتی ہیں اور بے گناہوں کو گناہ گار ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو کیا FIR درج کرنا ہی بند کر دیا جائے۔

جواب نمبر 7: ساتویں اعتراض کے حوالے سے یہ جان لیں کہ یہ تصور ہی غلط اور خود ساختہ ہے کہ یہ قانون صرف اقلیتوں کے لئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قانون کا اطلاق ہر اس فرد پر ہوتا ہے جو گستاخی کا مرتکب ہو اس کا تعلق چاہے اقلیت سے ہو چاہے اکثریت سے۔ مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلموں سے۔ پاکستانیوں سے ہو یا غیر پاکستانیوں سے اور وہ فرد مرد ہو یا عورت۔

نیز یہ قانون ننگی تلوار نہیں بلکہ ننگی تلوار سے تحفظ کی ضمانت ہے۔ اس قانون سے پہلے اگر کسی پر گستاخی کا الزام لگتا تو بغیر تحقیق کے اور ملزم سے کوئی وضاحت لئے بغیر ہر کوئی اس کی گردن اڑا دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ لیکن اب ملزم جب تک عدالت کے روبرو مجرم ثابت نہ ہو جائے سزا سے محفوظ رہتا ہے۔ اور لوگ بھی دست درازی سے باز رہتے ہوئے عدالتوں کا ہی رخ کرتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ یہ قانون صرف جناب رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی گستاخی و بے ادبی کرنے والوں کے لئے ہے۔

جواب نمبر 8: آٹھویں اعتراض کے متعلق گزارش ہے کہ اگر یہ قانون اس لئے قابلِ تنسیخ یا ترمیم ہے کہ جج صاحبان عوامی دباؤ کے پیشِ نظر درست اور مبنی بر انصاف فیصلہ نہیں کر سکتے تو پھر تو وہ سب قوانین بھی ختم کرنا پڑیں گے جن کا درست اور مبنی بر انصاف فیصلہ کرتے ہوئے کبھی رشوت کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو کبھی سفارش کا۔ کبھی دشمنی کا خوف آڑے آجاتا ہے تو کبھی کسی عزیز کی ہمدردی قلم کا رخ موڑ دیتی ہے۔ اور یہ بھی بتایئے گا کہ ان قوانین کا کیا کیا جائے جن کا درست فیصلہ سامنے آنے کے امکان پر یا تو جج کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے یا انہیں برطرف کر دیا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ عوامی دباؤ تلے دب کر درست فیصلہ نہ کر سکنا جج کی کمزوری یا غلطی تو ہو سکتی ہے قانون کی نہیں۔ لہٰذا جج کی اصلاح کے بارے میں سوچا جائے نہ کہ قانون کے بارے میں۔ نیم حکیم (ڈاکٹر) کے غلط علاج پر ڈاکٹر کا معاملہ سلجھانے کی بجائے ہسپتال بند کروا دینا کونسی عقلمندی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر جج (نہ صرف جج بلکہ ہر مسلمان) کوئی بھی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اس عدالت کا تصور ذہن میں رکھ لیں کہ جس میں سب کے فیصلوں کا فیصلہ احکم الحاکمین نے کرنا ہے تو عوامی دباؤ ان شاء اللہ ایمانی بہاؤ میں بہہ جائے گا۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

شیخ الحدیث والتفسیر علامہ غلام رسول قاسمی قادری نقشبندی ☆

غوث پاک کی گیارہویں

(شریعت کی روشنی میں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اولاً حضور سیدنا قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا وصال شریف 561ھ میں 90 سال کی عمر شریف میں ہوا تھا (اخبار الاخیار صفحہ ۳۶)۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ماثبت من السنۃ میں وصال شریف کی تاریخ 11 ربیع الثانی لکھی ہے۔ ثانیاً آپ رحمۃ اللہ علیہ ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو نبی کریم ﷺ کو ایصال ثواب کرتے تھے (قرۃ الناظرہ صفحہ ۱۱)۔ اس مناسبت سے ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو گیارہویں شریف کے نام سے آپ کا عرس منانے کا مسلمانوں میں رواج چلا آرہا ہے۔ اور ہر سال گیارہ ربیع الثانی کو بڑی گیارہویں شریف منائی جاتی ہے۔ ثالثاً گیارہویں شریف ایک اصطلاح ہے جس کی حقیقت حضور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا ایصال ثواب ہے۔ اہل علم وفن اچھی طرح جانتے ہیں کہ حقیقت اگر دلائل سے ثابت ہو تو اصطلاح میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ رابعاً مطلق ایصال ثواب کا جواز جب دلائل سے ثابت ہے تو گیارہویں شریف اسی ایصال ثواب کا ایک فرد ہے لہذا اس فرد کے جواز کے لئے الگ دلائل طلب کرنا جہالت ہے۔

خامساً شریعت میں ہر وہ کام جائز ہوتا ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کی

☆) 0322-7110710، 0303-7931327

تمام اشیاء تمہارے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں (بقرۃ:۲۹)۔ تو گویا پیدا ہونے کے لحاظ سے ہر چیز ہمارے لیے قابل افادہ اور جائز الاستعمال ہے۔ البتہ ان جائز چیزوں میں سے جس چیز سے شریعت روک دے گی ہمیں رکنا پڑے گا۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے **قد فصل لکم ما حرم علیکم** یعنی جو چیزیں تم پر حرام ہیں ان کی تفصیل ہم نے علیحدہ بیان کردی ہے (انعام:۱۹۹)۔

تو گویا جن چیزوں سے منع کردیا جائے وہ ممنوع ہوجائیں گی اور باقی چیزیں اپنی اصلیت پر قائم رہتے ہوئے جائز کی جائز رہیں گی۔ جب تک ان کے بارے شرعی حکم ممانعت کا نہ ملے ان سے منع نہیں کیا جاسکتا۔

محبوب کریم ﷺ کی احادیث سے بھی یہی قاعدہ ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً **الحلال ما احل اللہ فی کتابہ و الحرام ما حرم اللہ فی کتابہ و ما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ** یعنی حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کہا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کہا اور جس سے خاموشی اختیار کی وہ معاف ہے (رواہ ابن ماجہ، ترمذی، مشکوۃ صفحہ ۳۶۷)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ **عن ابن عباس قال کان اھل الجاھلیۃ یاکلون اشیاء ویترکون اشیاء تقذرا فبعث اللہ نبیہ و انزل کتابہ و احل حلالہ و حرم حرامہ فما احل وھو حلال و ما حرم فھو حرام وما سکت عنہ فھو عفو و تلا قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ الایہ** یعنی جاہلیت کے زمانے میں لوگ کچھ چیزیں کھالیتے تھے اور کچھ چیزوں سے نفرت کی وجہ سے انہیں نہیں کھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو بھیجا اور اپنی کتاب کو نازل فرمایا، اور حلال کو حلال قرار دیا اور حرام کو حرام قرار دیا۔ اب جس چیز کو اللہ نے حلال کہا وہ حلال ہے اور جس چیز کو حرام کہا وہ حرام ہے۔ مگر جس چیز کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی ہے وہ معاف ہے۔ پھر آپ نے قرآن کی یہ آیت

تلاوت کی۔ فرمادو کھانے والا جو کھاتا ہے اس کے حرام ہونے کی کوئی دلیل میں اپنے اوپر نازل ہوئی والی وحی میں نہیں پاتا سوائے اس جانور کے جو بغیر ذبح کئے مرجائے (ابوداؤد، مشکوٰۃ صفحہ ۳۶۲)۔

ایک اور حدیث میں ہے: ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرماۃ فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا و سکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا یعنی اللہ نے کچھ چیزیں فرض کی ہیں انہیں ضائع مت کرو اور کچھ چیزیں حرام کی ہیں ان سے دور رہو اور حدود قائم کی ہیں ان سے تجاوز مت کرو اور کچھ چیزوں کے بارے میں خاموشی اختیار فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو بھولا نہیں، تم ان کے بارے میں بحث میں مت پڑو (دارقطنی، مشکوٰۃ صفحہ ۳۲)۔

ایک اور حدیث میں ہے: ان اعظم المسلمین جرما من سئل عن شیء لم یحرم فحرم من اجل مسئلتہ یعنی مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جسے اللہ نے حرام نہیں کیا تھا، مگر اس شخص کے سوال کرنے کی وجہ سے وہ چیز حرام کردی گئی (بخاری صفحہ ۱۰۸۲)۔

ان دلائل سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے سکوت فرمایا ہو وہ مباح اور معاف ہے۔

تو گویا یہ مسئلہ طے پا گیا کہ ہر چیز اپنی اصلیت کے لحاظ سے مباح ہے۔ ممانعت کے لئے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اس اصول اور قاعدۂ کلیہ کے عملی طور پر استعمال کی طرف آیئے۔ گیارہویں شریف، آذان سے پہلے یا بعد میں صلوٰۃ وسلام پڑھنا، کھڑے ہو کر درود شریف پڑھنا، سوئم یا قل خوانی، چالیسواں، بزرگوں کے عرس، میلاد شریف کی محفل اور جلوس وغیرہ۔ یہ سب چیزیں بنیادی طور پر مباح ہیں البتہ علماء و اولیاء علیہم الرضوان کے عمل سے بعض چیزیں درجۂ استحباب کو پہنچ گئی ہیں (ما راہ المومنون حسنا فھو عند

اللہ حسن یعنی جس کام کو مومن اچھا سمجھیں وہ اللہ کو بھی اچھا لگتا ہے۔ رواہ محمد مرفوعاً صفحہ ۱۴۴)۔ لہٰذا ان چیزوں سے منع نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کوئی منع کرے تو اسے ممانعت کی دلیل پیش کرنا ہوگی۔ تماشا تو یہ ہے کہ منکرین حضرات گیارہویں وغیرہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ حرام کی تعریف تو یہ ہے کہ ما حرم اللہ فی کتابہ یعنی جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو (مشکوٰۃ صفحہ ۳۶۷)۔ لہٰذا ان حضرات پر لازم ہے کہ ان چیزوں کی حرمت ثابت کرنے کے لیے قرآن وسنت سے نص پیش کریں۔ ورنہ خود شارع بننے سے اجتناب کریں۔

آج ہر مکتبہ فکر کے لوگ طرح طرح کے جلسے کرتے رہتے ہیں۔ حکومتوں کے خلاف جلوس نکالتے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے مدارس میں سالانہ تقسیم اسناد کے جلسے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی مشکوٰۃ شریف کا افتتاحی جلسہ رکھ لیتے ہیں اور کبھی بخاری شریف کا اختتامی جلسہ رکھ دیتے ہیں۔ کبھی اپنے مرکزی مدارس کے صد سالہ جشن مناتے ہیں اور کبھی سیرت کے جلسے منعقد کرتے ہیں۔ کوئی اٹھ کر نبی کریم ﷺ کو امام اعظم لکھ دیتا ہے اور کبھی کوئی آپ ﷺ کو امام اہل حدیث کہہ دیتا ہے۔ کہیں ''امام اہل حدیث کانفرنس'' کے اشتہارات دیواروں پر چسپاں نظر آتے ہیں اور کبھی جہاد کانفرنس کے پوسٹر اور بینر آویزاں دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں حق چار یار کا نعرہ بلند ہو رہا ہوتا ہے اور کہیں تاج وتخت ختم نبوت زندہ باد کی گونج آ رہی ہوتی ہے۔

کیا کوئی صاحب عقل ان سب باتوں کو قرآن وسنت کی تصریحات سے ثابت کر سکتا ہے؟ یہ سارے کام کرنے والے ہمارے وہ دوست ہیں جو دن رات ہمیں میلاد شریف اور گیارہویں شریف سے منع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم سے قرآن وسنت سے دلائل کا مطالبہ کیا جاتا ہے مگر خود ان دوستوں کے پاس مذکورہ بالا تمام کام کرنے کے جواز کے لئے نہ قرآن موجود ہے اور نہ حدیث۔

غور فرمایئے آخر یہ چکر کیا ہے؟ یہ خود کریں تو جائز اور اگر ہم کریں تو بدعت۔ جو باتیں ہم نے لکھیں ہیں اگر یہ جھوٹ ہے تو جھوٹے پر لعنت۔ اور اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو پھر یہ دوہرا معیار آخر کیوں؟

گیارہویں شریف میں کیا ہوتا ہے؟

گیارہویں شریف کی محفل میں تلاوت قرآن پاک، نعت شریف، درود شریف، اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کا ایصال ثواب ہوتا ہے۔ آپ دوبارہ دیکھ لیجئے مذکورہ بالا چیزوں میں سے ہر ایک چیز پر فرداً فرداً غور فرمایئے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ناجائز نہیں۔ بلکہ ہر چیز محمود اور پسندیدہ ہے۔

قرآن کی تلاوت کے اچھی چیز ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے خود اپنی نعت سنا کرتے تھے۔ (بخاری، مشکوۃ صفحہ ۴۱۰)

درود شریف کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے صلوا علیه وسلموا تسلیما یعنی میرے محبوب پر درود وسلام پڑھا کرو۔

نبی کریم ﷺ ہر سال دو قربانیاں کیا کرتے تھے ایک اپنی طرف سے اور ایک اپنی امت کی طرف سے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہر سال دو قربانیاں کیں۔ حضرت حنش رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ مجھے حضور ﷺ نے وصیت فرمایا تھی کہ دو قربانیاں دیا کرو ایک اپنی طرف سے اور دوسری حضور ﷺ کی طرف سے (مشکوۃ صفحہ ۱۲۸)۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھ کر اپنی مرحومہ ماں کے نام کا کنواں کھدوایا۔ اور اس کنویں کا نام "سعد کی ماں کا کنواں" رکھا۔

یہی وہ سارے کام ہیں جو گیارہویں شریف میں ہوا کرتے ہیں۔ یعنی تلاوت،

نعت، درود شریف اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کا ایصال ثواب۔ الحمد للہ ہم نے ہر کام کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

گیارہویں شریف کی نسبت

ہمارے کچھ دوست کہتے ہیں کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ پھر گیارہویں شریف یا گیارہویں شریف کے چاول یا بکرے وغیرہ کو غوث اعظم کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ اللہ کریم فرماتا ہے **انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل به لغیر الله** یعنی اللہ نے تمہارے اوپر مردار خون، خنزیر کا گوشت اور ہر وہ چیز منع کر دی ہے جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

چونکہ گیارہویں اور بکرا وغیرہ بھی غیر اللہ کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں لہذا قرآن کی اس آیت کی روشنی میں یہ بھی خنزیر کی طرح حرام ہے۔ اب ایسے بکرے کو بے شک بسم اللہ پڑھ کر ذبح کریں۔ وہ پھر بھی حرام ہے۔ جس طرح کتے کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرنے سے بھی وہ حرام ہی رہتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور غوث اعظم ؓ کی طرف گیارہویں یا بکرے کی نسبت مجازی ہوتی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ چاول یا بکرے کا ثواب حضور غوث اعظم کے لئے ہے۔ جسے ایصال ثواب کرنا ہو اس کی طرف بکرے وغیرہ کی نسبت کر دینا جائز ہے۔ جس طرح حضرت سعد نے کنواں کھدوا کر اسے اپنی ماں کی طرف منسوب کر دیا تھا۔

مجازی نسبت کی بے شمار مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔ مثلاً شفا دینے اور مردے زندہ کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف (آل عمران:۴۹)۔

بیٹا عطا کرنے کی نسبت حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف (مریم:۱۹)۔

پرورش کرنے کی نسبت ماں باپ کی طرف (بنی اسرائیل:۲۴)۔

حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ان المساجد للہ (مسجدیں اللہ کی ہیں) مگر نبی کریم ﷺ کی مسجد کو مسجد نبوی کہا جاتا ہے۔ اب اگر وما اھل بہ کے عموم کو دیکھا جائے تو اسے نبی کی مسجد نہیں بلکہ اللہ کی مسجد ہونا چاہیے۔ اور شہر کا نام مدینۃ النبی نہیں بلکہ مدینۃ اللہ ہونا چاہیے۔

ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین (یعنی میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہیں)۔ اس آیت شریفہ میں نماز، قربانی، زندگی اور موت کی مجازی نسبت بندے کی طرف ہے اور عبادت ہونے کے لحاظ سے اس کی نسبت اللہ کریم کی طرف ہے۔ اس آیت میں مجاز اور حقیقت کا بہترین امتزاج موجود ہے۔ اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ رمضان اللہ کا مہینہ ہے اور شعبان میرا مہینہ ہے۔ شعبان کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف مجازی ہے۔ ورنہ ہر مہینہ اللہ ہی کا مہینہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ الا اصلی بکم صلوۃ رسول اللہ ﷺ (یعنی اے لوگو کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کے دکھاؤں؟ (ترمذی جلد ا صفحہ ۳۵، ابوداؤد جلد ا صفحہ ۱۰۹)۔ اس حدیث شریف میں نماز کو نبی کریم ﷺ کی نماز کہا گیا ہے۔ یہ مجازی نسبت ہے۔

نبی کریم ﷺ ہر سال دو قربانیاں دیتے تھے اور ذبح کرتے وقت فرماتے تھے۔ محمد اور اس کی امت کی طرف سے بسم اللہ اللہ اکبر۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ بسم اللہ اللہ اکبر یا اللہ یہ میری طرف سے ہے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے ہے جو قربانی نہیں دے سکتے (مشکوۃ صفحہ ۱۲۸)۔

اس حدیث پر غور فرمایئے ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے اپنا اور اپنی امت کا نام بھی لیا ہے لیکن کیا کوئی شخص یہ بدگمانی کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا ہے لہٰذا یہ جانور حرام ہے؟ یہاں

ہم اہل اسلام کے بارے میں بدگمانی سے کام لینے والوں اور انہیں زبردستی مشرک ثابت کرنے والوں کو للکارتے ہیں کہ جس طرح اس حدیث شریف کو سمجھنے کے لیے تطبیق، حسن ظن، معاملہ فہمی اور تمیز سے کام لیتے ہو اسی طرح محبوب کریم ﷺ کی امت کے بارے میں بھی تمیز سے کام لیجیے اور محض غیر اللہ کا لفظ آتے ہی شرک، شرک کا واویلا کرنے کا خارجیانہ مظاہرہ بند فرمائیے۔ بخدا ہم پوری صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ حضرات نہ صرف علم سے بے گانہ ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حد درجہ کے کند ذہن بھی ہیں۔

اسی طرح ہم روزمرہ کی بول چال میں کثرت سے مجاز کا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً فلاں کا گھر، فلاں کی بھینس، قربانی کے بکرے کو بھی فلاں آدمی کا بکرا کہا جاتا ہے۔ اسے خدا کا بکرا کوئی نہیں کہتا۔ اسی طرح فلاں کا بیٹا، فلاں کی بیوی۔ اب اگر ہر چیز ہر لحاظ سے خدا کی ہے تو پھر بیوی بھی خدا کی ہونی چاہیے۔ اور ہمارے نام نہاد موحد دوستوں پر ان کی بیویاں حرام ہونی چاہئیں۔

وما اھل بہ لغیر اللہ کا صحیح مفہوم

اس آیت کا تعلق ذبح کرنے سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ ذبح کے وقت جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا جائے مثلاً فلاں بزرگ یا پیر کے نام سے ذبح کرتا ہوں تو ایسا جانور حرام ہے۔

اس کے برعکس اگر جانور پر ایصال ثواب کی نیت سے کسی بزرگ کا نام بولا جائے یا قربانی کے جانور پر قربانی دینے والے کا نام بولا جائے اور بعد میں ذبح کرتے وقت بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر ذبح کر دیا جائے تو یہ جانور بلاشبہ حلال ہے۔ اسے کتے سے تشبیہ دینا بہت بڑی گندگی اور تلبیس ہے۔ کتا پیدائشی حرام ہے۔ جب کہ بکرا پیدائشی حلال ہے۔ کتے اور کالے کوے پر بسم اللہ پڑھنے سے وہ حلال نہیں ہو سکتے جب کہ بکرے پر بسم اللہ پڑھنے سے بکرا

حلال ہو جاتا ہے۔

اس بات پر پوری امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اس آیت کا تعلق ذبح کرنے سے ہے۔ تفسیر قرطبی، جلد ۲ صفحہ ۲۱۹، تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۱۹۲، تفسیر خازن جلد ا صفحہ ۱۱۲، تفسیر مدارک علی حاشیہ خازن جلد ا صفحہ ۱۱۲، تفسیر بغوی جلد ا صفحہ ۱۴۰، تفسیر بیضاوی جلد ا صفحہ ۱۰۰ اور تفسیر جلالین صفحہ ۲۳ الغرض تمام تر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت کا تعلق ذبح کے وقت سے ہے۔ مثلاً تفسیر بیضاوی جو ایک درسی کتاب ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں ای رفع بہ الصوت عند ذبحہ للصنم یعنی ذبح کے وقت بت کا نام لینے سے جانور حرام ہو جاتا ہے۔ حتی کہ امام ابوبکر جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ! ''لا خلاف بین المسلمین انہ المراد بہ الذبیحۃ اذا اھل بھا لغیر اللہ عند الذبح ''۔ یعنی مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں وہ ذبیحہ مراد ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے (احکام القرآن للجصاص جلد ا صفحہ ۱۲۵)۔

اس موضوع پر حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان وما اھل بہ لغیر اللہ'' حضرت پیر صاحب علیہ الرحمۃ نے اس کتاب میں سنی مسلک کو بخوبی واضح فرمایا ہے اور تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور ضمناً بہت سے دوسرے مسائل پر بھی خوب بحث فرمائی ہے۔ یہ کتاب عام دستیاب ہے۔

دن مقرر کرنا: کسی بھی مباح یا مستحب کام کے لیے دن مقرر کر لینا جائز ہے اولاً تو اس سے شریعت نے منع نہیں کیا ثانیاً خود نبی کریم ﷺ ہر پیر کو نفلی روزہ رکھتے تھے (مسلم شریف جلد ا صفحہ ۳۶۸)۔ گویا روزے کا یہ دن مقرر تھا۔ آپ ﷺ ہر ہفتے کو مسجد قباء میں تشریف لے جاتے تھے (مسلم و بخاری)۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی آزادی کی (بقیہ صفحہ نمبر 17)

حسن عرباض محمد ☆

تہذیب جدید کے گم راہ کن مغالطے
حق و باطل کے اختلاط کی گھناؤنی سازشیں

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

جدید تہذیب نے جہاں ہمارے بہت سارے اطوار کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے، وہاں اس کی نحوست مسترہ سے ہمارے کچھ مستحکم اور مسلم افکار بھی متاثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس بے لگام تہذیب نے چند مفصول طرز کے ناہنجار تحائف بھی ہمیں عطا کیے ہیں، جنھیں ہمارا آزاد خیال (Liberal, Newtal) طبقہ حرزِ جاں بنائے ہوئے ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جس کی ترجیح اوّل دُنیا و مافیہا ہوتی ہے، دین کو وہ دُوسرے نمبر پر رکھتے ہیں اور ایک گروہ بے دینوں (Seculars) کا ہے، جس کا سرے سے دین کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ تو اس سے بہت آگے کی بات کرتا ہے، جب کہ ہیں یہ دونوں ہی ایک آوے کے برتن۔ ستم ظریفی یہ کہ دین کے خلاف کفر کی ان گھناؤنی سازشوں کو یہ لوگ ''روشن خیالی'' کا نام دیتے ہیں اور اپنے تئیں مہذب ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔

'مہذب' طبقے کے وہ اُصول یہ ہیں:

''کسی کو کچھ نہ کہو!''

''سب ٹھیک ہیں، کوئی غلط نہیں۔''

''جو جس طرف لگا ہے، ٹھیک لگا ہے۔''

''آپ حق بیان کر دو، باطل خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔''

☆) 0333-4792593

''کسی کو چھیڑو نہیں، اپنا چھوڑو نہیں!'' وغیرہ

اِن نظریات کو رائج کرنے کے لیے میڈیا کے زُود رساں اور زُود اثر ذرائع کو استعمال میں لایا جارہا ہے۔ چاروناچار ہر بیمار ایمان اور ناقص العقل کو انھیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ ظلم کی انتہا ہوگئی! جب کچھ حق پرستوں نے اپنی زندہ ضمیری کا ثبوت دیتے ہوئے باطل کی اس دعوت کو ٹھکرایا تو فراعین وقت نے قانون کے ڈنڈے کا ناجائز استعمال کر کے اُن کے وجود کو ٹھیس پہنچانے کی ناپاک کوشش کی، اگرچہ وہ اپنی اس جسارت میں اپنے اہداف مقاصد کو حاصل نہ کرسکے۔

نظریات جدیدہ کو برحق ثابت کرنے کے لیے کئی ایک مجہول تاریخی واقعات سے دلیلیں پکڑی جاتی ہیں، کچھ حالیہ تقاضوں کو بھی عذر بنا کر پیش کیا جاتا ہے، لیکن بعض ان دیکھے، اَن سنے اور اَن ہوئے مفروضے بھی قائم کر کے اُن سے مثالیں اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (یہ موضوع طویل تر تفصیل کا متقاضی ہے۔ اِن شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر بیان کیا جائے گا)

اِن خانہ زاد خود ساختہ اُصولوں میں ہر غلط مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں کو امن کی آشا نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قوم کو انھی پر عمل درآمد کروا کر ہی تو ہر کوئی اپنے آپ کو اِحتساب کرنے والوں سے بچا سکتا ہے اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ 'ہر کوئی' اپنے مقصد میں پورے طرح سے کام یاب ہے۔

لیکن کوئی سلیم الفطرت، کامل العقل شخص اِن ایسے منافقانہ اُصولوں کی کسی صورت اجازت نہیں دے سکتا، کیوں کہ حق اور باطل دو الگ الگ وجود ہیں؛ ایک حق ہے اور ایک باطل اور اِن میں اِتحاد کسی طور ممکن نہیں ہے۔ یہی بنیاد ہے ''دو قومی نظریہ'' کی اور یہی اِسلام کا قانون ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ازل سے یہ فیصلہ رہا ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان ہمیشہ اِمتیاز

ظاہر فرمائے گا اور اُس نے اپنے فضل سے حق میں اِتنی طاقت رکھ دی ہے کہ اُس حق کی طاقت سے ہی باطل کو شکست دلوائے گا۔ وہ حق کو ظاہر کرے گا، لیکن باطل کو دفع بھی ضرور فرمائے گا۔ جہاں حق کا بول بالا فرمائے گا، وہاں باطل کا منہ کالا بھی فرمائے گا۔ حق میں باطل کی آمیزش اُسے قطعاً گوارا نہیں۔ حق کے ساتھ اُس کی تائید ہے، باطل پر اُس کی پھٹکار ہے۔ اُس نے اپنی کتاب فرقان میں کھلے لفظوں میں اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا ہے۔

وہ فرماتا ہے:

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ (پارہ:15 سورۃ الاسراء:81)

''حق آیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل کو مٹنا ہی تھا۔'' (کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن)

اور فرماتا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ. (پارہ:9 سورۃ الانفال:8-7)

''اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو ثابت فرمادے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، تا کہ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کردے۔''

اس نے اپنے نبی ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی ایک محبوب صفت قرآن میں یہ بھی بیان فرمائی ہے:

الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (پارہ:26 سورۃ الفتح:29)

''ان (محمد ﷺ) کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔''

(کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن)

پھر اللہ جل شانہ ''قرآن کریم'' میں اپنی ایک پسندیدہ قوم کا تذکرہ فرما کر اُن کا وصفِ عالی یوں بیان فرماتا ہے:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ (پارہ:6 سورۃ المائدۃ:54)

''مسلمانوں پر نرم اور کافروں پر سخت۔'' (کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن)

آخر میں قصہ تمام کر دیا۔ فرمایا:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ (پارہ:30 سورۃ الکافرون:6)

''(اے قومِ کفار!) تمھارے لیے تمھارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین ہے۔''

اب فیصلہ کیجیے! قرآن نے تو جہاں احقاقِ حق کیا ساتھ ہی ابطالِ باطل بھی کر دیا۔ تو وہ تعلیم کیوں کر دُرست ہو سکتی ہے، جو سراسر قرآن کے خلاف ہو؟...... پتہ چلا کہ حق کو حق کہہ کر اور باطل کو باطل کہہ کر ہی جان چھوٹے گی، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں!!!

پھر اس نئی تہذیب کا ناس ہو، اس نے تو ہمیں یہ پٹی بھی پڑھا دی:

''کافر کو کافر نہ کہو! (ہو سکتا ہے، وہ بعد میں مسلمان ہو جائے)''

یعنی پھر تو مسلمان کو مسلمان بھی نہ کہو! (ہو سکتا ہے، زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں وہ -معاذ اللہ- کافر ہو جائے) اور اسی طرح دیگر مذاہب والوں کو بھی!

لیکن قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جس جس جگہ کافر کو مخاطب کیا، 'کافر' ہی کہا اور مسلمان کو مخاطب کیا، تو 'مسلمان' ہی کہا اور ویسے بھی ہمارا سوال ہے کہ 'کافر' کو 'کافر' نہیں کہیں گے، تو پھر کیا کہیں گے؟ شاید جواب یہ ہو کہ ''انسان کہیں گے۔''

جی ہاں! یقیناً یہی جواب ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ آج کل انسانیت کا نام لے کر مذہب کی پہچان ختم کی جا رہی ہے۔ اسی لیے تو یہ نعرہ لگایا جاتا ہے:

''انسانیت پہلے، مذہب بعد میں!''

مگر بحمد اللہ و بفضلہٖ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے مذہب ہے، کیوں کہ مذہب ہی مقامِ انسانیت سے صحیح طرح رُوشناس کراتا ہے۔

اور سنیں...... کہ اس قول کا ورد کرنے والے خود اپنے ہی جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ذرا غور فرمائیں کہ ''کافر کو......'' میں کافر کس کو کہا جا رہا ہے؟ اُسی کو تو...... جس کو کافر نہ کہنے

کا کہا جارہا ہے۔ یعنی خود کا فر کہیں، لیکن اوروں کو منع بھی کریں۔ واہ! یہ کیسی دانش مندی ہے!

اور لطیفہ یہ ہے کہ تہذیب جدید کی 'ٹھوس ذہنیت' کی کھوکھلاہٹ اسی سے آشکارا ہو جاتی ہے کہ اِس فکر کا درس دینے والے اپنے نہ ماننے والوں کو اپنے ہی اُصولوں کے برعکس 'متعصب'، 'محدودُ الذہن' اور 'قدامت پرست' ہونے کا طعنہ بھی دیتے ہیں۔ ہم اِس تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ! جب کوئی غلط ہے ہی نہیں، سب ٹھیک ہیں، تو پھر نہ ماننے والے کیسے غلط ہوگئے!!...... اور اگر کوئی غلط ہے بھی، تو بس آپ حق بیان کردو، باطل خود ہی ختم ہوجائے گا!!! یہ ہے اِس سوچ کی اصلیت.....!!!

لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے دینِ اسلام کے ابدی اُصول جو ہمیں بتادیے ہیں، وہی پختہ اور غیر متزلزل اور قیامت تک کے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں۔ اُن کو اپنانے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس قسم کے جتنے گم راہ کن نظریے اِختراع کیے جارہے ہیں، جن کے باعث اُمتِ مسلمہ 'تصلُّب فی الدین' جیسی قیمتی نعمت سے محروم ہورہی ہے، تبھی تو دین ایک 'سستا مال' بن چکا ہے، آخر اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف اِیسے خطرناک پروپیگنڈوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟

تو سنیے! ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں کہ ایسی تمام قسم کی سازشیں تیار کرنے والے اور کوئی نہیں، صرف اور صرف مرزائی، قادیانی اور دوسرے بدعقیدہ فرقے ہیں، جو کفر کی ملی بھگت سے یہ مشن پھیلا رہے ہیں۔ یہ لوگ صیہونی اور دیگر طاغوتی طاقتوں کے دستِ شفقت کے نیچے پلتے بڑھتے ہیں، اُن کی شہ پر سازشیں تخلیق کرتے ہیں اور انھی کے آشیرباد سے اِسلام کی جڑیں کاٹتے ہیں۔ اِن کی سب سے بڑی چال یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو 'مسلمان' کہتے ہیں، جب کہ درپردہ کفر کے لیے کام کررہے ہوتے ہیں۔

اب کچھ تھوڑا سا مغربی تعلیم کے نتائج پر بھی بات کرلیجیے! یہ مفلوج تعلیم بھی کیا گل کھلا

رہی ہے۔ سرسیّد احمد خاں (علی گڑھی) جنھیں برعظیم پاک و ہند میں علم و شعور و انقلاب کا خدا مانا جاتا ہے، ذرا دیکھیے! وہ قوم کو مرزائیت (جو اس وقت پورے عالم اسلام اور تمام سچے مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہیں) کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کذاب کے متعلق کیا سبق دے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے پیچھے لوگ کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے، بہتر! ہم کو اس سے کیا فائدہ؟ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے، نہ دُنیا کے۔ اُن کا الہام اُن کو مبارک رہے۔ اگر نہیں ہوتا اور صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے، تو ہم کو اس سے نقصان نہیں ہے۔ وہ جو ہوں، سو ہوں، اپنے لیے ہیں۔''

(خطوطِ سرسیّد مرتبہ سیّد راس مسعود صفحہ 256)

'سرجی!' کیوں مخلوط فکر سے افرادِ ملت کو مخنث بنا رہے ہیں!

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرزا صاحب اور اُن کے ساتھ ساتھ ہر کس و ناکس کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ آزادانہ جو چاہے، کرتا پھرے۔ باطل سوچ والا اپنے کفر کی کھلے عام تبلیغ کرے، مرزا صاحب نبوت کا دعویٰ کریں، اللہ و رسول کی گستاخی کریں، قرآن و حدیث کی توہین کریں، شعائرِ اسلام کا مذاق اُڑائیں، دینِ اسلام کی دھجیاں بکھیریں اور دُنیا کا کوئی بد اصل بدنسل اسلام کے ساتھ کچھ بھی سلوک کرے، ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ خواہ مخواہ اُس کے خلاف آواز اُٹھائیں۔ وہ کھلے بندوں اپنا مشن جاری رکھے، ہم اُس کی راہ کے کانٹے نہیں بنیں گے۔

بتائیے! کس قدر ہولناک اور بھیانک نتائج نکلیں گے، جب اہلِ حق باطل سے سبک دوشی کی راہ اختیار کرلیں گے۔

خبردار مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تمھیں امر بالمعروف (نیکی کا حکم دینا) کی ذمہ داری

سونپی ہے، ساتھ ہی نہی عن المنکر (برائی سے منع کرنا) کا حکم بھی دیا ہے۔ ارشاد ہے:

1- وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (پارہ:4 سورۃ النساء:104)

"اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بُری سے روکیں!" (کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن)

2- كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ (پارہ:4 سورۃ النساء:110)

"تم بہتر ہو اُن سب اُمتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں، بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے منع کرتے ہو۔" (کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن)

سر صاحبؒ کی بات اگر مانی جائے، تو اِن میں سے کسی ایک حکم پر بھی عمل نہیں ہوتا۔ یعنی نہ کسی کو یہ بتاؤ کہ وہ جو کہتا ہے، غلط ہے! نہ یہ کہو کہ یہ صحیح ہے، اس کو مان لو! بس سنتے رہو خاموشی سے! اور اپنوں کو بھی سچائی نہ بتا کر جہنم کے گڑھے میں دھکیل دو!!!!

سچ فرمایا گیا ہے:

اَلْمُتَكَلِّمُ بِالْبَاطِلِ شَيْطَانٌ نَاطِقٌ وَالسَّاكِتُ عَنِ الْحَقِّ شَيْطَانٌ أَخْرَسُ۔

"گمراہی والی بات کہنے والا بولتا شیطان ہے اور حق بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔"

جو شخص اِس گمراہی بھرے دور میں حق و باطل کو پہچاننا چاہتا ہو اور اُن میں فرق نہ کر سکتا ہو، تو ہم سے سنے کہ اسلام سچا دین ہے اور اہلِ سنت سچا مسلک ہے۔ اب بھی اگر کسی کا دل مطمئن نہیں ہوتا، تو وہ اِس دُعا کو کثرت سے پڑھے، جسے اللہ کے نبی ﷺ پڑھا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ خود ہی سچے دین و مسلک کی طرف راہ نمائی فرمادے گا۔ دُعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنِی اتِّبَاعَہٗ، اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ ارْزُقْنِی اجْتِنَابَہٗ.

''اے اللہ! ہمیں حق کو حق کی اصل صورت میں دکھا اور اُس کی پیروی کی توفیق عطا فرما اور اے اللہ! ہمیں باطل کو باطل کی اصل صورت میں دکھا اور اُس سے دُور رہنے کی توفیق عطا فرما!''

بعض دینی حلقوں سے معذرت کے ساتھ!

اعتدال ہر معاملے میں احسن ہے، سب کچھ بھول کر کسی معاملے میں اِنتہا کو پہنچ جانا عقل مندی کی بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو کام اِس نہج پر کیا جاتا ہے، وہ بہتر طریق پر انجام پذیر ہوتا ہے اور اُس کے نتائج بھی دیرپا ہوتے ہیں، لیکن جو کام اِس ڈگر سے ہٹ کر کیا جائے، اوّل تو وہ پورا نہیں ہوتا اور اگر پورا ہوتا بھی ہے، تو اُس کا وجود جز وقتی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کئی مذہبی حلقوں کے یہ حالات دیکھنے میں آئے ہیں کہ جس طرح آزاد خیال طبقے کے لوگوں نے اپنا سارا کا سارا زور اِس بات پر لگایا ہوا ہے کہ ہر دُنیاوی معاملے میں دین سے گنجائشیں نکالنا اور جہاں دین کی بات آجائے وہاں سے کنی کترانا، یعنی اپنا نیز دوسروں کے ایمان کا بیڑا غرق کرنا! عکس چند مذہبی افراد غلو کرتے ہوئے اپنی تمام قسم کی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر اِختلافات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اپنا کل وقت، سرمایہ اور طاقت؛ سب کچھ اِس اِختلاف کو ہوا دینے میں صرف کیے جارہے ہیں۔ اُن کی نظر میں اِختلاف (درحقیقت ''دنگا فساد'' اور ''کسی بات پر متفق نہ ہونا'' جسے وہ اِختلاف کا نام دے کر اپنے خیال میں مذہبی ارمانوں کو پورا کر رہے ہوتے ہیں) سے اہم اِس دُنیا میں کوئی کام نہیں۔ اِسی باعث تو ہمارے اکثر عوام عمر بھر اپنے ہی عقائد سے اصلاً ناواقف رہتے ہیں، حتیٰ کہ خود بعض مبلغین بھی اپنے عقائد کی کماحقہٗ ترجمانی نہیں کرپاتے اور اگر کرتے بھی ہیں، تو طویل عرصہ کے تسلسل تجارب کے بعد اُنھیں یہ گر حاصل ہوتا ہے، تب تک بہت

سوں کی فکر زنگ آلود ہو چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر مبلغ، مقرر، مدرس کو اپنے پاکیزہ منصب کی قدر پہچان کر یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اگر ان کی اچھی بات کسی کے لیے دُنیا و آخرت میں نجات کا وسیلہ بن سکتی ہے، تو اُن کے منہ سے نکلا ہوا کوئی ایک غیر محتاط لفظ یا غیر مناسب رویہ کسی سامع متعلم کو ہدایت و گمراہی کے دوراہے پہ لا کھڑا کر سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں حق و باطل کے متعلق وہی اسلام والا دوٹوک موقف رکھ کر اعتدال، سنجیدگی اور حکمت عملی کے ساتھ اس گراں بار ذمہ داری کو نبھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے قرآنی نبوی سلفی دعوت کے اُصولوں کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔ وباللہ التوفیق!

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

بقیہ (تذکرہ مولانا پیر محمد اشرف نقشبندی علیہ الرحمہ)

بڑی مشکل سے آپ نے پڑھائی۔ عید کے دن ہی گاؤں کی تمام مساجد کے لیے پانچ پانچ سو روپے دیئے۔ علاج معالجہ کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا۔ لہٰذا آپکو راولپنڈی لے جایا گیا۔ علاج تو ہوتا رہا مگر علالت زور پکڑتی گئی۔ آخر 74 سال کی عمر میں 10 مارچ 1998ء بمطابق 10 ذیقعد 1418ھ کو واصل الی اللہ ہو گئے۔ آپ کے انتقال کا سن کر علماء و مشائخ اور عوام الناس کا انبوہ کثیر امڈ آیا۔ سجادہ نشین خانقاہ عالیہ موہڑہ شریف پیر اولیاء بادشاہ فاروق نے جنازہ پڑھایا اور آپکو مسجد غوثیہ سے ملحقہ جگہ پر دفن کیا گیا۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے آپکے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ بڑے صاحبزادے محمد عتیق الرحمن صاحب انگلینڈ میں اور مولانا محمد عمر فاروق صاحب گاؤں میں دین متین کی اشاعت کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ آپ کا عرس مبارک ہر سال گنڈاکس میں مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں منایا جاتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

افضل شاہد اعوان ☆

تذکرہ مولانا پیر محمد اشرف نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ

کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ زندگی بھر اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔ جب اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر لوگوں کی زبان پر جاری فرما دیتا ہے۔ایسے ہی مطیع وفرمانبردار بندوں میں ایک ہستی رئیس المتقین صوفی باصفا حضرت مولانا پیر محمد اشرف نقشبندی مجددی علیہ الرحمہ کی ہے۔

مولانا پیر محمد اشرف صاحب **1924ء** میں قصبہ لطیفال تحصیل وضلع چکوال میں پیدا ہوئے آپکے والد ماجد کا اسم گرامی میاں محمد امین تھا جو کہ ایک نیک و پارسا آدمی تھے۔مولانا صاحب ابھی دو سال کے ہی تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔والد کے وصال کے بعد آپ کی والدہ محترمہ آپ اور آپ کے بڑے بھائی میاں احمد دین کو ساتھ لے کر اپنے والدین کے ہاں گنداس آ گئیں۔یہاں اپنے نانا صوفی خدا بخش کے ہاں پرورش پانے لگے۔پرائمری تک تعلیم گنداس کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔قرآن پاک اپنے نانا محترم سے ہی پڑھا۔دینی تعلیم گاؤں کے مختلف علماء کی صحبتوں میں رہ کر حاصل کی اور اس کے ساتھ دینی کتب کا مطالعہ جاری رکھا۔بہت ہی وسیع المطالعہ تھے۔ضرورت کے جملہ مسائل کے بارے میں بحسن وخوبی آگاہ تھے۔

آپ نے شروع ہی سے گاؤں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک پڑھانا معمول بنالیا تھا۔بعدازاں اسے باقاعدہ ایک مدرسہ "تدریس القرآن" کا نام دے دیا۔آپ نے تادم آخر اس سلسلہ کو قائم رکھا۔آخری عمر میں کچھ بچوں کو قرآن پاک حفظ کرانا شروع کر دیا۔ابتدا میں مدرسہ "تدریس القرآن" کا قیام اپنی اقامت گاہ پر ہی فرمایا لیکن خواہش تھی

☆ 0300-9129852

کہ کسی دوسری جگہ پر باقاعدہ مدرسہ کی عمارت بنائی جائے۔ 6 مارچ 1987ء کو آپ نے گاؤں کی شمالی جانب 5 کنال کا رقبہ اس مقصد کے لیے خریدا۔ ابھی اس کی تعمیر کے لیے وسائل میسر نہ آئے تھے کہ مسجد غوثیہ کے ساتھ ملحقہ حویلی خریدلی۔ آپکی زندگی میں تو اس کی تعمیر کا کام شروع نہ ہو سکا لیکن آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے صاحبزادگان نے اس کی تعمیر مکمل کی۔ آج اللہ کے فضل وکرم سے ایک عالی شان مسجد اور مدرسہ کی خوبصورت عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ اب مدرسہ کا نام ''تدریس القرآن'' سے تبدیل کر کے ''اشرف المدارس'' رکھ دیا گیا ہے جو کہ مولانا محمد اشرف علیہ الرحمہ کے نام سے موسوم ہے۔

محافل کا قیام:

آپ مختلف مواقع پر دینی محافل کا انعقاد فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس حوالے سے مولانا عبدالغفور صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''1945ء سے جلسہ منعقد کرنے کا بوجھ کندھوں پر رکھا ہوا ہے۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ جل مجدہ اور حبیب رب الاعلیٰ ﷺ کو راضی رکھنے اور مخلوق خدا کو بھٹکے ہوئے انسانوں کو صراط مستقیم پر چلانے کے لیے محافل قائم کی جاتی ہیں۔ ماہ محرم الحرام میں شہید کربلا، ماہ ربیع الاول میں عید میلاد النبی ﷺ، ماہ ربیع الآخر میں عرس محبوب سبحانی غوث الاعظم جیلانی خصوصاً ہر ماہ گیارہویں شریف، ماہ رجب المرجب میں معراج مصطفےٰ ﷺ، ماہ شعبان میں شب برأت، ماہ رمضان المبارک میں شب قدر کے نام سے محافل قائم کی جاتی ہیں''۔

جلسہ جلوس عید میلاد النبی:

حضرت مولانا محمود اشرف علیہ الرحمہ کو نبی کریم ﷺ سے خصوصی عشق تھا اور یہی ان کی زندگی کا سب سے اعلیٰ سرمایہ حیات تھا۔ اس محبت وعقیدت کا یہ تقاضا تھا کہ آقا کریم ﷺ کا یوم ولادت تزک واحتشام سے منایا جائے۔ چنانچہ آپ علیہ الرحمہ عید میلاد

النبی ﷺ کو خصوصی اہتمام کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے مناتے تھے۔ حضرت صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اپنے پورے علاقے میں سب سے پہلے آپ نے عید میلاد النبی ﷺ کا جلسہ شروع کیا۔ بعد ازاں آپ کی پیروی میں علاقہ بھر میں جلسے منعقد ہونے لگے۔ شروع میں صرف جلسہ ہوتا تھا لیکن حضرت صاحب نے زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عید میلاد النبی ﷺ کے جلوسوں کا بھی آغاز خود اپنی زندگی میں ہی فرما دیا تھا۔

1980ء میں پہلی دفعہ ایک عظیم الشان جلوس کا اہتمام فرمایا۔ آپ ناسازی طبع کے باوجود بھی خود جلوس کی قیادت فرماتے اگر طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو موٹر سائکل پر بیٹھ کر قیادت فرماتے۔ یہ حضرت صاحب کا ہی فیض ہے کہ اب گردونواح کے دیہات میں بھی جلوس نکل رہے ہیں۔

بدمذہبوں کا رد:

آپ عقائد کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اس حوالے سے کسی سے رو رعایت نہیں فرماتے تھے۔ اپنی تقریروں میں ہمیشہ ہی بدمذہبوں کے عقائد کا رد فرمایا کرتے تھے اور اپنا عقیدہ قرآن وحدیث کی روشنی میں بڑی عمدگی سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ جہاں بھی کوئی خرابی دیکھتے ڈٹ کر اس کی مخالفت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اللہ کے فضل و کرم سے پورے علاقے میں صرف ہمارا گاؤں گنڈاکس بدمذاہب کے زہر سے محفوظ ہے۔ حالانکہ گردونواح کے تمام دیہات اس کا شکار ہو چکے ہیں۔

بیعت وخلافت:

مولانا محمد اشرف نقشبندی مجددی علیہ الرحمہ نے کھنوال شریف میں حضرت پیر سید فتح حیدر شاہ نقشبندی مجددی علیہ الرحمہ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور آپ کو خلافت سے نوازا گیا۔ آپ ہر سال گاؤں میں اپنے پیرومرشد حضرت پیر سید فتح حیدر شاہ نقشبندی مجددی علیہ الرحمہ کا عرس پورے تزک واحتشام کے ساتھ منایا کرتے تھے۔ جس میں مقامی

آبادی وگردونواح کے علاوہ دیگر شہروں سے عوام الناس کی ایک کثیر تعداد شرکت فرماتی تھی۔

زُہدوتقویٰ:

آپ شریعت مطہرہ کے مکمل طور پر پابند تھے۔ فرائض وواجبات کی ادائیگی تو بجا نوافل کی ادائیگی بھی پورے اہتمام سے کرتے تھے۔ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ سات سال کی عمر سے لے کر وصال تک آپ کے ذمے کوئی نماز باقی نہ تھی۔ رمضان المبارک میں ہمیشہ اعتکاف کا اہتمام فرماتے اور تقریباً 50 سال اس سعادت سے بہرامند ہوتے رہے۔

بطور سیاسی رہنما:

آپ نے اہلِ سنت کی نمائندہ سیاسی جماعت ''جمعیت علمائے پاکستان'' میں بھی شمولیت اختیار فرمائی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں 1964ء میں آپ بھاری اکثریت سے بی۔ ڈی ممبر بھی منتخب ہوئے۔ زکوٰۃ کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔ ''گنڈاکس'' کا نام چونکہ غیر اسلامی سا ہے اس لیے آپ نے گاؤں کا نام ''مصطفےٰ آباد'' درج کرنے کے لیے کاوشیں بھی کیں لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔

روحانی معالج:

بطور روحانی معالج آپکا کافی شہرہ تھا۔ آسیب زدہ اور دیگر طرح طرح کی بیماریوں کے مریض قرب وجوار سے آپکے پاس حاضر ہوتے اور شفایاب ہوتے نہ صرف عوام الناس بلکہ علماء ومشائخ بھی آپ کے اس کمال کے معترف تھے۔

آخری ایام اور وصال:

1998ء میں رمضان کے آخری دنوں میں آپکی طبیعت ناساز ہوگئی نماز عید بھی

بقیہ صفحہ نمبر (65) پر

از قلم: فیصل خان ☆

(قسط نمبر 1)

منحۃ الحی فی کشف ظلمات زبیر علی زئی

ترک رفع یدین کے مسئلہ میں راقم نے غیر مقلد عالم حافظ زبیر علی زئی صاحب کی کتاب "نور العینین" میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر اعتراضات کا جواب اپنی کتاب "رفع یدین کے موضوع پر نامور غیر مقلد زبیر علی زئی کی کتاب کا محققانہ تجزیہ" لکھی۔ مگر حافظ زبیر علی زئی صاحب نے اپنے ماہانہ رسالہ الحدیث شمارہ نمبر ۶۷ اور شمارہ نمبر ۶۹ میں میری کتاب کے جواب میں دو اعتراضاتی مضامین لکھے۔ راقم نے ان دونوں مضامین کا جواب اپنی دوسری کتاب "مسئلہ ترک رفع یدین پر غیر مقلد زبیر علی زئی کے اعتراضاتی مضامین کا جواب" میں دیا۔ مگر پھر دوبارہ حافظ زبیر علی زئی صاحب نے اس کتاب کا جواب "انوار الطریق فی رد ظلمات فیصل الحلیق" انٹرنیٹ پر شائع کرایا۔ اس کتاب میں حافظ زبیر علی زئی صاحب نے جس قسم کی نازیبا زبان استعمال کی اس سے انکی اخلاقی حالت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جواب میں راقم سخت الفاظ کہنے کا حق رکھتا ہے۔ مگر اپنے اساتذہ کی تربیت کی وجہ سے میں ادب کا دامن تھامے رکھوں گا۔ حافظ زبیر علی زئی صاحب نے اپنی کتاب میں عوام الناس کو جو مغالطہ دینے کی کوشش کی ان کی نقاب کشائی حاضر ہے۔

1: تدلیس کے مسئلہ پر حافظ صاحب نے انوار الطریق صفحہ 7 پر ایک سرخی "اصول الحدیث اور مدلس کی عن والی روایت کا حکم" دی ہے۔ اور اسکے تحت لکھا ہے!

"اصول حدیث کا مشہور اور معروف مسئلہ ہے کہ مدلس راوی (یعنی جس کا مدلس

☆) 0321-5501977

ہونا ثابت ہو) کی عن والی روایت ناقابل حجت یعنی ضعیف ہوتی ہے"۔
اور پھر اپنی کتاب کا حجم اور عوام الناس پر رعب ڈالنے کے لئے ۴۰ محدثین کرام کے حوالے دیے ہیں۔

جواب: (۱) پہلی عرض تو یہ ہے کہ ان حوالوں کا انکار کس نے کیا ہے؟ اور جو اصول ثابت کرنے کے لئے آپ نے ۴۰ حوالے دیے ہیں۔ ان حوالہ جات کا انکار اور رد آپ نے خود تخصیصات اور استثناء کے نام پر انوار الطریق صفحہ ۲۰، ۲۱ کیا ہے۔ ان ۴۰ حوالہ جات کو پیش کرنے کے بعد زبیر علی زئی صاحب لکھتے ہیں!

''جسطرح بعض اصول وقواعد میں تخصیصات ثابت ہو جانے کے بعد عام کا حکم عموم پر جاری رہتا ہے اور خاص کو عموم سے باہر نکال لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس اصول کی بھی کچھ تخصیصات ثابت ہیں"۔

پھر مزید آگے صفحہ ۲۰ اور صفحہ ۲۱ پر چند تخصیصات لکھی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(i) صحیحین میں تمام مدلسین کی تمام روایات سماع یا معتبر متابعت وشواہد پر محمول ہیں۔

(ii) مدلس کی اگر معتبر متابعت یا قوی شاہد ثابت ہو جائے تو تدلیس کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

(iii) بعض مدلسین کی روایات بعض شاگردوں کی روایت میں سماع پر محمول ہوتی ہیں۔ مثلاً شعبہ کی قتادہ، اعمش اور ابو اسحاق السبیعی سے روایت، شافعی کی سفیان بن عیینہ سے روایت اور یحییٰ بن سعید القطان کی سفیان ثوری سے روایت سماع پر محمول ہوتی ہیں۔

(iv) بعض مدلسین بعض شیوخ سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ مثلاً ابن جریج عطا بن ابی رباح سے اور ہشیم حصین سے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ایسی معنعن روایات بھی سماع پر محمول ہیں۔

(v) اسی طرح اگر کوئی اور بات دلیل سے ثابت ہو جائے تو وہ بھی قابل قبول ہے۔

قارئین کرام! ملاحظہ کریں کہ زبیر علی زئی صاحب نے جو اصول ثابت کرنا تھا اس اصول کو انہوں نے خود 5 تخصیصات کر کے اپنے ہی دعویٰ کی نفی کر دی ہے۔ آپ کو یہ ذہن نشین رہے کہ مدلس کی ہر عن والی روایت ضعیف نہیں ہوتی کیونکہ دیگر قرائن اور شواہد اور تخصیصات بھی مدنظر رکھنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا غیر مقلد زبیر علی زئی صاحب ہر جگہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا قول کہ ''پس ہم نے کہا: ہم کسی مدلس سے کوئی حدیث قبول نہیں کرتے حتی کہ وہ حدثنی یا سمعت کہے (کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵) جو پیش کرتے ہیں۔ اس قول کی تخصیصات ثابت کردیں۔ اور امام شافعی کے اصول کی تخصیص کر دی۔

راقم کا بھی یہی کہنا تھا کہ حافظ زبیر علی زئی صاحب بار بار امام شافعی علیہ الرحمہ کے قول سے مطلقاً استدلال کرتے ہیں وہ بالکل غلط اور مردود ہے بلکہ امام شافعی علیہ الرحمہ کے اس اصول سے محدثین کرام متفق نہیں بلکہ خود امام شافعی نے اپنے اصول کو اپنی کتاب الرسالہ میں بھی لاگو نہیں کیا۔ ہم آگے چل کر امام شافعی علیہ الرحمہ کے اس قول کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔ مگر فی الوقت امام شافعی علیہ الرحمہ کے قول کو زبیر علی زئی صاحب خود مطلقاً نہیں مانتے بلکہ جزوی طور پر اس کا اقرار کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ حافظ صاحب نے تخصیصات میں نمبر ۵ کے تحت جو لکھا ہے کہ! ''اسی طرح اگر کوئی اور بات دلیل سے ثابت ہو جائے تو وہ بھی قابل قبول ہے''۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے کیونکہ یہ ایک وسیع اور گہری بات ہے۔ جس کا ایک مفہوم بڑا ظاہر ہے کہ اگر کسی اور دلیل سے تدلیس نہ کرنا ثابت ہو تو اس روایت کو بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔

مزید یہ کے جس طرح تحقیقی میدان میں زبیر علی زئی صاحب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امام شافعی علیہ الرحمہ کے اصول میں تخصیصات ثابت کر سکیں اسی طرح ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ہم بھی اصول الحدیث اور اقوال محدثین وعلماء کرام کی روشنی میں امام شافعی کے اصول میں کچھ تخصیص ثابت کر سکیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(i) حافظ ابن حجر اور دیگر محدثین کرام کی مدلسین کی طبقاتی تقسیم۔

(ii) ائمہ کرام کے اقوال سے قلیل التدلیس کی تدلیس قبول کرنا۔

(iii) تدلیس کی مختلف صورتوں کے مختلف احکام

(iv) ثقاہت سے تدلیس

(v) طویل رفاقت ہونا۔

(vi) مخصوص اساتذہ سے تدلیس

(vii) خاص شاگردوں کا مدلس سے روایت۔

(viii) جلالت علمی

(ix) محدثین کرام کا معنعن قبول کرنا۔

(x) تلقی بالقبول

اور میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان تخصیصات کے علاوہ عرب محقق ڈاکٹر عواد الخلف نے اپنی کتاب ''روایات المدلسین فی البخاری'' صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۳۱ تقریباً ۳۳ کے قریب اصول اور ضوابط لکھے ہیں جس کی وجہ سے مدلسین کی روایت قبول ہے۔

میں نے جو مندرجہ بالا ۸ تخصیصات ثابت کیں ہیں۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ترک رفع یدین والی حدیث میں سفیان ثوری کو تخصیص نمبر (i)، (ii)، (viii)، (ix) اور (x) حاصل ہے۔ حالانکہ ایک تخصیص بھی ثابت ہونے سے روایت صحیح ہوتی ہے

اب مزید یہ تحقیق کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفیان ثوری کو غیر مقلد زبیر علی زئی کی پیش کردہ کن تخصیصات سے تخصیص حاصل ہے۔ زبیر علی زئی نے انوار الطریق صفحہ ۲۱ پر تخصیص نمبر ۵ کے تحت لکھا ہے کہ۔ ''اسی طرح اگر کوئی اور بات دلیل سے ثابت ہو جائے تو وہ بھی قابل قبول ہے۔

اسی بات کو مزید مزین کرنے کے لیے محدث ابن رشید الفہری کے حوالہ سے لکھتے ہیں!

"اما من عرف بالتدلیس فمعرفته بذلک کافیة فی التوقف فی حدیثه حتی یتبین الأمر" (السنن الابین ص۶۶)

ترجمہ: مگر جو تدلیس کے ساتھ معروف ہو تو یہ معلوم ہو جانا اس کے لئے کافی ہے کہ اس کی حدیث میں توقف کیا جائے الا کہ یہ معاملہ واضح ہو جائے۔

اب ہم زبیر علی زئی کے تخصیص نمبر ۵ سے اور محدث ابن رشید الفہری کے حوالہ سے معاملہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آج تک متقدمین اور محدثین کرام نے اس ترک رفع یدین والی حدیث پر دیگر الزامات تو وارد کئے مگر کسی ایک محدث نے بھی اس حدیث پر سفیان ثوری کی تدلیس کا الزام وارد نہیں کیا۔ حالانکہ یہ مسئلہ ہر دور میں زیر بحث رہا ہے۔ لہٰذا عبدالرحمٰن معلمی میرے علم میں وہ پہلا شخص ہے جس نے محدث کبیر ثقہ عالم زاھد الکوثری کے ردّ میں یہ الزامی جواب دیا۔ اس لئے تدلیس کے الزام کی حیثیت بالکل مردود اور محدثین کے منہج کے خلاف ہے۔

دوم یہ کہ آج تک کسی محدث نے یہ تصریح بھی نہیں کی کہ یہ حدیث سفیان ثوری نے عاصم بن کلیب سے نہیں سُنی۔ اگر زبیر علی زئی غیر مقلد دوسری احادیث کے متعلق محدثین کرام سے یہ نقل کرسکتے ہیں کہ فلاں محدث یا راوی نے یہ حدیث نہیں سنی یا فلاں روایت میں تدلیس کا شبہ ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے متعلق محدثین کی یہ خاموشی کیسی؟

سوم یہ ہے کہ جمہور علماء کرام نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ حدیث عاصم بن کلیب سے سفیان ثوری نے سُنی ہے۔ ان میں درج ذیل محدثین کرام شامل ہیں۔

(i) امام بخاری علیہ الرحمۃ جزء رفع یدین: ۳۲

(ii)	یحییٰ بن آدم علیہ الرحمہ۔	کتاب العلل: ۳۷۸
(iii)	امام احمد علیہ الرحمۃ	کتاب العلل: ۳۷۸
(iv)	امام ابو حاتم	علل الحدیث: ۲۵۸
(v)	امام دار قطنی	العلل الوردو: ۱۷۳/۵
(vi)	ابن قیم	تہذیب السنن: ۳۶۸/۱
(vii).	ابن قطان	بیان الوھم: ۳۶۸/۳

یہاں میں وضاحت کردوں کہ محدثین کرام نے واضح تصریح کی ہے کہ سفیان ثوری نے یہ روایت عاصم بن کلیب سے سنی ہے مگر "ثم لایعود" کی اضافت میں سفیان ثوری سے وہم ہوا، اور باقی حدیث صحیح ہے۔ غرض یہ کے محدثین کرام نے اس حدیث میں سفیان ثوری پر وہم کا الزام عائد کیا ہے

میری قارئین کرام کو یہ دعوتِ فکر ہے کہ اگر سفیان ثوری نے اس حدیث میں تدلیس کی ہوتو پھر انہوں نے یہ حدیث عاصم بن کلیب سے کیسے سنی؟ اور اگر جس طرح محدثین کرام نے وضاحت کی ہے کہ یہ روایت سفیان ثوری نے عاصم بن کلیب سے سنی ہے تو پھر اس میں تدلیس کس طرح ہوسکتی ہے؟ کیونکہ تدلیس ہوتی ہی وہ ہے جو روایت مذکورہ نہ سنی ہو۔ اور پھر مقام تحقیق یہ ہے کہ اگر یہ حدیث سنی ہی نہیں تو وہم کیسا؟ اگر حدیث سنی ہوتی تو پھر وہم کا الزام صحیح وارد ہوسکتا ہے۔ لہذا کچھ چیزیں واضح ہوتی ہیں۔

(i) اگر حدیث سنی ہے تو تدلیس کیسے ہوئی اور اگر تدلیس ہوئی ہے تو حدیث کیسے سنی؟

(ii) اگر حدیث سنی ہی نہیں تو وہم کا الزام کیسا؟ اگر وہم ہے تو پھر سننا ثابت ہوتا ہے۔

(iii) اور اگر سننا ثابت ہے تو پھر تدلیس نہیں ہوسکتی لہذا تدلیس کا الزام باطل اور مردود ہے۔

امید ہے کہ قارئین کرام اب اس مسئلہ کو سمجھنے لگ گئے ہوں گے حیرانگی یہ ہے کہ یہ باتیں

علماء غیر مقلدین کو نظر کیوں نہیں آتیں؟ وجہ صرف اور صرف احناف کا بغض ہے۔

اعتراض: میرے اس نکتہ (جو ابھی سمجھا چکا ہوں) غیر مقلد زبیر علی زئی نے مناظرانہ اور الزامی جواب کچھ یوں دینے کی کوشش کی:

"جب سفیان ثوری کو اپنے اُستاذ عاصم بن کلیب سے روایت کرنے میں وہم ہوسکتا ہے تو پھر دوسرے مجہول یا مجروح راوی سے روایت کرنے میں وہم کیوں نہیں ہوسکتا۔ اگر ثوری نے عاصم بن کلیب سے یہ روایت مذکورہ سنی تھی تو پھر سماع کی تصریح کہاں ہے؟" (انوار الطریق صفحہ ۸۔۷۹)

جواب: اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ سفیان ثوری پہ اس حدیث میں وہم کا الزام ہے اور وہ بھی صرف ثم لا یعود کے الفاظ پر نہ کہ باقی ساری روایت پر۔ میں نے اپنی دونوں کتابوں میں لکھ دیا تھا کہ ثم یعود کے الفاظ کے بغیر بھی احناف کا موقف ثابت ہوتا ہے۔ اور میں نے ان اقوال کا تحقیقی جواب دے دیا ہے۔ لہٰذا تفصیل کے لئے میری دونوں کتابوں کی طرف مراجعت کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جن دوسرے مجہول یا مجروح راویوں کی روایت میں اگر وہم دلائل سے ثابت ہوجائے تو ہم اس کے قائل ہونگے۔ ہم اصولوں کو ماننے والے ہیں، اور ہم اصول کے تحت ہی تحقیق کرتے ہیں۔ آپکی طرح نہیں کہ ایک دن ایک موقف اور دوسرے دن دوسرا موقف۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس بے اصولی کو رجوع کا نام دیں۔ جناب یہ دھوکا عوام الناس کو تو دے سکتے ہیں مگر علمی میدان میں نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث کی سماع کے لئے یہ شرط نہیں کہ وہ حدثنا، اخبرنا یا سماع کی تصریح کرے۔ کیونکہ اگر مدلس راوی کی روایت میں سماع شیخ معلوم ہوجائے تو تدلیس کا الزام باطل اور مردود ہوجاتا ہے۔ اور عن کا اعتراض ختم ہوجاتا ہے۔

زبیر علی زئی کا عوام الناس کو مغالطہ:

قارئین کرام! زبیر علی زئی غیر مقلد کا انوار الطریق صفحہ ۷۸۔۷۹ پر یہ لکھنا کہ! ''پھر سماع کی تصریح کہاں ہے؟'' ایک دھوکا اور مغالطہ ہے۔ کیونکہ زبیر علی زئی عوام الناس کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کا مغالطے کی تحقیق حاضر خدمت ہے

زبیر علی زئی کا پہلا رُخ:

غیر مقلد حافظ زبیر علی زئی صاحب نے ''الحدیث'' ۷۶ صفحہ ۱۲ پر لکھا تھا!'' کہ سفیان ثوری کی حدیث میں یحییٰ القطان کے محتاج ہیں۔ کیونکہ وہ مصرح بالسماع روایت بیان کرتے تھے۔ (الکفایۃ صفحہ ۳۶۲) اور مزید لکھا کہ!'' امام یحییٰ بن سعید القطان نے فرمایا میں نے سفیان ثوری سے صرف وہی کچھ لکھا ہے جس میں انہوں نے حدثنی اور حدثنا کہا ہے۔ سوائے دو حدیثوں کے (کتاب العلل ۱/۲۵۷)

اس بات کا جواب راقم نے اپنی دوسری کتاب مسئلہ ترک رفع یدین...... مضامین کا جواب صفحہ ۳۶ پر لکھا کہ'' یہاں ہم عرض کر دیں کہ امام یحییٰ بن سعید کی بے شمار ایسی حدیثیں صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں جس میں وہ سفیان ثوری کی عن (یعنی معنعن) روایت بھی لیتے ہیں۔''

زبیر علی زئی کا دوسرا رخ:

میرے مندرجہ بالا اعتراض کا جواب غیر مقلد زبیر علی زئی نے انوار الطریق صفحہ ۶۴ پر کچھ یوں دیا۔

''جب یحییٰ القطان کی سفیان سے ہر روایت سماع پر محمول ہے تو پھر عن والی روایت بیان کرنا ذرہ بھی مضر نہیں اور یہ عنعنہ ثوری کی طرف سے نہیں بلکہ امام یحییٰ بن سعید القطان یا ان کے شاگردوں کی طرف سے ہے۔''

قارئین کرام! ملاحظہ کریں کہ جس طرح زبیر علی زئی نے اپنا رُخ تبدیل کیا اور کس طرح سفیان کے عنعنہ کا دفاع کیا۔ ہم نے جب محدثین کرام سے ثابت کر دیا کہ یہ روایت

سفیان ثوری نے عاصم بن کلیب سے سُنی ہے تو ہم سے سماع کی تصریح مانگی مگر خود یحیٰی بن سعید القطان کے حوالے میں عنعن کو قابل قبول اور عن کی وجہ کسی شاگرد سے ثابت کر رہے ہیں۔

تحقیق : ہمارا دعویٰ بھی یہی ہے کہ جب محدثین کرام کے اقوال سے ثابت ہو گیا کہ سفیان نے یہ روایت عاصم بن کلیب سے سنی ہے تو عنعنہ مضر نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ عنعنہ سفیان ثوری کے کسی شاگرد یا اس کے کسی شاگرد کی طرف سے ہے۔ لہذا اس روایت میں عنعنہ ہونا روایت میں تدلیس ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔ اس طرح اس حدیث پر الزام باطل اور مردود ہے۔ اور سفیان ثوری کی روایت میں ہم سے سماع کی تصریح مانگنا ایک دجل وفریب ہے جبکہ قارئین کرام کو مغالطہ دینے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ بلکہ میں قارئین سے پوچھتا ہوں۔ اگر سفیان ثوری کی عن والی روایت یحیٰی القطان روایت کریں اور یہ عن کا لفظ ذرہ بھی مضر نہ ہو اور یہ عنعنہ یحیٰی القطان یا ان کے شاگردوں کی طرف سے ہو تو یہ معیار اور یہ اصول ترک رفع الیدین والی حدیث میں کیوں نہیں ؟ ہم اپنا موقف کہ یہ روایت سفیان ثوری نے عاصم بن کلیب سے سنی ہے کو امام بخاری، یحیٰی بن آدم، امام احمد، امام ابو حاتم، امام دارقطنی، ابن قیم اور ابن قطان سے ثابت کریں اور غیر مقلد زبیر علی زئی یہ سوال کرے کہ سماع کی تصریح کہاں ہے؟ کیا یہ مسلکی تفاوت اور بغض احناف نہیں؟ فیصلہ میں اپنے قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ پڑھیں، سوچیں اور سمجھیں۔

اعتراض : غیر مقلد زبیر علی زئی حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کی طبقاتی تقسیم پر انوار الطریق صفحہ ۲۲ پر لکھتا ہے۔ ''اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی کی طبقاتی تقسیم کئی وجہ سے غلط ہے مثلاً۔

۱۔ یہ طبقاتی تقسیم جمہور محدثین کے اصول تدلیس کے خلاف ہے۔

۲۔ یہ تقسیم خود حافظ ابن حجر کی شرح نخبۃ الفکر کے اصول کے خلاف ہے۔

۳۔ یہ تقسیم خود حافظ ابن حجر کی التلخیص الحبیر ۱۹/۳ کے خلاف ہے۔
۴۔ اہل حدیث (مراد غیر مقلدین) حنفی بریلوی اور دیوبندی سب اس طبقاتی تقسیم پر متفق نہیں ہیں۔

جواب: یہاں عرض یہ ہے کہ مندرجہ بالا اعتراض غلط ہیں کیونکہ:

۱۔ حافظ ابن حجر کی یہ تقسیم جمہور محدثین کرام کے اصول کے خلاف نہیں بلکہ یہ تو ایک تخصیص اور استثناء ہے۔ زبیر علی زئی خود تو تخصیص اور استثناء کے قائل ہیں۔ مگر حافظ ابن حجر کی تخصیص کرنے پر اعتراض ہے۔ اگر آپ میں ہمت ہے تو کسی ایک کتاب کا نام لکھیں جو مستقلاً حافظ ابن حجر کے طبقاتی تقسیم کے رد پر ہو۔ حافظ ابن حجر کے شاگرد اور دیگر متاخرین نے اپنی کتابوں کی بنیاد حافظ ابن حجر کی کتاب طبقات المدلسین پر ہی رکھی ہے۔ باقی تو رہنے دیں زبیر علی زئی نے اپنی کتاب ''الفتح المبین'' کی بنیاد حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمۃ کی کتاب طبقات المدلسین پر رکھی ہے۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ مدلسین کے طبقات اور اجناس کی تقسیم حافظ ابن حجر کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی کی ہے۔

۲: یہ تقسیم حافظ ابن حجر کی الشرح النخبۃ الفکر کے اصول کے خلاف بھی نہیں بلکہ تخصیص ہے جس کے آپ خود دعویدار ہیں۔ لہذا اعتراض مردود ہے۔

۳: مزید یہ کہ یہ تقسیم حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمۃ کی التلخیص الحبیر کے بھی خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں مسئلہ تدلیس التسویۃ کا ہے، نہ کہ طبقات کی بحث، کسی ایک قول کو لے کر رد تو ثابت نہیں کر سکتے، لہذا آپ کا یہ اعتراض بھی مردود ہے۔

۴: اہم بات یہ کہ حافظ ابن حجر کے طبقاتی تقسیم کے قائل مندرجہ ذیل علماء غیر مقلدین ہیں۔

(i) مولانا مبارک پوری (تحفۃ الاحوذی)

(ii) علامہ بدیع الدین شاہ راشدی (جزء منظوم: ۲۲ قلمی)

(iii) حافظ یحیٰ گوندلوی (الاعتصام جون ۱۹۹۱)

(iv) حافظ عبداللہ روپڑی (فتاوی الحدیث ۶۸/۱)

(v) علامہ محب اللہ شاہ راشدی

(vi) علامہ قاسم راشدی

(vii) حافظ عبدالرؤف غیر مقلد (رسالہ الاعتصام ۱۹۹۰ دسمبر ص ۱۶۰)

(viii) غیر مقلد علامہ محمد خبیب (الاعتصام اگست ۲۰۰۸ ص ۱۶)

(ix) ارشاد الحق الاثری غیر مقلد (توضیح الکلام ۵۹/۱)

(x) حافظ ثناء اللہ زاھدی

(xi) مولانا طاہر رفیق

(xii) حافظ عبدالمنان نورپوری

(xiii) شمس الحق عظیم آبادی وغیرہ۔

یہاں پر عرض یہ ہے کہ جدید قسم کے علماء غیر مقلدین مناظروں میں یا جوابی کتابوں میں غیر مقلد زبیر علی زئی کے مقلد ہیں، ان کی اپنی کوئی تحقیق نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے جدید غیر مقلدین کا حوالہ دینا غلط اور خلاف تحقیق ہے۔

علاوہ ازیں علماء اہلسنت بریلوی اور دیوبندی نے جو تدلیس کا الزام وارد کیا ہے وہ سب کے سب الزامی جواب ہیں۔ زبیر علی زئی غیر مقلد کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ الزامی جواب مناظروں میں تو کام آسکتے ہیں مگر تحقیقی میدان میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور ان علماء احناف نے مکمل طور پر الزامی جواب بھی نہیں بلکہ یہ اصول لکھا ہے کہ آپ خود تو مدلسین کی روایت پر اعتراض کریں مگر خود مدلس راوی سے استدلال بھی کریں۔ علماء اہلسنت کے ایسے تمام اقوال کا جواب میں نے اپنی دوسری کتاب ترک رفع یدین........ مضامین کا جواب صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۶۸ پر دے دیے ہیں۔ لہٰذا تفصیل وہاں ملاحظہ کریں۔

مزید برآں زبیر علی زئی غیر مقلد نے جو ۴۰ حوالہ جات پیش کیے ان میں مندرجہ ذیل حوالہ جات سے ایک بڑا ہی لطیف اصول سامنے آیا ہے۔

حوالہ نمبر ۲ عبدالرحمٰن مھدی۔ حوالہ نمبر ۳ امام احمد حنبل۔ حوالہ نمبر ۴ امام اسحاق بن راھویہ۔ حوالہ نمبر ۵۔ امام المزنی۔ حوالہ نمبر ۶۔ امام بیہقی حوالہ نمبر ۲۰۔ حافظ ابن کثیر حوالہ نمبر ۲۴۔ امام طیبی علیہ الرحمہ۔ حوالہ نمبر ۲۶۔ عمر بن ارسلان البلقینی حوالہ نمبر ۲۷۔ امام الابناسی

ان حوالہ جات سے زبیر علی زئی غیر مقلد نے امام شافعی علیہ الرحمۃ کے اصول اور کتاب پر تعریف، مؤید اور سکوت سے دلیل پکڑی ہے۔ مطلب یہ کہ ان حوالہ جات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کتاب کی تعریف کرنا اور سکوت کرنا اُس دلیل پر رضا مندی اور تصحیح کی علامت ہے۔ لہٰذا اس لطیف نکتہ کو ذہن نشین کر لیں۔ ان شاء اللہ مزید آگے چل کر یہ نکتہ بڑا کام آئے گا اور ہم اس نکتہ کو غیر مقلد زبیر علی زئی کے سامنے پیش بھی کریں گے۔ زبیر علی زئی غیر مقلد کا یہ فرض کہ وہ کسی ایک محدث کا حوالہ پیش کریں جسمیں اس حدیث میں سفیان ثوری کی تدلیس کا اعتراض کیا ہو۔ ورنہ ایسے فضول اعتراض کرنا مردود ہے۔ اس تحقیق سے واضح ہو گیا کہ غیر مقلد زبیر علی زئی کے اس حدیث ترک رفع یدین پر تدلیس کا الزام اصول کی روشنی میں باطل اور مردود ہے۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

تحریر: صادق علی زاہد☆

قادیانیت انگریزی استعمار کی ضرورت اور پیداوار

جب انگریزی استعمار اپنے تمام تر مظالم اور جبر واستبداد کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے دل سے جذبہ جہاد ختم نہ کرسکا تو 1869ء کے اوائل میں برٹش گورنمنٹ نے ممبران برٹش پارلیمنٹ ، برطانوی اخبارات کے ایڈیٹرز اور چرچ آف انگلینڈ کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفد سرولیم میور کی قیادت میں ہندوستان بھیجا تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کو رام کرنے کا کوئی طریقہ دریافت کیا جاسکے۔ برطانوی وفد ایک سال تک بر صغیر میں رہ کر مختلف زاویوں سے تحقیقات کرتا رہا۔ 1870ء میں وائٹ ہال لندن میں اس وفد کا اجلاس ہوا جس میں اس وفد نے برطانوی راج کی ہندوستان میں آمد (The arrival of the british empire in India) کے عنوان سے دو رپورٹس پیش کیں۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے سوا تمام مذاہب کو کفریہ مذاہب سمجھتے ہوئے ان مذاہب کے پیروکاروں کے خلاف مسلح جنگ کو "جہاد" قرار دیکر، جہاد کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کے مذہبی عقیدہ کے مطابق انگریزی حکومت، کافر حکومت ہے اس لئے مسلمان اس حکومت کے خلاف بغاوت اور جہاد میں مصروف رہتے ہیں جو برطانوی حکومت کے لئے مشکلات کا سبب ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی اور مذہبی پیشواؤں کی اندھا دھند پیروی کرتی ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو انگریزی حکومت کے جواز اور اس کے خلاف بغاوت وجہاد کے حرام ہونے کی بابت الہامی سند پیش کردے تو ایسے شخص کو سرکاری سرپرستی میں

☆) 0301،0300-4529446

پروان چڑھا کر اس سے برطانوی مفادات کے لیے مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ان رپورٹس کو مدنظر رکھ کر برطانوی حکومت کے حکم پر ایسے موزوں شخص کی تلاش شروع ہوئی جو برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے سند مہیا کر سکے اور جس کے نزدیک تاج برطانیہ کا ہر حکم وحی کے مترادف ہو۔ایسے شخص کی تلاش ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ، پارنکسن (PARINKSON) کے ذمہ لگائی گئی۔جس نے برطانوی ہند کی سینٹرل انٹیلی جنس کی مدد سے کافی چھان بین کے بعد چار اشخاص کو اپنے دفتر طلب کر کے انٹرویو کیے۔ بالآخر ان میں سے مرزا غلام احمد قادیانی کو برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے نامزد کر لیا گیا اور اس کی سرکاری سرپرستی شروع کر دی گئی۔ مرزا قادیانی کیوں برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے موزوں ترین شخص تھا؟ اس لیے کہ اس کا خاندان شروع سے ہی برطانوی سامراج کی خدمت اور کاسہ لیسی میں مشہور تھا۔اسکا اعتراف خود مرزا قادیانی نے اپنی متعدد تحریروں میں کیا ہے بطور نمونہ چند مثالیں لاحظہ فرمائیں۔

☆......گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ خاندان:

میں ایک ایسے خاندان سے ہوں کہ جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا، جن کو دربار گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسان پنجاب میں ہے اور 1857ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی۔یعنی پچاس سوار اور گھوڑے عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔ان خدمات کی وجہ سے چٹھیات خوشنودی حکام ان کو ملی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سی ان میں سے گم ہو گئیں مگر تین چٹھیات جو مدت سے چھپ چکی ہیں، ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔پھر میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا۔اور جب تموں کے گذر پر مفسدوں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ

سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا۔ (کتاب البریہ ص 5,4,3 مندرجہ روحانی خزائن جلد 13 ص 6,5,4 مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

☆...... پچاس برس سے وفادار جان نثار خاندان:

سرکار دولتمدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جان نثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں، اس خود کاشتہ پودہ کی نسبت نہایت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ہمارے خاندان نے سرکاری انگریزی کی راہ میں اپنے خون بہانے اور جان دینے سے فرق نہیں کیا۔ (مجموعہ اشتہارات جلد سوئم ص 21 از مرزا غلام احمد قادیانی)

☆...... سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں پچاس الماریاں:

میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ (تریاق القلوب ص 28,27 مندرجہ ذیل روحانی خزائن جلد 15 ص 156,155 از مرزا غلام احمد قادیانی)

☆...... مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے:

میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے۔ کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔ (مجموعہ اشتہارات جلد سوئم ص 19 از مرزا غلام احمد قادیانی)

☆......برطانوی گورنمنٹ کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے:

بعض احمق اور نادان سوال کرتے ہیں۔ کہ اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے، یا نہیں۔ سو یاد رہے کہ یہ سوال ان کا نہایت حماقت کا ہے کیونکہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے، اس سے جہاد کیسا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے۔ (اشتہارات القرآن ص 84۔ مندرجہ روحانی خزائن جلد 6 ص 380 از مرزا قادیانی)

☆......جیسی خدا تعالیٰ کی اطاعت ویسی اس سلطنت کی اطاعت:

سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں، دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں ہمیں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے۔ (اشتہارات القرآن ص 84 مندرجہ روحانی خزائن جلد ص 380 از مرزا قادیانی)

☆......انگریزی سلطنت ایک رحمت و برکت ہے:

سو یہی انگریز ہیں جن کو لوگ کافر کہتے ہیں جو تمہیں ان خونخوار دشمنوں سے بچاتے ہیں اور ان کی تلوار کے خوف سے تم قتل کیے جانے سے بچے ہوئے ہو۔ ذرا کسی اور سلطنت کے زیر سایہ رہ کر دیکھ لو کہ تم سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ سو انگریزی سلطنت تمہارے لیے ایک رحمت ہے۔ تمہارے لیے ایک برکت ہے اور خدا کی طرف سے تمہاری وہ سپر ہے۔ پس تم دل و جان سے سپر کی قدر کرو۔ (مجموعہ اشتہارات جلد سوئم ص 584 از مرزا غلام احمد قادیانی)

☆......دنیا میں آنے کا مقصد گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی:

ہم دنیا میں فروتنی کے ساتھ زندگی بسر کرنے آئے اور بنی نوع کی ہمدردی اوراس گورنمنٹ کی خیر خواہی جس کے ہم ماتحت ہیں یعنی گورنمنٹ برطانیہ۔ ہمارا اصول ہے۔ ہم ہرگز کسی مفسدہ اور نقض امن کو پسند نہیں کرتے اور اپنی گورنمنٹ انگریزی کی ہر ایک وقت میں مدد کرنے کے لیے تیار ہیں اور خدا تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں جس نے ایسی گونمنٹ کے زیر سایہ ہمیں رکھا ہے۔ (کتاب البریہ ص 17 اشتہار مورخہ 20 ستمبر 1897ء مندرجہ روحانی خزائن جلد 13 ص 18 مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)

ان حوالہ جات کی روشنی میں قادیانیت کی وجہ تخلیق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مرزا قادیانی استعماری سیاست کا خود کاشتہ پودا تھا۔ انگریز نے اپنے نظریہ ضرورت کے تحت قادیانی تحریک کو پروان چڑھایا۔ جناب مرتضیٰ احمد خاں میکش بھی رقمطراز ہیں۔ دین مرزا برطانیہ کی استعماری سیاست کا ایک خود کاشتہ پودا ہے یعنی ایک ایسی سیاسی تحریک ہے جو انگریزوں کے مقبوضہ ہندوستان میں ایک ایسی مذہبی جماعت پیدا کرنے کے لیے شروع کی گئی جو سرکار برطانیہ کی وفاداری کو اپنا جزو ایمان سمجھے، غیر اسلامی حکومت یا نامسلم حکمرانوں کے استیلا کو جائز قرار دے اور ایک ایسے ملک کو شرعی اصطلاح میں دارالحرب سمجھنے کے عقیدہ کا بطلان کرے جس پر کوئی غیر مسلم قوم اپنی طاقت وقوت کے بل پر قابض ہوگئی۔ انگریز حکمرانوں کی قہاریت اور جباریت کو مسلمان از روئے عقیدہ دینی اپنے حق میں اللہ کا بھیجا ہوا عذاب سمجھتے تھے اور ان کی رضا کارانہ اطاعت کو گناہ متصور کرتے تھے۔ انگریز حکمران مسلمانوں کے اس جذبے اور عقیدے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ لہذا انہوں نے اس سرزمین میں ایک ایسا پیغمبر کھڑا کر دیا جو انگریزوں کو اولی الامر منکم کے تحت میں لا کر ان کی اطاعت کو مذہباً فرض قرار دینے لگا اور ان کے پاس ہندوستان کو دارالحرب سمجھنے والے مسلمانوں کی مخبری کرنے لگا جس طرح باغبان اپنے خود کاشتہ پودے کی حفاظت و آبیاری میں بڑے اہتمام سے کام لیتا ہے، اسی طرح سرکار انگریزی نے دین

مرزائیت کو فروغ دینے کے لیے مرزائی جماعت کو پرورش کرنا اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے ضروری سمجھا۔ اور اس دین کے پیروؤں سے مخبری، جاسوسی اور حکومت کے ساتھ جذبہ وفاداری کی نشرواشاعت کا کام لیتی رہی۔ **1919**ء میں جب مولانا محمد علی رحمتہ اللہ علیہ نے خلافت اسلامیہ ترکی کی شکست سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو انگریزوں کی قابو چیانہ گرفت سے چھڑانے اور ارض مقدس کو عیسائیوں کے ہاتھ میں جانے سے بچانے کے لیے تحریک احیائے خلافت کے نام سے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی مہم شروع کی اور عام مسلمان مولانا محمد علی اور دیگر زعمائے اسلام کی دعوت ونفیر پر کان دھر کر انگریزی حکومت سے ترک موالات کرنے پر آمادہ ہو گئے، تو مرزائی جماعت نے اس دور کے وائسرائے کے سامنے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے سرکار انگریزی کو یقین دلایا کہ مسلمانوں کے اس جہاد آزادی کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کے خادم موجود ہیں، جو سرکار انگریزی کی وفاداری کو مذہبی عقیدہ کے رو سے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ (پاکستان میں مرزائیت صفحہ **25** تا **27** از مرتضیٰ احمد خان میکش)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

مفتی سید صابر حسین (کراچی) ☆

اسلام اور رسک مینجمنٹ (Risk Management)

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے اور فطرتِ انسانی کا تقاضا بھی کہ انسان ماضی کے پیش آمدہ خطرات و مسائل کی روشنی میں خود کو حال کے وقوع پذیر اور مستقبل کے ممکنہ خطرات و مسائل سے بچانے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کرے اور ان خطرات کو یا تو مکمل طور پر ختم کرلے یا پھر ممکنہ حد تک ان میں کمی کرنے کی بھرپور کوشش کرے۔ تاریخ انسانی کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے کے لوگوں نے اپنی اپنی بساط اور علم و آگہی کی بنیاد پر رسک مینجمنٹ (Risk Management) کو اپنایا اور خود کو خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوششیں کی۔ جسم کو موسم و ماحول کے مضر اثرات سے بچانے کی خاطر مختلف قسم کے لباس اور رہائش کا انتظام کیا اور ایسی خوراک کا انتخاب کیا، جن کے استعمال سے وہ خود کو موسمی بیماریوں سے بچا سکیں۔

اس حوالے سے اگر ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری سے قبل یعنی زمانۂ جاہلیت کے معاملات کو دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اہلِ عرب میں بھی خطرات (Risks) کو کم یا کسی حد تک ختم کرنے کے لئے مختلف نوعیت کے طریقۂ کار مروج و معروف تھے مثلاً عاقلہ، ضمان خطر الطریق اور قبیلۂ بنو اشعر کا عمل وغیرہ۔ مذکورہ صورتوں میں سے بعض کو زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں من وعن (As it is) جاری رکھا گیا اور بعض کو کچھ ضروری ترمیم (Alteration) اور اصلاح (Rectification) کے ساتھ قبول کرلیا گیا۔ علاوہ ازیں ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی احادیثِ مبارکہ میں تحسین بھی فرمائی۔ قارئین کرام کی معلومات کے لئے عاقلہ، ضمان خطر الطریق اور قبیلۂ بنو اشعر کے عمل کی اختصار

☆) 0321-2880864

کے ساتھ وضاحت ضبطِ تحریر میں لائی جارہی ہے۔ ان میں سے عاقلہ کے تحت یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی قبیلے کا کوئی شخص کسی دوسرے قبیلے کے کسی فرد کو غلطی سے قتل کردیتا، تو مقتول کے ورثاء کو دیت (جو سو اُونٹ یا دس ہزار درہم یا ایک ہزار دینار یا ان کے مساوی قیمت ہے) دی جاتی تھی، جو قاتل اکیلا ادا نہیں کرتا تھا بلکہ اُس کے قبیلے کے افراد مجموعی طور پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآں ہوتے تھے۔ اس طریقہ کار سے ایک شخص کا رسک پورے قبیلے میں تقسیم ہوجاتا، جس کی وجہ سے ہر شخص اسے بآسانی برداشت کرلیتا تھا کیونکہ کسی اکیلے شخص کے لئے سو اُونٹ یا اُن کی قیمت کا ادا کرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ خطرات (Risks) کو کم کرنے کا یہ طریقہ کار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بھی جاری رہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے پسند بھی فرمایا بلکہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی حیات طیبہ میں اپنے قبیلے کی طرف سے عاقلہ کے نظام کے تحت دیت ادا کی تھی۔ جبکہ ضمان خطر الطریق بھی خطرات کو کم کرنے اور ایک دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا ایک طریقہ تھا، جس کے تحت عام طور پر تاجر حضرات کو اپنے سامان تجارت محفوظ طریقے سے کسی راستے سے لیجانے کی ضمانت دی جاتی تھی کہ اگر راستے میں کسی قسم کا مالی نقصان ہوا، تو ضامن (Guarantor) اُس نقصان کا ازالہ کریگا۔ خطرات کو کم کرنے کا یہ طریقہ اسلام میں جائز رکھا گیا۔ عصرِ حاضر میں ٹریولنگ انشورنس (Travelling Insurance) ضمان خطر الطریق کی مثال ہے، اگرچہ اس کی عملی صورت شرعی اعتبار سے درست نہیں۔ جہاں تک قبیلہ بنی اشعر کا تعلق ہے، تو اس حوالے سے روایتوں میں آتا ہے کہ قحط سالی خصوصاً جہاد کے موقع پر اس قبیلے کا ہر شخص اپنا سامان ایک چادر میں ڈال دیتا تھا اور بعد میں اُن تمام سامان کو خلط ملط (Mix) کرکے ایک مخصوص برتن سے قبیلے کے تمام افراد میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کردیا جاتا تھا۔ روایتوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبیلۂ بنو اشعر کے اِس عمل کو پسند فرمایا اور ارشاد

فرمایا: انا منهم وهم منی ترجمہ: ''میں اُن میں سے ہوں اور وہ مجھ سے ہیں''۔ لہذا اس طرح کے عمل سے وہ لوگ بھوک کی متوقع خطرے کو دور کر لیا کرتے تھے۔

اسی طرح قرآنِ مجید میں بھی رسک مینجمنٹ کے حوالے سے کئی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً جان بچانے اور انتہائی ناگزیر حالات میں دل میں ایمان پر قائم رہتے ہوئے وقتی طور پر کلمۂ کفر کہنے کی اجازت رسک مینجمنٹ کی ایک نظیر ہے اور اسے فقہاءِ کرام (Islamic Jurist/Experts of Islami Law) نے حالت اکراہ (Constraint) سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهٖٓ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ☆ ترجمہ: ''جس نے ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کیا (اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اس کے لئے بڑا عذاب ہے) مگر جس پر جبر (اکراہ) کیا گیا اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے (اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے)، (سورہ نحل، آیت نمبر ۱۰۶)۔'' یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب کہ مشرکین نے کلمۂ کفر بولنے پر انھیں مجبور کیا اور انھوں نے زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا پھر جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم نے اپنے دل کو کس حال پر پایا: عرض کی: میرا دل ایمان پر بالکل مطمئن تھا ارشاد فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو تم کو ایسا ہی کرنا چاہئے یعنی دل ایمان پر مطمئن رہنا چاہئے۔ اسی طرح میدانِ جنگ میں اپنی بچاؤ کے لئے عام حالات سے ہٹ کر نمازِ خوف ادا کرنے کا حکم بھی رسک مینجمنٹ کی ایک بہترین مثال ہے، جیسا کہ اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا: وَإِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ

وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ☆ ترجمہ: ''اور (اے محبوب) جب آپ ان میں ہوں اور (خوف کے وقت) انہیں نماز پڑھائیں تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لئے رہیں، پھر جب وہ سجدہ کرلیں تو (اے مسلمانو!) وہ تمہارے پیچھے چلے جائیں اور آئے دوسرا گروہ، جنہوں نے نماز نہیں پڑھی تو انہیں چاہیے کہ وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ (بھی) اپنی حفاظت کا سامان اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔ کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم غافل ہو جاؤ اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے تو وہ تم پر یکبارگی حملہ کردیں اور تم پر کچھ مضائقہ نہیں اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو (اس بات میں) کہ اپنے ہتھیار (اتار کر) رکھ دو اور اپنی حفاظت کا سامان لئے رہو۔ بے شک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کیلئے ذلت کا عذاب۔ (سورۂ نساء، آیت نمبر ۱۰۲، ترجمہ ماخوذ از البیان القرآن الحکیم)۔'' مذکورہ آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو صلوٰۃ الخوف کی اجازت بلکہ حکم دیا جارہا ہے۔ اور صلوٰۃ الخوف اس وقت ادا کی جاتی ہے جب مسلمان فوج اور کافروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار ہوں اور ایک لمحے کی غفلت مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی ہو۔ صلوٰۃ الخوف کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں مثلاً فوج دو گروہ میں تقسیم ہوجائیں، جن میں سے ایک گروہ دشمن کے بالمقابل کھڑا رہے تاکہ انہیں حملہ کرنے کی جسارت نہ ہو اور ایک گروہ اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کرے اور جب یہ گروہ نماز سے فارغ ہوجائے تو یہ پہلے کی جگہ مورچہ زن ہو کر انہیں کو نماز کا موقع دے اور اس طرح نماز کی تکمیل کرے۔ صلوٰۃ الخوف کے اس طریقے سے بھی اسلام میں رسک مینجمنٹ پر روشنی پڑتی ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کی بیان کردہ تعبیر کے واقعہ میں بھی رسک مینجمنٹ کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے مستقبل میں پیش آمدہ رسک (خطرات) کو کور (Cover) کرنے کے لئے اناج ذخیرہ کرنے کی تدبیر بتائی۔ قرآنِ مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ☆ ترجمہ: ''فرمایا (یوسف نے) تم حسب عادت سات برس تک کھیتی کروگے، تو جو کھیتی تم کاٹو اسے اس کی بالی میں چھوڑ دو مگر تھوڑا سا جتنا تم کھاؤ، (سورۃ یوسف، آیت نمبر ۴۷، ترجمہ ماخوذ از البیان القرآن الحکیم)۔'' سورۃ یوسف کی اس آیت کریمہ پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر کا علم عطا فرمایا تھا لہذا انہوں نے جان لیا کہ قوم آئندہ آنے والے سالوں میں ایک خطرے سے دوچار ہوگی لہذا نہ صرف انہوں نے قوم کو خطرے سے آگاہ فرمایا بلکہ انہیں اس خطرے سے بچنے کی تدبیر بھی بتادی کہ قوم سات سال تک متواتر کاشتکاری کرے اور جو غلہ تیار ہو اسے کاٹ کر بالیوں سمیت ہی ذخیرہ کرلیں تاکہ اُن میں غلہ محفوظ رہے اور جب قحط سالی پڑے تو وہ ذخیرہ شدہ غلے کو استعمال کرسکیں۔ اسی طرح سورۃ کہف میں مذکور حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے کشتی والے واقعہ میں بھی رسک مینجمنٹ کا تصور موجود ہے، یعنی اس امکانی خطرے کے تدارک کے لئے کہ بادشاہ اچھی کشتی کو غصب کرلیتا تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے مسکینوں کی کشتی کو عیب دار بنادیا۔

بعض ماہرین رسک مینجمنٹ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت کو رسک مینجمنٹ کی بہترین عملی مثال قرار دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ اقدس کا جب کفار نے حصار کرلیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر اپنی سبز چادر مبارک کے ساتھ لٹا دیا تاکہ کفار کی توجہ اس بستر پر رہے اور آپ بڑی آسانی کے ساتھ مکان مبارک سے نکل سکیں لہذا ایسا ہی ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ

(بقیہ صفحہ نمبر 37 پر)

حافظ مفتی سردار علی خان☆

مسائل شرعیہ اور اُنکا حل

سوال نمبر 1: اللہ میاں کہنا کیسا ہے؟ السائل: حاجی اسد علی (پوڑ میانہ اٹک)

جواب: اللہ تعالیٰ کی ذات بہت ارفع واعلیٰ اور برتر و بالا ہے۔ کوئی شئی اسکی مثل نہیں ہے۔ اسمائے الٰہی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو کہہ کر پکارو سب اسی کے اچھے نام ہیں''۔ (کنز الایمان) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱۰۔ نیز فرمایا: (ترجمہ) ''اور اللہ ہی کے ہیں بہت اچھے نام تو اسے ان سے پکارو اور انھیں چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں حق سے نکلتے ہیں وہ جلد اپنا کیا پائیں گے''۔ (کنز الایمان) سورہ الاعراف آیت ۱۸۰۔ تفسیر جلالین کے حاشیہ میں ہے: (ترجمہ) حسنیٰ ہونے کا معنی ہے کہ تمام اسمائے الٰہی تقدیس، تعظیم، تمجید (بزرگی) اور صفات جلال وکمال پر مشتمل ہیں''۔ (تفسیر جلالین ص ۲۳۹)۔ ''میاں'' کے معانی فیروز اللغات میں یہ لکھے ہیں: آقا، والی، وارث، خداوند، مالک، سرکار، حضور، حاکم، سردار، (۲) صاحبزادہ، بیٹا۔ (۳) خاوند، شوہر، خصم۔ (۴) جناب، جناب عالی۔ (۵) یار، دوست، بھائی۔ (۶) استاد۔ (۷) شہزادہ، صاحب عالم، امیر زادہ، (فیروز اللغات ص ۱۳۹۰ م ی)۔ ان میں کئی معانی خدا کی شان کے لائق نہیں ہیں۔ جبکہ تفسیر مظہری عربی ص ۴۳۸/۳ مطبوعہ کوئٹہ میں بھی ہے کہ اسمائے الٰہی تعظیم پر مشتمل ہوں۔ امام احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں! ''سوال میں اسم جلالت (اسم اللہ) کے ساتھ لفظ میاں مکتوب ہے یہ ممنوع ومعیوب ہے۔ زبان اردو میں

☆) شیخ الحدیث و مفتی جامعہ رضویہ انوار العلوم H-24 واہ کینٹ، 0300-5493829

''میاں'' کے تین معنی ہیں جن میں دو اس پر محال ہیں اور شرع سے ورود نہیں لہذا اسکا اطلاق محمود نہیں''۔ (فتاویٰ رضویہ ص ۲۹ جلد ششم مطبوعہ کراچی)۔لہذا اس طرح کہنے لکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سوال نمبر 2: نماز شروع کرنے سے پہلے اگر انسان موبائل بند کرنا بھول جائے اور دوران نماز کال آجائے تو کیا اسے حالت نماز میں ہی بٹن دبا کر بند کر سکتے ہیں۔ اگر کر سکتے ہیں تو کس طرح؟۔ السائل: مسعود عجائب، (جاتلی گوجر خان)

جواب: فقہائے کرام علیہم الرحمۃ نے صراحت سے لکھا ہے کہ عمل کثیر سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ لہذا اگر عمل قلیل (جسے کرتے ہوئے دیکھنے والا یہ گمان نہ کرے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا ہے) سے بند کر سکتا ہے تو کر دے ورنہ نماز کو ٹوٹنے سے بچائے۔ اس بارہ میں ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اوقات نماز کا ضرور خیال رکھا جائے۔ نیز پھر بھی اگر اوقات نماز میں (کال کرنے والا) تین بار ٹون جانے کے بعد فون بند کر دے اور لمبی گھنٹی نہ دی جائے تو بہت بہتر ہوگا۔ یعنی فون کرنے والا تین بار اپنے فون کی آواز سنائی دینے کے بعد فون بند کر دے۔

سوال نمبر 3: بعض لوگوں نے قرآنی آیات کو اپنے موبائل میں بطور ٹونز لگا رکھا ہے۔ جب کال آتی ہے تو آیت کی تلاوت کی آواز آتی ہے۔ جب بٹن دبایا جاتا ہے تو آیت نامکمل رہ جاتی ہے اسکے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ السائل: چودھری ریاض (واہ کینٹ)

جواب: آج کے جدید دور میں موبائل فونز پر طرح طرح کی ٹونز ہوتی ہیں۔ بندہ کے خیال میں چونکہ موبائل آدمی کی جیب میں ہوتا ہے اور کال کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کب آجائے۔ لیٹرین میں بھی آجاتی ہے۔ لہذا تلاوت نعت درود پاک یا کوئی اسلامی شعار کی ٹون نہ لگائی جائے تاکہ توہین نہ ہو۔ اسی طرح تلاوت کو درمیان سے بند کرنا بھی اس سے نفرت کا اشارہ سمجھا جا سکتا ہے یعنی توہین کا شائبہ ہو سکتا ہے لہذا ایسی ٹونز سے اجتناب ہی بہترین حل

سوال نمبر 4: مسجد میں اگر نمازی جماعت کے انتظار میں بیٹھے ہوں تو کیا انہیں سلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ السائل: رانا محمد شکیل (واہ کینٹ)

جواب: سلام اسلام کا شعار اور امن وسلامتی کی ایک جامع ہمہ وقتی دعا ہے۔ مگر کمال یہ ہے کہ سلام کے آداب ومواقع ہیں۔ مسئولہ صورت کے متعلق فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (ترجمہ) سلام ملاقاتیوں کی دعا ہے اور جو لوگ مسجد میں تلاوت قرآن مجید، تسبیح (ذکر اذکار) یا نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں وہ آنے والوں سے ملنے کیلئے نہیں بیٹھے ہوتے اس واسطے یہ سلام کرنے کا وقت (موقع) نہیں ہے لہذا انہیں (بیٹھے ہوؤں کو) سلام نہ کیا جائے اسی واسطے علماء نے فرمایا ہے کہ اگر آنے والے نے بیٹھے ہوئے نمازیوں کو سلام کیا تو انہیں اجازت ہے کہ سلام کا جواب نہ دیں۔ یوں ہی منیہ میں لکھا ہے"۔ (فتاویٰ عالمگیری ص ۳۲۵/۵ مطبوعہ کوئٹہ ۱۹۸۶ء) یعنی آنے والے نے بے موقعہ محل کام کیا ہے لہذا جواب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم واحکم بالصواب

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شعبان المعظم

اختتام سحر اور اذان فجر
ایک تحقیقی مقالہ (مدیر اعلیٰ کے قلم سے)

قبر سے حصول فیض
کرنل (ر) الطاف محمود ہاشمی کی منفرد تحریر

مسائل شرعیہ اور ان کا حل
مفتی رضاء المصطفیٰ ظریف القادری

محیا الحق فی کشف ظلمات زبیر علی زئی (2)
غیر مقلد حافظ زبیر علی زئی کے شبہات کا ازالہ

مسائل روزہ

اسلام میں گداگری کی ممانعت
از قلم علامہ پیر تبسم بشیر اویسی

محدث بریلوی پر اعتراض کا جواب
ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

"زبدۃ التحقیق" کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ
فیصل خان کا علمی مقالہ

التحقیقات الاسلامیہ فاؤنڈیشن

مکاتب و سلسلہ

نوٹ: نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری مضمون نگار پر ہوگی

Email:alburhanwah@gmail.com
Email:zaf.wah786@gmail.com

مکتبہ فیضانِ سنت دکان نمبر 28 سیلاد چوک واہ کینٹ
0343-5942217
0302-5122663

فہرست

اداریہ

صدائے دل

ہماری پالیسی

اہل سنت و جماعت کے عقائد و معاملات میں سلف صالحین اور امام اہل سنت مجدد دین وملت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ کی تحقیقات، تصریحات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہر معاملے اور ہر مسئلے میں ہم ان کی تعلیمات کو مقدم رکھیں گے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے بعد ان کے خلفاء اور تلامذہ کی تحقیقات سے بھی ہم ضرور رہنمائی لیں گے۔

دور حاضر میں اہل سنت و جماعت کے اندر گروپ بندی کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس میں اگر ہم کسی مسئلہ پر کسی کا موقف سلف صالحین اور امام اہل سنت کے خلاف پائیں گے تو اس پر اہل سنت کا موقف دلائل و براہین کے ساتھ ضرور پیش کریں گے۔ مجلہ میں اگر کوئی ایسی تحریر شائع ہوگئی جو کہ قابل گرفت ہو تو اس کی نشاندہی ہونے پر ہم معذرت کرنے میں کبھی بھی نہیں ہچکچائیں گے۔ مجلہ میں شامل کسی بھی مضمون سے اگر کسی کو علمی اختلاف ہو تو اس کے جواب کے لیے ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ بد مذہبوں کے عقائد کا رد کرتے ہوئے ہم تہذیب و متانت کا دامن ہرگز نہیں چھوڑیں گے بلکہ دلائل و براہین سے ان کا ابطال کریں گے اور اپنے مسلک کی حقانیت کو واضح کریں گے۔

اسے کیا کہیے؟

ایبٹ آباد میں امریکہ نے ایک فوجی آپریشن کے دوران اسامہ بن لادن کو ہلاک کر دیا ہے۔ ہم نہ صرف امریکہ بلکہ ہر اس تنظیم، گروہ اور ایسے تمام لوگ جو بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے میں شامل ہیں ان کی مذمت کرتے ہیں۔ اللہ کریم ان سب کو ہدایت عطا فرمائے اور اگر

ہدایت ان کے نصیب میں نہیں ہے تو ان کو تباہ و برباد فرمائے۔

ہمارے ایک معاصر مجلّہ کے مدیر محترم نے اپنے مجلّہ کے اداریہ میں اُسامہ بن لادن کی ہلاکت کے حوالے سے لکھا ہے کہ؛ ''اُسامہ کو امریکی فوجی ہلاک نہ کرتے تو بالیقین بیماریاں انھیں ہلاک کر دیتیں مگر اللہ نے اُسامہ کی قسمت میں بستر پر نہیں بلکہ امریکی قذاقوں کے ہاتھوں شہادت کی موت لکھی تھی جو کہ منصب عظیم ہے اور یہ بھی زندہ حقیقت ہے کہ جب تک امریکی وصیہونی دہشتگردی جاری رہے گی تب تک اُسامہ جیسے جانباز جنم لیتے رہیں گے۔۔۔۔۔ کبھی بصورت حسین، کبھی بصورت صلاح الدین ایوبی، کبھی بصورت ٹیپو سلطان، کبھی بصورت فضل حق خیر آبادی اور کبھی بصورت اُسامہ بن لادن پھر اچانک آواز گونجے گی جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا''۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ اُسامہ بن لادن شہید ہے یا نہیں۔ نہ ہم بعض دانشوروں کی اس بات کو موضوع سخن بنانا چاہتے ہیں کہ اُسامہ بن لادن کے کردار سے عالم اسلام کو کیا فائدہ پہنچا اور انہوں نے اسلام کی کون سی خدمت سرانجام دی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں مسلمان غیر مسلموں کی نظر میں نفرت کا نشان بن گئے ہیں۔ لیکن ہمیں گلہ ہے کہ ہمارے ملک پاکستان کے اندر علماء اور مشائخ اہل سنت کو شہید کیا گیا۔ ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ہمارے مدارس اور مساجد کو خودکش حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اُسامہ بن لادن یا اس کے ساتھیوں کی طرف سے ایک دفعہ بھی نہ تو ان حملوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا اور نہ ہی ان کی مذمت کی گئی۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ مدیر موصوف نے نہ صرف اُسامہ بن لادن کو شہید قرار دیا ہے بلکہ ان کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، صلاح الدین ایوبی، فضل حق خیر آبادی جیسے مجاہدین اسلام کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ فیا للعجب!

ٹوٹتے بنتے اتحادوں میں رہ رہ کر لگتا ہے کہ بعض لوگ اپنی فکر بھی گنوا بیٹھے ہیں اور کوا چلا

ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا کے مصداق بن گئے ہیں۔

اہل سنت میں انتشار

اگرچہ انتشار تو دیگر مکاتب فکر کے اندر بھی ہر طرح کا اور ہر سطح پر موجود ہے لیکن اہل سنت کے اندر تو اس کے اثرات کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگے ہیں اور بجائے کم ہونے کے یہ مزید گہرا ہوتا جارہا ہے۔ تنظیمی انتشار تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ اب فکری انتشار بھی آہستہ آہستہ سامنے آرہا ہے۔ اگر اکابر علماء و مشائخ نے اس طرف توجہ نہ دی اور اسے ختم کرنے کی سنجیدہ کوششیں نہ کیں تو نہ صرف یہ کہ انتشار مزید بڑھے گا بلکہ باقاعدہ ایک نیا طبقہ فکر بن جائے گا جو آگے چل کر ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنے گا۔

اندرونی چپقلش اور انتشار کی وجہ سے ملکی سطح پر مختلف معاملات میں ہماری کوئی آواز اور موقف سامنے نہیں آسکتا۔ اگر کوئی موقف سامنے آتا بھی ہے تو اس میں وہ قوت نہیں ہوتی جو کہ مقتدر قوتوں کو متوجہ کر سکے۔ قد آور شخصیات کا میدان میں نہ ہونا یا جو میدان میں موجود ہیں ان کا اپنی شخصیت کو منوا نہ سکنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ لیکن ہم بول کر اپنے دل اور ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔

اہل سنت و جماعت میں اتحاد و یکجہتی کی جتنی اس وقت ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ یہ اتحاد و یکجہتی فکری و تنظیمی سطح پر انتہائی ناگزیر ہو چکا ہے۔ تنظیمی انتشار سے پہلے فکری انتشار کا خاتمہ انتہائی ضروری ہے۔ گذشتہ دہائی میں کچھ نئے افکار نے راہ پائی ہے۔ جن کا پہلے وجود نہیں تھا یا اگر وجود تھا تو کوئی اہمیت و حیثیت نہ تھی۔ لیکن اب بعض اہل علم کی طرف سے ان کو پروان چڑھانے کی کاوشیں ہو رہی ہیں اور بات مناظروں تک جا پہنچی ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ عقائد و معاملات میں نت نئے امام نہ بنائے جائیں بلکہ سلف صالحین اور امام اہل سنت امام الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ جیسی آفاقی اور متفقہ شخصیات کی تعلیمات و افکار کو ہی مشعل راہ بنایا جائے۔ خصوصاً عقائد کے معاملات میں جو چیزیں سلف صالحین اور امام احمد رضا خان

محدث بریلوی علیہ الرحمہ تک متفق علیہ ہیں ان کو قطعاً نہ چھیڑا جائے۔فروعی مسائل میں بھی اگر حالات حاضرہ کے تناظر میں اختلاف کرنا ناگزیر ہو جائے تو ہرایرا غیرا اختلاف کرنے نہ بیٹھ جائے بلکہ مستند و معتبر علماء کی ایک جماعت یہ فریضہ سرانجام دے ورنہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچے گی۔

تنظیمی انتشار کے حوالے سے عرض ہے کہ سب سے پہلے تمام تنظیموں کے عہدیدار اپنی انا کو ختم کریں اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس بات پر تیار کریں کہ ہر حال میں ہم نے متحد ہونا ہے۔ اس بات کا تہیہ کریں کہ دوسروں کی ترقی اور کامیابی کا زینہ بننے کے بجائے اپنوں کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔اس کے بعد انتہائی اجلہ علماء و مشائخ جن کو ہر سطح پر احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اتفاق رائے سے ان پر مشتمل ایک سپریم کمیٹی بنائی جائے۔کمیٹی کے بن جانے کے بعد تمام تنظیموں کے عہدیدار مستعفی ہو جائیں۔اس کے بعد کمیٹی انتخابات کرا کے تمام ذمہ داریاں منتخب عہدیداروں کو سونپ دے۔انتخاب سے پہلے تمام امیدواروں سے یہ حلف لے لیا جائے کہ وہ نتائج کو تسلیم کریں گے۔اس کے بعد جو انتشار پھیلانا چاہے اس سے ہر سطح پر بائیکاٹ کیا جائے۔اس طریقہ سے اگر جمعیت علماء پاکستان اور جماعت اہل سنت پاکستان کا نیا ڈھانچہ اتفاق رائے سے وجود میں آ جائے تو غنیمت ہوگا۔

ع شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

انبیاء کرام کی توہین کیوں؟

کیبل پر موجود ایک ٹی وی چینل آج کل یوسف علیہ السلام کے بارے میں ایک فلم دکھا رہا ہے جس میں دو اداکار یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کا کردار ادا کر رہے ہیں جو کہ سراسر ان انبیاء کرام کی توہین ہے۔لہٰذا خود بھی یہ فلم دیکھنے سے اجتناب کریں۔اپنے اہل خانہ اور بچوں کو بھی اس سے دور رکھیں کیونکہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔

مدیر اعلیٰ افضل شاہد اعوان

تحریر: ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شعبان المعظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

''ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر اشھراً فی کتاب اللہ ''۔(سورۃ توبہ آیت ۳۶) ترجمہ: بے شک مہینوں کی گنتی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ان بارہ مہینوں میں ترتیب کے لحاظ سے آٹھواں مہینہ شعبان المعظم ہے جو کہ رجب المرجب اور رمضان المبارک کے درمیان ہے جیسا کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے!

''عن اسامہ بن زید قال قلت یا رسول اللہ ﷺ لم ارک تصوم شھراً من الشھور مات صوم من شعبان قال ذالک شھر یغفل الناس عنہ بین رجب و رمضان وھو شھر یرفع فیہ الاعمال الی رب العالمین فاحب ان یرفع عملی وانا صائم ''۔

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں آپ کو تمام مہینوں سے زیادہ شعبان المعظم میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ مہینہ ہے جس سے لوگ غافل ہیں۔ (یعنی اس کی شان وفضیلت سے) رجب اور رمضان کے درمیان یہ وہ مہینہ ہے جس میں (بندگان خدا کے) اعمال رب العالمین کی بارگاہ میں اٹھائے جاتے ہیں۔ پس میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میرا عمل اٹھایا جائے تو میں حالت روزہ میں ہوں۔ (سنن نسائی مترجم ۲/۱۰۸ رقم ۲۳۶۱، سنن الکبریٰ بیہقی ۲/۷۷ رقم ۲۶۷۹، مسند احمد ۵/۲۰۱، مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۹۳۶، مسند البزار ۷/۶۹، شرح معانی الآثار طحاوی ۲/۸۲)

۱) اس حدیث کی امام ابن خزیمہ نے تصحیح فرمائی۔ (فتح الباری ۵/۲۷۹)

۲) غیر مقلدین کے علامہ ناصر الدین البانی نے اس کو حسن کہا۔ اور احادیث الصحیحہ ۴/۵۲۲ رقم

۱۸۹۸ میں ذکر کیا۔

۳) غیر مقلدین کے مولانا ارشاد الحق اثری نے بھی اسکو حسن کہا۔ دیکھئے: (تبیین العجب بما ورد فی فضل رجب ۲۳ حاشیہ نمبر۱۴)

شعبان المعظم کی وجہ تسمیہ:

امام بدرالدین عینی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں!

''اور شعبان شعب سے مشتق ہے۔ اور وہ اجتماع ہے۔ اس کے نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں خیر کثیر رمضان المبارک کی طرح جمع کی جاتی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ متفرق ہونے کے بعد اس میں جمع ہوتے تھے۔ اور وہ وہ جمع ہوتے تھے یا کئی۔ اور ابن دید نے کہا اس لیے اس کا نام رکھا گیا ہے کہ وہ پانی کی طلب میں جدا جدا ہونے کے بعد اس میں جمع ہوتے تھے۔ اور محکم میں ہے ان کے غاروں میں جمع ہونے کی وجہ سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری ۱۱/۱۱۲)

غنیۃ الطالبین میں ہے کہ!

''شعبان میں پانچ حروف ہیں: ش: شرف کا ہے۔ ع: علو کا۔ ب: بر کا ہے۔ الف، الفت کا ہے۔ اور ن: نور کا ہے۔ اس مہینے میں یہ پانچوں حروف بارگاہ الٰہی سے بندے کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس ماہ میں نیکیوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ خطاؤں کو معاف کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر درود کی کثرت کی جاتی ہے۔ (غنیۃ الطالبین مترجم ۳۴۱)

تحویل قبلہ کا مہینہ:

امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ اسی ماہ مقدس میں کعبہ کو اُمت محمدیہ کے لیے قبلہ مقرر کیا گیا۔'' قال ابو حاتم رضی اللہ عنہ: صلی المسلمون الی بیت المقدس بعد قدوم المصطفی ﷺ المدینة سبعة عشر شهر او ثلاثة ايام سواء وذلك أن

قدو ﷺ المدینة کان یوم الاثنتین لا ثنتی عشرۃ لیلة خلت من ربیع الاول وأمرہ اللہ جل و علا باستقبال الکعبة یوم الثلاثاء لنصف من شعبان۔ (صحیح ابن حبان ۲/۶۲۰ تحت حدیث ۱۷۱۶، تفسیر قرطبی ۲۵/۱۵۰ تحت آیت قد نری تقلب وجھك۔۔۔الخ)

ترجمہ: ابو حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مسلمانوں نے بیت المقدس کی طرف سترہ مہینے اور تین دن تک حضور ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد نمازیں پڑھیں۔ اور پیر کے دن بارہ راتیں گزرنے کے بعد ربیع الاول شریف کے مہینہ میں (نبی ﷺ) نے مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے استقبال کعبہ کا حکم پندرہ شعبان بروز منگل کو دیا۔

درود کی کثرت کا مہینہ:

حضور ﷺ پر درود پڑھنے کا حکم اسی ماہ مقدس میں نازل ہوا۔ امام سخاوی فرماتے ہیں

!''أن الأمر بالصلاۃ علی النبی ﷺ کان فی السنة الثانیه من الهجرة وقیل فی لیلة الاسرا''۔ (القول البدیع ص ۱۹۹ الباب الاول)

ترجمہ: نبی ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم ۲ ہجری میں نازل ہوا اور کہا گیا ہے کہ یہ لیلۃ الاسراء میں نازل ہوا۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا! ''جس نے ہر شعبان کے دن میں نبی اکرم ﷺ پر سات سو مرتبہ درود شریف پڑھا تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ وہ درود شریف آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتے اور پہنچاتے ہیں۔ جس سے نبی اکرم ﷺ کی روح مبارکہ خوشی و مسرت کا اظہار فرماتی ہے۔ پھر (اللہ تعالیٰ) ان فرشتوں کو حکم فرماتا ہے کہ وہ قیامت تک اس شخص کے لیے استغفار کرتے رہیں۔ (القول البدیع ص ۲۱۴)

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں! ''اھل السنة کی علامت ہے نبی ﷺ پر کثرت سے درود پڑھنا۔ (القول البدیع ص ۱۳۲)

پندرہ شعبان کی رات:

شعبان المعظم میں ایک رات ایسی ہے جس کو عام طور پر شب برأت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ رات شعبان المعظم کی پندرھویں رات ہے۔ اور عام بلاد اسلامیہ میں مسلمان اس رات میں عام راتوں کی نسبت زیادہ عبادت خداوندی میں مشغول ہوتے ہیں۔ اور اس رات کو عظمت و فضیلت والی رات جانتے ہیں۔ مگر آج کل کچھ لوگ اس کی فضیلت کے قائل کو بدعتی کہتے ہیں۔ جو سراسر ظلم اور جہالت ہے۔ آیئے دیکھیں اس رات کی عظمت کیا ہے۔ کسی چیز کے ناموں کی کثرت بھی اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ جو نام علماء سے ثابت ہیں وہ ذکر کیے جاتے ہیں۔

۱۔لیلۃ البراۃ ۲۔اللیلۃ المبارکۃ ۳۔لیلۃ الصك

۴۔لیلۃ الرحمۃ۔(تفسیر الکشاف ۲۶۲/۴)(اللباب فی علوم الکتاب ۳۰۹/۱۷)

۵۔لیلۃ التکفیر ۶۔لیلۃ القسمۃ ۷۔لیلۃ الاجابۃ ۸۔لیلۃ عید الملائکۃ

۹۔لیلۃ الشفاعۃ ۱۰۔لیلۃ التقدیر ۱۱۔لیلۃ التعظیم ۱۲۔لیلۃ الغفران

۱۳۔لیلۃ الحیاۃ ۱۴۔لیلۃ الجائزہ ۱۵۔لیلۃ الرجحان۔(همیان الزاد للاباضی تحت الدخان آیت نمبر ۳، کتاب تحفۃ الاخوان فی قراۃ المیعاد، ص ۸۶، ۸۷، الکلمات الحسان ص ۱۶)

اہل ایمان والوں کے لیے پندرھویں شعبان کی رات تحفہ ہے:

یہ وہ رات ہے جس کے بارے میں نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: عن معاذ بن جبل عن النبی ﷺ قال یطلع اللہ الی خلقه لیلة النصف من شعبان فیغفر لجمیع خلقه، الا لمشرك أو مشاحن۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے پس مشرک اور کینہ پرور کے سوا ہر ایک کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ (صحیح ابن حبان جلد ۱۲ ص ۴۸۱ رقم الحدیث ۵۶۶۵، طبرانی معجم

الکبیر جلد ۲۰ ص ۱۰۸، مسند الشامیین جلد ۱ ص ۱۲۸، شعب الایمان بیہقی جلد ۵ ص ۳۶۰، حلیۃ الاولیاء جلد ۵ ص ۱۹۱، ابن ابی عاصم فی السنۃ جلد ۱ ص ۲۲۴)

امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔(مجمع الزوائد ۸/ ۶۵)

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت ابوھریرہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عوف، حضرت ابوثعلبہ، حضرت ابواُمامہ باہلی، حضرت کثیر بن مرہ رضی اللہ عنھم سے اسی قسم کے مضمون کی روایات ہیں۔

امام طاؤس یمانی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے پندرہ شعبان کی رات اور اس میں عمل کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا! ''میں اس (رات) کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ایک حصہ میں نانا جان ﷺ پر درود شریف پڑھتا ہوں۔اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہ اس نے حکم فرمایا!! اے ایمان والو نبی ﷺ پر درود اور سلام پڑھو جیسا اس کا پڑھنے کا حق ہے۔اور دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے کہ اس نے حکم فرمایا!! یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے حالانکہ وہ استغفار کرتے ہوں''۔(سورۃ الانفال ۳۳)

تیسرے حصے میں نماز پڑھتا ہوں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل کرتے ہوئے ''سجدہ کر اور قرب حاصل کر''۔

میں نے عرض کیا جو شخص یہ عمل کرے اس کے لیے کیا ثواب ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ! میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا۔اور انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! کہ جس نے پندرہ شعبان کی رات کو زندہ کیا اس کو ''مقربین'' یعنی ان لوگوں میں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا! ''فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝'' (سورۃ الواقعۃ ۸۸) میں لکھ دیا جاتا ہے۔(القول البدیع :امام سخاوی، ص ۲۱۴، ۲۱۵)

سال بھر مرنے والوں کے فیصلے کی رات:

حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں!

''انه ليس نفس تموت في سنة الا كتب أجلها في شعبان و أجب أن يكتب أجلي وأنا في عبادة ربي و عمل صالح ''۔(تاریخ بغداد ۲۳۵،۲۳۴/۴)

ترجمہ: کوئی جان ایسی نہیں جس نے اس سال مرنا ہو مگر اس کی موت شعبان میں لکھ دی جاتی ہے۔پس میں محبوب رکھتا ہوں کہ جب میری اجل لکھی جائے تو میں اپنے رب کی عبادت اور عمل صالح میں ہوں۔

دوسری روایت میں ہے!

''رسول اللہ ﷺ شعبان المعظم سے بڑھ کر کسی ماہ کے روزے نہیں رکھتے تھے۔کیونکہ اس میں زندوں کی روحوں کو مردوں میں لکھا جاتا ہے۔حتیٰ کہ ایک آدمی شادی کرتا ہے جبکہ اس کا نام مرنے والوں میں اوپر لکھا ہوتا ہے''۔(تاریخ ابن عساکر ۲۵۰/۶۱)

یہ دونوں روایات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔جبکہ اسی مضمون کی روایات حضرت ابو هریرہ،حضرت راشد بن سعید رضی اللہ عنہما سے بھی ہیں۔

عبادت کی رات:

اس رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے بندے اس سے بخشش کی امید رکھتے ہیں۔حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے!''عن واثلة بن الاسقع قال سمعت رسول الله ﷺ يقول قال الله تبارك و تعالىٰ أنا عند ظن عبدي بي فليظن بي ما شاء''۔

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے۔پس وہ جو چاہے میرے بارے میں گمان رکھے۔(صحیح ابن حبان ۴۰۱/۲،مستدرک

حاکم ۱۶۶/۵ ، سنن دارمی ۳۹۵/۲ ، مسند احمد ۴۹۲/۳ رقم ۱۶۱۱۲ ، معجم الکبیر ۸۸/۲۲)

بخشش کی راتیں:

عن معاذ بن جبل رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من احیا اللیالی الخمس وجبت له الجنة۔ لیلة الترویة، ولیلة عرفة، ولیلة الفطر، ولیلة النحر، ولیلة النصف من شعبان۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے پانچ راتوں کو زندہ کیا (بیدار ہو کر عبادت کی) اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ تو یہ راتیں آٹھ ذی الحجہ کی رات، عرفہ کی رات، عید الفطر کی و قربانی کی رات اور پندرہ شعبان کی رات۔ (الترغیب والترهیب للاصبهانی ۲۴۸/۲ ، الترغیب والترهیب للمنذری ۱۵۲/۲)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا! "پانچ راتیں ایسی ہیں جس میں دعا رد نہیں کی جاتی۔ جمعہ کی رات رجب کی پہلی رات شعبان کی پندرھویں رات اور عیدین کی راتیں۔ (مصنف عبد الرزاق ۳۱۷/۴ برقم ۷۹۲۷ ، شعب الایمان بیهقی ۳۴۲/۳ برقم ۳۷۱۳)

امام شافعی لکھتے ہیں!

"بے شک پانچ راتوں میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ جمعہ کی رات، عید الفطر اور عید قربان، رجب کی پہلی رات اور شعبان کی پندرھویں رات"۔ (کتاب الام للشافعی ۲۳۱/۱ ، سنن الکبریٰ بیهقی ۳۱۹/۳)

ابن تیمیہ حنبلی نے لکھا ہے!

"جب کوئی آدمی نصف (شعبان) کی رات تنہا یا خاص جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے جیسا کہ اسلاف میں ایک گروہ کرتا تھا پس وہ اچھا ہے۔ (مجموع الفتاوی ۱۳۲/۲۳)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں!

"لیکن یہ نظریہ کہ یہ رات فضیلت والی ہے۔ یہ اکثر اہل علم کا نظریہ ہے یا اکثر ہمارے علماء اور دیگر کا بھی اور اس پر امام احمد کی نص ہے کیونکہ اس رات کی فضیلت میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ اور آثار سلف بھی اسکی تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس رات کے کچھ فضائل مسانید اور سنن میں بھی مروی ہیں۔ (اقتضاء الصراط المستقیم ۳۰۲)

غیر مقلدین (اہل حدیث) کے شیخ الکل فی الکل کا فتویٰ:

سوال: پندرھویں شعبان کو کیا شب قدر کا کوئی ثبوت ہے۔ اس شب کو ثواب جان کر تلاوت یا عبادت کرنا کیسا ہے؟

جواب: اس رات کے متعلق روایتیں ضعیف ہیں۔ اس دن کوئی کار خیر کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ بحکم انما الاعمال بالنیات موجب ثواب ہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ۱/۶۵۲ مطبوعہ سرگودھا)

ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ اس رات میں اگر کوئی مسلمان اپنے خالق و مالک کے سامنے سربسجود ہوتا ہے تو اس پر تنقید نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس رات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنی خطاؤں اور لغزشوں کی معافی طلب کرنی چاہیے۔ اور آئندہ کے لیے گناہوں سے تائب ہو کر اس کے تقرب کو حاصل کرنا چاہیے۔ آخر میں گذارش ہے کہ اپنے بچوں کو آتش بازی، پٹاخے وغیرہ سے منع کریں کیونکہ یہ رات آگ سے بچنے کی رات ہے نہ کہ آگ سے کھیلنے کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

قبول اسلام

مورخہ ۱۵ جولائی ۲۰۱۱ء بروز جمعۃ المبارک جامع مسجد امام اعظم ابوحنیفہ الامزار کالونی واہ کینٹ میں اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو کر دو عیسائی نوجوانوں عمران مسیح اور ساجد مسیح نے خطیب اہل سنت حضرت علامہ مولانا حافظ محمد احسان حسین کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ دونوں کے اسلامی نام محمد عمران اور محمد ساجد رکھے گئے۔ اس موقع پر امام الناس کا ایک کثیر اجتماع تھا۔ جب حضرت علامہ مولانا محمد احسان حسین مدظلہ العالی نے انہیں کلمہ پڑھایا تو جامع مسجد کی فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر، نعرہ رسالت یا رسول اللہ اور نعرہ حیدری کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ اللہ کریم دونوں نو مسلموں کو دین اسلام پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

تحریر و تحقیق: افضل شاہد اعوان

اختتام سحر اور اذان فجر

علماء و خطباء کے لیے ایک توجہ طلب مسئلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

اسلام میں جن عبادات کے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے ان عبادات کو اس وقت پر ہی ادا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ وہ عبادت اکارت چلی جائے گی اور نیکی برباد گناہ لازم کی مصداق بن جائے گی۔ ان عبادات میں روزہ اور نماز سے پہلے اذان بھی شامل ہے۔

روزہ کا وقت صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ اگر اس وقت کی پابندی نہ کی جائے تو کسی صورت روزہ درست نہیں ہوگا اور سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یعنی اگر کوئی مسلمان صبح صادق کے بعد یا غروب آفتاب سے پہلے قصداً کچھ کھا پی لے تو اس کا روزہ باطل ہو جائے گا۔ اسی طرح ہر نماز کے لیے بھی وقت متعین ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کہ بے شک نماز وقت مقررہ پر مومنوں پر فرض کی گئی ہے۔ ہر نماز سے پہلے اذان جو اس نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد دی جاتی ہے سنت موکدہ ہے۔ جسے چھوڑنا یقیناً گناہ ہے۔ اذان کے لیے بھی وقت کی پابندی انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ وہ اذان ادا ہی نہ ہوگی اور اگر نماز بھی وقت مقررہ میں ادا نہ کی گئی تو وہ بھی برباد ہو جائے گی۔

اب میں قارئین اور خصوصاً علمائے کرام کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ روزہ بند کرنے کا وقت صبح صادق سے پہلے ہے اور صبح کی اذان کا وقت صبح صادق کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان دونوں کو کسی صورت باہم ملایا نہیں جا سکتا۔ ہمارے ہاں روزہ بند کرنے کے لیے سائرن بجایا جاتا ہے اور نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے۔ ان دونوں کا وقت

اگر ایک کر دیا جائے یعنی سائرن کے ساتھ ہی اذان پڑھ دی جائے تو لازمی طور پر سائرن غلط وقت پر ہوگا یا صبح کی اذان غلط وقت پر ہوگی۔ سائرن اگر غلط وقت پر یعنی صبح صادق کے بعد ہوا تو جو لوگ اس سائرن پر روزہ بند کریں گے ان کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور اگر سائرن ٹھیک وقت پر ہے تو صبح کی جو اذان سائرن کے ساتھ ہوگی وہ غلط ہوگی یعنی وہ ادا ہی نہیں ہوگی۔ اور یوں سنت موکدہ ترک ہو جائے گی۔ وہ بھی رمضان المبارک کے مقدس ماہ میں کہ جس میں ہمیں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

ہمارے ہاں یہ معمول بن چکا ہے کہ رمضان المبارک میں روزہ بند کرنے کے لیے جونہی سائرن بجتا ہے فوراً ہی موذین اذانیں شروع کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ سپیکر کا بٹن آن کر کے مائیک کے سامنے تیار کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی اس لیے اذان نہیں ہوگی اور اسکا گناہ انکی گردن پر ہوگا۔ چنانچہ سنت موکدہ ترک ہو جاتی ہے اور جو نماز ادا کی جاتی ہے وہ درحقیقت بغیر اذان کے ہوتی ہے۔ حالانکہ اس طرح نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ امام اہل سنت الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں!

''بغیر اذان کے جماعت کرنا مکروہ ہے اور نماز مکروہ ہوگی''۔ (احکام شریعت ص ۱۸۶ مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

علامہ عبدالمصطفےٰ اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!

''مسجد میں بلا اذان و اقامت کے جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے''۔ (جنتی زیور ص ۲۰۶ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور)

مزید فرماتے ہیں کہ!

''وقت ہونے کے بعد اذان پڑھی جائے۔ اگر وقت سے پہلے اذان ہوگئی تو وقت ہونے پر دوبارہ اذان پڑھی جائے''۔ (جنتی زیور ص ۲۰۷ مطبوعہ مشتاق بک کارنر لاہور)

مولوی اکرام الحق صاحب دیو بندی ''تنبیہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں!

''اگر اذان وقت سے ایک منٹ بھی پہلے ہوئی تو وہ نہ ہونے کے برابر ہوگی''۔ (نماز کی کتاب ص ۱۰۵ مکتبہ اسلامیہ راولپنڈی)

مفتی محمد خلیل خان برکاتی قدس سرہ رقمطراز ہیں!

''وقت ہونے کے بعد اذان کہی جائے۔ قبل از وقت کہی گئی یا وقت ہونے سے پہلے شروع ہوئی اور اثنائے اذان میں وقت آ گیا تو (اذان) دوبارہ کہی جائے۔۔۔۔ بعض جلد باز نماز فجر کے لیے عموماً وقت سے پہلے ہی اذان شروع کر دیتے ہیں۔ خصوصاً ماہ رمضان المبارک میں''۔ (سنی بہشتی زیور ص ۱۸۸، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور)

شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں!

''امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک کسی اذان کو بھی اس کے وقت سے پہلے دینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اذان کا مقصد مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ نماز کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ اگر نماز کے وقت سے پہلے اذان دے دی جائے تو اول تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ ثانیاً ہو سکتا ہے کہ وقت سے پہلے اذان کی صورت میں کوئی شخص اذان سن کر نماز پڑھ لے۔ اور وقت سے پہلے بالاتفاق نماز نہیں ہوتی۔ پس اس صورت میں قبل از وقت نماز پڑھنے کی وجہ سے جس کی نماز نہیں ہوگی اس کا ذمہ دار وقت سے پہلے اذان دینے والا ہوگا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے

''المؤذن مؤتمن'' مؤذن امین ہوتا ہے۔

اس بحث کے آخر میں آپ ایک حدیث نقل فرماتے ہیں!

''امام ابوداؤد حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس وقت تک اذان نہ دو جب تک کہ فجر ظاہر نہ ہو جائے''۔ (شرح صحیح مسلم: کتاب الصلوۃ جلد اول ص ۱۰۷۳، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور)

علامہ سید محمود احمد رضوی قدس سرہ رقمطراز ہیں!

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے قبل الفجر اذان دے دی تو حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ بلند مقام پر چڑھ کر یہ اعلان کریں کہ عبد (بلال) سو گیا تھا اور غافل ہو گیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان کر دیا اور کہنے لگے کاش بلال کو اس کی ماں نہ جنتی۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے صبح صادق ہونے پر دوبارہ اذان دی۔

نیز طحاوی، مستدرک، بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں!

''ابن عمر سے روایت ہے کہ حضرت بلال نے فجر سے پہلے اذان دے دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا بلال تمہیں اس فعل پر کس نے ابھارا۔ عرض کی حضور سو کر اٹھا مگر نیند میں تھا گمان کیا کہ صبح صادق ہو گئی۔ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ مدینہ میں تین بار اعلان کرو کہ بندہ سویا ہوا تھا (یعنی نیند کی حالت میں تھا) پھر حضور ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے پہلو میں بٹھائے رکھا یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی۔

ان احادیث سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اذان قبل الفجر مشروع نہیں ہے۔ اور اگر غلطی سے دیدی گئی تو وقت ہونے پر دوبارہ دی جانی چاہیے''۔ (فیض الباری شرح بخاری، باب الاذان قبل الفجر۔ جلد دوم ص ۲۲۵)

ہمارے ہاں سائرن کے ساتھ اذان دینے کی غلطی اتنی عام ہو چکی ہے کہ سوائے چند ایک کے تمام مساجد میں اس کا ارتکاب ہوتا ہے۔ نہ صرف چھوٹی مساجد بلکہ بڑی بڑی جامع مساجد اور دینی مدارس جہاں جید علماء و خطباء موجود ہیں، وہاں بھی یہ غلطی دیکھنے سننے میں آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اس صف میں شامل نظر آتے ہیں۔ نہ صرف سنی بریلوی مسلک کی مساجد بلکہ دیوبندی مسلک کی مساجد میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔

اگر تفاسیر، احادیث اور کتب احناف کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ روزہ بند کرنے کا وقت صبح صادق سے پہلے ہے اور اذان فجر کا وقت صبح صادق کے

بعد ہے۔ چنانچہ دیوبندی مکتبہ فکر کے عالم مفتی محمد شفیع ''روزے کے معاملے میں احتیاط کا حکم'' کے عنوان کے تحت ''تلك حدود الله فلا تقربوها '' کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اسی طرح سحری کھانے میں احتیاطً وقت ختم ہونے سے دو چار منٹ پہلے ختم کرنا اور افطار میں دو تین منٹ موخر کرنا بہتر ہے۔ اس میں بے پرواہی اور سہل نگاری اس ارشاد خداوندی کے خلاف ہے''۔ (معارف القرآن جلد اول ص ۴۵۶)

سورۃ البقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے!

''وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ''۔

ترجمہ: اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے ظاہر ہو جائے سفیدی کا ڈورا سیاہی کے ڈورے سے پو پھٹ کر۔ (کنز الایمان)

اس آیت مبارکہ میں رات کو سیاہ ڈورے اور صبح صادق کو سفید ڈورے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

امیر دعوت اسلامی مولانا محمد الیاس قادری اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں!

''اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روزہ کا اذان فجر سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی فجر کی اذان کے دوران کھانے پینے کا کوئی جواز ہی نہیں۔ اذان ہو یا نہ ہو۔ آپ تک آواز پہنچے یا نہ پہنچے۔ صبح صادق ہوتے ہی آپ کو کھانا پینا بالکل ہی بند کرنا ہوگا''۔ (فیضان رمضان: ص ۱۲۶، مطبوعہ مکتبۃ المدینہ کراچی)

مولانا محمد حنیف اختر لکھتے ہیں!

''اکثر لوگ فجر کی اذان ہونے تک سحری کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے روزے کو ضائع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ روزہ بند کرنے کا تعلق اذان فجر سے نہیں بلکہ صادق سے ہے۔ اور صبح صادق سے پہلے کھانا پینا بند کرنا ضروری ہے''۔ (مسائل رمضان المبارک ص ۹ مطبوعہ مرکزی انجمن غلامان مصطفےٰ خانیوال)

امام بخاری علیہ الرحمہ نے ''صحیح البخاری'' میں کتاب الصوم کے اندر باقاعدہ ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے ''باب قدر کم بین السحور وصلاۃ الفجر ''یعنی سحری ختم ہونے اور نماز فجر میں کتنا فاصلہ ہونا چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی علیہ السلام کے ساتھ سحری کھائی۔ پھر آپ صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے پوچھا سحری اور صبح کی اذان میں کتنا فاصلہ ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ پچاس آیتیں پڑھنے کی مقدار''۔ (صحیح البخاری کتاب الصوم ص ۸۲۹، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

اس حدیث کو مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور سنن دارمی نے بھی کتاب الصوم میں ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں علامہ سید محمود احمد رضوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!

''اس حدیث سے ثابت ہوا کہ فجر کا وقت جب شروع ہوتا ہے جب کہ روزہ دار کی سحری کھانے کا وقت ختم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فجر کا اول وقت طلوع صبح صادق ہے اور حضور علیہ السلام سحری سے فارغ ہو کر نماز کے لیے اتنی دیر بعد متوجہ ہوتے جتنی دیر میں پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھی جا سکیں''۔ (فیوض الباری، باب وقت الفجر، جلد دوم ص ۳۶۰، مطبوعہ لاہور)

اب اگر قرآت کے قواعد کے مطابق مخارج کی صحت کا لحاظ کرتے ہوئے پچاس یا ساٹھ آیات کی تلاوت کی جائے تو ظاہر ہے کہ تقریباً دس منٹ تو خرچ ہوں گے۔ لہٰذا ہمیں بھی اختتام سحر اور فجر کی اذان کے درمیان وقفہ رکھنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بہار شریعت'' میں لکھتے ہیں!

سحری چھوڑنے کا جو وقت بیان کیا گیا اس کے آٹھ دس منٹ بعد اذان کہی جائے تا کہ سحری اور اذان دونوں طرف احتیاط رہے۔ (بہار شریعت: حصہ سوم ص ۱۳۶، موتال ہلی کیشنز راولپنڈی)

دیوبندی مکتبہ فکر کے عالم مولانا محمد منظور نعمانی بخاری شریف کی مندرجہ بالا حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں!

''صحت مخارج اور قواعد قرأت کے لحاظ کے ساتھ پچاس آیات کی تلاوت میں پانچ منٹ سے کم وقت صرف ہوتا ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سحری اور اذان کے درمیان صرف چار پانچ منٹ کا فصل تھا''۔ (معارف الحدیث کتاب الصوم جلد چہارم مطبوعہ کراچی)

اگر چہ نعمانی صاحب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ نبی علیہ السلام کے دور میں سحری اور اذان کے درمیان وقفہ ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے یہ جو لکھا ہے کہ چار پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ اس لیے کہ صحت مخارج اور قواعد قرأت کے مطابق اگر پچاس آیات کی تلاوت کی جائے تو تقریباً دس منٹ کا وقت درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اہل حدیث مکتبہ فکر کے عالم حافظ صلاح الدین یوسف بخاری شریف کی اسی حدیث کے فوائد میں لکھتے ہیں!

''اس سے معلوم ہوا کہ سحری بالکل آخری وقت میں کھائی جائے۔ یہی سنت طریقہ ہے۔ تاہم صبح صادق سے پہلے پہلے کھالی جائے اور یہ وقفہ بقدر پچاس آیات اندازاً دس منٹ ہو''۔ (ریاض الصالحین: کتاب الفضائل فوائد نمبر ۱۲۳۳، ص ۲۲۴، مطبوعہ دار السلام لاہور)

امیر دعوت اسلامی مولانا محمد الیاس عطار قادری دامت برکاتہم فرماتے ہیں!

''سحری میں اتنی تاخیر بھی نہ کریں کہ صبح صادق کا شک ہونے لگے۔ جیسا کہ بعض لوگ صبح صادق کے بعد فجر کی اذانیں ہو رہی ہوتی ہیں اور وہ کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ اگر کھاتے نہیں تو پانی پی کر روزہ بند ضرور کرتے ہیں۔ آہ بے چارے اس طرح روزہ بند تو کیا کریں گے روزے کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح روزہ ہوتا ہی نہیں اور سارا دن بھوک پیاس کے سوا کچھ ہاتھ آتا ہی نہیں۔ اور روزہ بند کرنے کا تعلق اذان فجر سے نہیں بلکہ صبح صادق سے پہلے پہلے کھانا پینا بند کرنا ضروری ہے''۔ (فیضان سنت ص ۱۰۷۷)

حضرت علامہ مولانا شہزاد قادری ترابی لکھتے ہیں!

''ہمارے یہاں بیماری یہ نکل آئی کہ ریڈیو، ٹی وی ہونے کے باوجود ہم جب تک اذان نہ سن لیں یا جب تک اذان ختم نہ ہو جائے اس وقت تک کھانے کی کاروائی جاری رکھتے

ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ سحری کا جو وقت ختم ہونے کا ہے اس سے پانچ منٹ پہلے روزہ بند کر لیں تا کہ اگر گھڑی آگے پیچھے ہو تو روزہ ضائع نہ ہو جائے۔ اذان کا انتظار نہ کریں کیونکہ اذان روزہ بند کرنے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ نماز کے لیے ہوتی ہے۔ اور اذان کا وقت سحری کا وقت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ غروب آفتاب کا وقت معین ہے اس میں بھی دو چار منٹ تاخیر میں کوئی حرج نہیں۔ (شریعت محمدی کے ہزار مسائل ص ۱۵۳ مطبوعہ ادبی پبلشرز دربار مارکیٹ لاہور)

قاری عتیق احمد خان قاسمی دیوبندی لکھتے ہیں!

''سحری بھی تا حد مقدور آخری وقت میں افضل ہے۔ لیکن اتنی تاخیر جائز نہیں کہ طلوع سحر کا شبہ ہونے لگے۔ دائمی مستند جنتریوں کے مطابق اپنی گھڑی کو درست رکھیں اور روزہ احتیاط سحری سے تین منٹ پہلے ختم کریں''۔ (رمضان المبارک ص ۳۷ مطبوعہ دہلی انڈیا)

معروف دیوبندی عالم دین مولانا محمد یوسف لدھیانوی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں!

''اگر صبح صادق ہو جانے کے بعد کھایا، پیا تو روزہ نہ ہوگا۔ خواہ اذان ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اور اذانیں عموماً صبح صادق کے بعد ہوتی ہیں۔ اس لیے اذان کے وقت کھانے پینے والوں کا روزہ نہیں ہوگا۔ عموماً مسجدوں میں اوقات کے نقشے لگے ہوتے ہیں۔ ابتدائے فجر کا وقت دیکھ کر اس سے چار پانچ منٹ پہلے سحری کھانا بند کر دیا جائے''۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد سوم ص ۲۳۲)

مولوی اکرام الحق صاحب نے ''روزہ کا بیان'' کے عنوان سے ایک باب میں تنبیہ کرتے ہوئے لکھا ہے!

''بندش سحری کے لیے اگر سائرن سے خبردار کیا جاتا ہو اور اس کے ساتھ ہی اذانیں شروع کر دی جائیں تو غلط ہوگا۔ اس طرح یا تو روزہ ضائع ہوتا ہے یا اذان باطل ہو جاتی ہے۔ چونکہ سائرن صبح صادق سے پہلے اور اذان کا صبح صادق کے بعد ہونا ضروری ہے اور دونوں کا ایک وقت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ سائرن تو اپنے وقت پر ہی ہو لیکن اذان سے

سحری بند کرنے کا کام نہ لیا جائے اور وہ (مناسب وقفہ سے) صبح صادق کے چند منٹ بعد کی جائے"۔ (نماز کی کتاب (مکمل) ص ۱۰۱، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ راولپنڈی)

یہی مولانا صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں!

"رمضان شریف میں اذان فجر صبح صادق سے پہلے نہ ہونے پائے اور جمعہ کی اذان زوال کے بعد ہونا ضروری ہے۔ ایسے اوقات میں کم از کم تین چار منٹ کی احتیاط ضرور کریں۔ (ایضاً ص ۱۰۲)

روزے سے متعلق ایک خطرناک غلطی:

مذکورہ بالا عنوان کے تحت دیوبندی مکتبہ فکر کے ادارہ غفران ٹرسٹ گلی نمبر ۱۷ چاہ سلطان راولپنڈی کے دارالافتاء کی طرف سے ایک چھوٹا سا اشتہار شائع کیا گیا جس کی تحریر مندرجہ ذیل ہے۔

"آج کے دور میں دین سے دوری اور جہالت کی وجہ سے اکثر روزہ رکھنے والے حضرات فجر کی اذان شروع ہونے تک سحری کھانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور بعض لوگ تو اذان ختم ہونے تک جبکہ بعض لوگ آخری اذان اور بعض لوگ محلہ کی اذان ہونے تک سحری کھانے میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ حالانکہ سحری ختم کرنے کا تعلق اذان سے نہیں بلکہ صبح صادق ہوجانے سے ہے اور اذان تو نماز فجر کے لیے دی جاتی ہے۔ جس کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے۔ اذان درحقیقت نماز کی سنت ہے نہ کہ روزے کی۔ خوب سمجھ لیجئے کہ! اگر اذان صبح صادق ہوجانے کے بعد ہوئی اور اس پر کچھ بھی کھایا پیا گیا تو روزہ نہیں ہوگا اور اگر اذان ہی صبح صادق ہونے سے پہلے ہوگئی تو پھر یہ اذان فجر کی جماعت کے لیے صحیح نہ ہوگی، اس لیے اذان کو سحری ختم ہونے کا معیار بنانا یا اذان صبح صادق سے پہلے پڑھنا سخت نقصان کی چیز ہے۔ سحری ختم کرنے کے لیے (اور اسی طرح افطار کے لیے) مستند کیلنڈر اور جنتریوں میں درج شدہ وقت کو اپنی صحیح گھڑی کے ساتھ معیار بنایئے اور یا مسجدوں میں یہ اہتمام کیا جائے کہ سحری ختم ہونے سے

کچھ وقت پہلے سحری کے ختم ہونے کی اطلاع دی جائے۔ مثلاً زبانی اعلان ہو یا کسی جگہ سائرن بجایا جائے پھر صبح صادق ہو جانے کے بعد اذان پڑھی جائے۔ اس مسئلہ کو خود سمجھئے اور اپنے گھر والوں کو بھی سمجھایئے"۔

"وفی الھندیہ تقدیم الاذان علی الوقت غیر الصبح لایجوز اتفاقاً وکذا فی الصبح عند ابی حنیفة ومحمد وان قدم یعاد فی الوقت ھکذا فی شرح مجمع البحرین لابن الملك وعلیه الفتویٰ ھکذا فی التتار خانیه الخ" (عالمگیری ج ۱ ص ۵۳ وکذا فی البحر الرائق ج ۱ ص ۲۶۲، ۲۶۳ وکذا فی اعلاء السنن ج ۲ ص ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵)

تفصیل اور دلائل کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

امداد الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۰۵، امداد الاحکام ج ۲ ص ۱۰۹،

احسن الفتاویٰ ج ۲ ص ۲۹۰، ۲۹۱، ج ۳ ص ۴۴۱، ۴۵۳

خیر الفتاویٰ ج ۲ ص ۷۰ آپ کے مسائل اور ان کا حل ج ۳ ص ۲۶۸"۔

اوقات نماز اور سحر و افطار کے نقشوں کے سلسلہ میں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ علم توقیت کی بنا پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ تو ایک شہر یا علاقے کے لیے ترتیب دیے گئے ایک سے زیادہ نقشوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ان کے اوقات میں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے جو کہ ایک منٹ سے لے کر پانچ منٹ تک ہو سکتا ہے بلکہ موجود ہے۔ چنانچہ دہلی کے مشہور عالم دین مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ نے اپنے نقشہ اوقات نماز میں اس کا اعتراف خود فرمایا ہے اور لکھا ہے!

"اس نقشہ کے اوقات میں بھی احتیاط سے کام لیں۔ کہ اول تو سیکنڈ چھوڑ دیے گئے ہیں اس لیے سیکنڈوں کا فرق تو ضروری ہے۔ پھر بعض دشواریوں کی وجہ سے قواعد فن پر بھی کماحقہ عمل نہیں کیا گیا اس لیے بعض مقامات پر منٹ دو منٹ کا فرق بھی رہ گیا ہو تو تعجب نہیں"۔

ہمارے ہاں مفتی اعظم ہند مولانا شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کا نقشہ اوقات نماز عموماً استعمال ہوتا ہے۔ جو کہ مستند بھی ہے اور بریلوی دیوبندی مکاتب فکر کے ہاں یکساں طور پر مقبول بھی۔ اس نقشہ میں انتباہ کے خصوصی عنوان کے تحت لکھا ہے!

""نماز کے حق میں کم از کم پانچ منٹ اور روزہ کے حق میں بھی پانچ منٹ کی احتیاط لازمی ہے۔ یعنی مثلاً اس نقشہ میں کسی روز صبح صادق کا وقت جو لکھا ہوا ہے اس سے پانچ منٹ پیشتر سحری تناول کرنا موقوف کر دیں اور اس وقت سے کم از کم پانچ منٹ بعد اذان صبح دیں''۔

لہذا مفتی صاحب علیہ الرحمہ کی اس ہدایت پر اگر عمل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اختتام سحر اور فجر کی اذان میں دس منٹ کا وقفہ ہونا چاہیے۔

سحر و افطار کے لیے جو نقشہ جات رمضان میں ترتیب دیئے جاتے ہیں وہ دائمی نقشہ اوقات نماز کی مدد سے ہی بنائے جاتے ہیں۔ لہذا محتاط علمائے کرام احتیاطاً سحری و افطاری کے اوقات میں دونوں طرف دو چار منٹ کی گنجائش رکھتے ہیں۔ یعنی سحری کا وقت اصل وقت سے دو تین منٹ قبل اور افطاری کا وقت دو تین منٹ بعد دیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے شہر واہ کینٹ میں سحر و افطار کا ٹائم ٹیبل مرکزی جامع مسجد کے خطیب حضرت علامہ قاضی عبد الوحید سعیدی صاحب ترتیب دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق پورے واہ کینٹ میں سائرن بجائے جاتے ہیں۔ اگر قاضی صاحب کے اس ٹائم ٹیبل کا مفتی مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کے نقشہ اوقات نماز سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ قاضی صاحب احتیاطاً سحری کا وقت اصل وقت سے دو منٹ قبل اور افطاری کا وقت تقریباً چار منٹ بعد رکھتے ہیں۔ تو گویا قاضی صاحب کے اس ٹائم ٹیبل کے مطابق رمضان میں جب اختتام سحر کا سائرن بجتا ہے تو اس وقت ابھی صبح صادق ہونے میں یقیناً دو منٹ باقی ہوتے ہیں۔ اب جو لوگ سائرن کے ساتھ ہی صبح کی اذان شروع کر دیتے ہیں وہ کسی طور بھی درست نہیں ہو سکتی۔ تو پھر مجھے بتایا جائے کہ اس کا گناہ کس کی گردن پر ہوگا کہ رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں گویا صبح کی

نماز تقریباً تمام مساجد میں اذان فجر کے بغیر ادا کی جاتی ہے۔ کیونکہ وقت سے پہلے دی گئی اذان اذان نہیں ہوتی۔ مفتی مظہر اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کے نقشہ پر تنبیہ کے عنوان سے واضح طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر وقت سے پیشتر اذان دیدی گئی تو وقت کے اندر اذان لوٹانا ضروری ہوگا۔

دعوت اسلامی کی طرف سے جو مستقل نقشہ اوقات نماز اور سحر و افطار جاری کیا گیا ہے وہ سب کے لیے قابل تقلید اور انتہائی مفید ہے۔ اس میں باقاعدہ ختم سحری اور آذان فجر کے لیے الگ الگ کالم بنائے گئے ہیں اور ہر روز ان میں چار منٹ کا فرق رکھا گیا ہے۔ بد قسمتی سے عام طور پر لوگوں کا یہی معمول دیکھا گیا ہے کہ وہ اذان پر ہی سحری و افطاری کا دارومدار رکھتے ہیں ۔ بلکہ بعض تو اذان فجر کے دوران ہی روزہ بند کرتے ہیں۔ اس عام غلطی کو دور کرنے کے لیے کیا ہی اچھا ہوتا کہ رمضان المبارک میں روزانہ صبح صادق سے تھوڑی دیر پہلے ہی ہر مسجد میں اس طرح اعلان کر دیا جائے کہ تمام روزہ رکھنے والے اسلامی بھائی، بہنیں کھانا پینا بند کر دیں اور یہ بھی سمجھانا چاہیے کہ اذان فجر لازمی طور پر صبح صادق کے بعد ہی ہوتی ہے اور وہ روزہ بند کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف فجر کے لیے دی جاتی ہے"۔ (فیضان سنت: مولانا محمد الیاس قادری، ص ۷۰۵، مکتبۃ المدینہ کراچی)

الحمد للہ میرے گاؤں کی تمام مساجد میں اختتام سحر کے لیے اعلان ہوتا ہے اور دس منٹ بعد اذان فجر ہوتی ہے۔ یہ مولانا محمد اشرف نقشبندی علیہ الرحمہ کی محنت اور تربیت کا نتیجہ ہے۔

آخر میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ افطاری مغرب کی اذان کے ساتھ ہو سکتی ہے لیکن سحری کا اختتام اذان فجر سے پہلے ہونا چاہیے اور اذان کچھ وقفہ کے بعد ہونی چاہیے۔ اس لیے علماء، خطباء و ائمہ مساجد اور موذن حضرات کو چاہیے کہ اس مسئلہ پر توجہ دیں۔ اور روزوں اور نمازوں کو خراب ہونے سے بچائیں ورنہ بروز محشر اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

تحریر: محمد نور المصطفیٰ رضوی

مسائل روزہ

روزہ توڑنے والے کام: (۱) کھانے، پینے، یا جماع کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جب کہ روزہ دار ہونا یاد ہو ورنہ نہیں۔ (۲) حقہ سگریٹ، بیڑی، سگار وغیرہ پینے سے پان تمباکو وغیرہ کھانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے (۳) شکر چینی، گڑ وغیرہ ایسی چیزیں جو منہ میں رکھنے سے گھل جاتی ہیں۔ منہ میں رکھیں اور تھوک نگل لیا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ (۴) دانتوں میں کوئی چیز چنے برابر یا اس سے زیادہ تھی اُسے کھا گیا یا کم ہی تھی مگر منہ سے نکال کر پھر کھالی تو روزہ جاتا رہا۔

۵) دانتوں سے خون نکل کر حلق سے نیچے اترا اور مزا محسوس ہوا تو روزہ گیا۔ ایک دو بوند آنسو منہ میں چلا گیا تو حرج نہیں اگر زیادہ چلا گیا اور مزا حلق میں محسوس ہوا تو روزہ نہ رہا۔ (۶) نتھنوں میں دوا چڑھائی یا کان میں تیل ڈالا یا خود چلا گیا تو روزہ ٹوٹ گیا مگر پانی کان میں چلا گیا یا ڈالا تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (۷) منہ میں رنگین ڈورا رکھا جس سے تھوک رنگین ہو گیا اور تھوک نگل لیا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ (۸) قصداً منہ بھر قے کی اور روزہ دار ہونا یاد تھا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ اگر قے میں صرف بلغم ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔

جن چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا: (۱) بھول کر کھایا پیا یا جماع کیا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (۲) مکھی یا دھواں یا گرد حلق میں جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ لیکن اگر قصداً مکھی نگلی یا خود دھواں پہنچایا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ تیل یا سرمہ لگایا تو روزہ نہ ٹوٹا۔ (۳) دانت سے خون نکل کر حلق تک پہنچا مگر نیچے نہ اُترا یا بھولے سے کھانا کھا رہا تھا یاد آتے ہی فوراً نوالہ تھوک دیا تو روزہ نہ گیا یونہی سحری کھاتے کھاتے صبح صادق ہو گئی اسی وقت نوالہ اُگل دیا تو روزہ نہ ٹوٹا۔ (۴) تل یا تل کے برابر کوئی چیز چبائی یا وہ تھوک کے ساتھ حلق میں اتر گئی تو روزہ نہ گیا۔ مگر مزا حلق میں محسوس ہوا تو جاتا رہا۔

روزے میں جو کام مکروہ ہیں: (۱) جھوٹ، چغلی، غیبت، گالی دینا، بیہودہ بکنا، کسی کو ناجائز تکلیف دینا، ویسے بھی حرام مگر روزے میں زیادہ حرام اور اُن کی وجہ سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

۲)روزہ دار کو بلا عذر کسی چیز کا چکھنا یا چبانا مکروہ ہے۔(۳)منہ میں تھوک اکٹھا کر کے نگل جانا اچھا نہیں اور روزے میں تو یہ مکروہ ہے۔(۴)گلاب یا مشک وغیرہ سونگھنا داڑھی مونچھ میں تیل لگانا اور سرمہ لگانا مکروہ نہیں۔(۵)روزہ دار کے لیے کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کرنا مکروہ ہے

جن صورتوں میں قضا لازم ہے:(۱)گمان یہ تھا کہ صبح صادق شروع نہیں ہوئی اس لیے کھایا پیا اور بعد کو یہ خیال غلط ثابت ہوا یا یہ گمان کر کے کہ سورج ڈوب چکا ہے افطار کر لیا حالانکہ سورج ڈوبا نہیں تھا تو روزہ ٹوٹ گیا مگر صرف قضا رکھے۔(۲)بھول کر کھایا پیا اور گمان کیا کہ روزہ ٹوٹ گیا اور اب قصداً کھایا پیا تو صرف قضا ہے۔(۳)کان میں تیل ٹپکایا یا پیٹ یا دماغ کی جھلی تک زخم تھا اس میں دوا ڈالی جو پیٹ یا دماغ تک پہنچ گئی یا ناک سے دوا چڑھائی یا پتھر، کنکری، مٹی، روئی، کاغذ، گھاس وغیرہ ایسی چیز کھائی جس سے لوگ گھن کرتے ہیں تو صرف قضا لازم ہے۔(۴)صبح کو نیت نہیں تھی اور زوال سے پہلے کر لی مگر پھر کچھ کھا لیا تو صرف قضا کرے (۵)حلق میں بارش کی بوند یا اولا چلا گیا یا بہت سے آنسو یا پسینہ نگل لیا تو صرف قضا ضروری ہے۔

جن حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے:(۱)سفر شرعی، حمل، بیماری اور بڑھاپا، ہلاک ہونے کا ڈر، یہ سب روزہ نہ رکھنے کے عذر ہیں۔ان عذروں کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا گناہ نہیں مگر بعد میں قضا ضروری ہے۔(۲)بھوک یا پیاس ایسی ہو کہ ہلاک یا پاگل ہو جانے کا ڈر ہو۔(۳)سانپ نے کاٹا یا ویسے ہی جان کا خطرہ ہو تو روزہ توڑ دیں۔شیخ فانی یعنی وہ بوڑھا جو عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اب روز بروز کمزور ہی ہو گا تو اُسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ہاں روزے کے بدلے فدیہ یعنی دونوں وقت ایک مسکین کو پیٹ بھر کھانا کھلانا اُس پر واجب ہے۔اگر فدیہ ادا کرنے کے بعد روزہ رکھنے کی طاقت دوبارہ آ گئی تو روزہ رکھنا واجب ہے۔اور یہ فدیہ صدقہ نفل ہو گیا۔نوٹ:رمضان کا روزہ قصداً توڑنے سے کفارہ لازم ہو جاتا ہے یعنی ایک غلام آزاد کرنا یا لگاتار ساٹھ روزے رکھنا یا ساٹھ مسکینوں کو پیٹ بھر دونوں وقت کھانا کھلانا۔

کرنل (ر) الطاف محمود ہاشمی ☆

قبر سے حصول فیض (آخری قسط)

یہ بات متفق علیہ ہے کہ زندگی کے اعمال کے نتیجہ کا حصول برزخی زندگی میں قیامت تک طاری اور جاری وساری رہے گا۔ ان معنوں میں حصن حصین میں یہ حدیث وارد ہے: كَمَا تَعِيْشُوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَكَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ [ترجمہ: جس عمل پر زندگی گزارو گے اسی پر موت آئے گی اور جس عمل پر مرو گے (قیامت کے دن) اسی پر اٹھائے جاؤ گے۔] یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ نور عطا فرما دیا اور ان کا خاتمہ بخیر ہو گیا، یہ نور قیامت تک ان کے جسم و روح پر وارد ہوتا رہے گا۔ جس طرح زندہ شخص سے یہ انوار دوسرے کو منتقل ہوتے ہیں اسی طرح فوت شدہ شخص سے بھی ان کا ورود جاری رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ زندہ شخص خود اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق یہ انوار دوسروں کو منتقل کرتے ہیں جبکہ فوت شدہ شخص سے یہ انوار اپنی ہمت سے لینا پڑتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت خواجہ محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ نے ''ذکر خیر'' میں توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اس سے متعلق بیان کیا ہے!

''فرمایا کہ فوت شدہ اولیاء اللہ میں نفس نہیں ہوتا۔ اس واسطے فیض لینے والے کو اپنی طاقت سے کھینچ کر فیض لینا پڑتا ہے۔ اور صاحب ارشاد کی صحبت میں بہت فائدہ ہے کیونکہ اس میں نفس ہے اور اس نفس کی عجیب خاصیت ہے۔ جب یہ برائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا ویسے ہی جب یہ قابو میں آ جائے اور مطمئن ہو جائے تو کام بھی بڑے اچھے کرتا ہے...... فوت شدہ اولیاء اللہ کی قبر سے ابتدا میں فیض لینا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ چاہیے کہ زندہ صاحب ارشاد سے بیعت ہو کر پہلے فیض لینے کی اٹکل (طریقہ) سیکھے پھر اگر قبور سے فیض لے تو ترقی ہو سکتی ہے ورنہ دیکھ لو قبور پر جو مجاور بیٹھے رہتے ہیں کسی کو فیض کی خبر ہی نہیں اور سب سے زیادہ ان کو ہی فیض ہونا چاہیے تھا

(☆ 0300-5570547، فلیٹ نمبر D-48، عسکری-7، اڈیالہ روڈ راولپنڈی

کیونکہ ہر وقت یہ ان کے پاس رہتے ہیں۔ اور زندہ اولیاء اللہ کے پاس اگر یونہی بیٹھ جاؤ چاہے متوجہ بھی نہ ہو، نہ فیض کھینچو، تاہم بلا ارادہ فیض پڑتا رہتا ہے''۔

اس تحریر کے ہر قاری سے میرا سوال ہے کہ وہ آج تک جن بزرگوں کی خدمت میں جاتے رہے ہیں، کیا ان کی خدمت سے ''سفر در وطن'' میسر آیا ہے؟ سفر در وطن، چلوں اور وظیفوں (اگر انہوں نے کرائے ہوں) کے نتیجہ میں انوار کا ورود اور شرح صدر محسوس کیا ہے؟ اگر جواب ''ہاں'' میں ہے تو بہت خوب، ان صاحب کا پلہ کبھی نہ چھوڑیے۔ اور اگر جواب نفی میں ہے تو اپنی عقیدت کے قبلے کا رخ درست کرنے کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے تا کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب ﷺ کے سامنے شرمندگی سے بچ سکیں۔ (جواب نفی میں ہونے کی صورت میں میری تحریر ''بیعت اور تجدید بیعت'' کا مطالعہ فرمائیں۔) آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم برس ہا برس ایسے لوگوں کی خدمت میں حاضر ہونے، نذرانے پیش کرنے، ان کے بتائے ہوئے عملیات و معمولات پر عمل کرنے کے باوجود کیوں قرآنی انوار اور شرح صدر سے محروم رہتے ہیں؟ چلیں یہ نہیں حاصل ہو سکا تو کم از کم اس کا شوق ہی پیدا ہو جاتا اور ایسے شخص کی تلاش کا بھوت ہی سوار ہو جاتا جسے اللہ تعالیٰ نے ان انعامات سے نوازا ہو۔ غالباً اس کی وجہ ایسے نام نہاد بزرگوں کے کردار میں سوائے شہوت، غصہ، لالچ، حسد اور تکبر اور کچھ ہے ہی نہیں۔ گدیوں کو تربیت کی بجائے کاروباری بنا دیا گیا ہے۔ آیئے نامکمل اور ناقص لوگوں سے اخذِ فیض یا حصولِ فیض کے نتائج پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ذکرِ خیر میں خواجہ محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے!

''(حضرت توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ نے) میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا سکرت کی حالت میں ایک روز ہماری سیر ہوئی۔ ہم چھلوں (ہندوؤں کے مردے جلانے کی جگہ) میں گئے تو وہاں کلمہ شریف کا فیضان محسوس ہوا۔ ہم نے جو خیال کیا تو ایک شخص کو وہاں کلمہ شریف پڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ شخص وہاں کلمہ شریف بھی پڑھتا تھا مگر اس کے پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی

اور دھواں نکلتا تھا۔ ہم نے پوچھا اس کی کیا وجہ کہ تیرا اور تمام بدن تو اچھا ہے اور پیٹ سے دھواں نکلتا ہے؟ تو کہنے لگا کہ مجھے اسلام پر یقین تھا اور احکام اسلام کا متبع تھا لیکن میں جو کھانے کی حرص سے کافروں کے دین میں رہا اس واسطے اسی جگہ پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے باقی سب بدن آگ سے بچا ہوا ہے"۔

قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامہ" ☆ میں جھنگ کی کسی بہت بڑی گدی کے سجادہ نشین "غلام مرشد خان" کا واقعہ لکھا ہے۔ اس واقعہ کا ایک ایک لفظ اور ایک فقرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن گنجائش نہ ہونے کی بنا پر اس کا اختصار تحریر کرتا ہوں۔ غلام مرشد خان کے ہاں رات کو عرس "مبارک" کی دو محفلیں ہوتیں۔ پہلی محفل مریدین اور عام زائرین کے لیے جس میں قوالی، عارفانہ کلام اور "حال پڑنے" کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ دوسری محفل نصف شب کے بعد ضلعی اور دوسرے افسرانِ بالا کے لیے حضرت کی حویلی میں منعقد ہوتی جس میں طوائفوں کے مجرے کا خاص انتظام و انصرام ہوتا۔ یہ محفلِ رقص و سرود صبح تک جاری رہتی۔ حضرت غلام مرشد خان صاحب کو جو بچی پسند آتی اس کے گھر اپنی پگڑی بھجوا دیتے۔ جس گھر میں پگڑی پہنچتی اکثر گھروں والے اسے اپنے لیے باعثِ برکت سمجھتے۔ قدرت اللہ شہاب کو جھنگ کا ڈپٹی کمشنر ہونے کے ناطے ایک خط موصول ہوا "پیر صاحب کی پگڑی ہمارے گھر پہنچ گئی ہے، خدارا میری عزت بچائیں۔" رات کو ان کے گھر پر چھاپا مارا گیا۔ سکینہ کی عزت تو بچ گئی لیکن پیر صاحب پکڑے نہ جا سکے (آخر "بزرگوں کی اولاد" تھے کچھ نہ کچھ "کرامت" تو رکھتے ہوں گے کہ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ (الطاف) ان حضرت کا مزار یقیناً جھنگ میں کسی جگہ کسی نام سے موجود ہوگا اور حصولِ طریقت کے شائقین ان کے مزارِ پُرظلمات سے "فیض" اور "انوار" کی خیرات پانے جاتے ہوں گے اور اس کا بھرپور تذکرہ بھی کرتے ہوں گے۔ ان حضرت کا وزٹنگ کارڈ جو شہاب صاحب نے نقل کیا ہے یوں ہے:

حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکاں رہنمائے عاشقاں آفتاب طریقت ماہتاب معرفت

☆ یاد رہے کہ غلام مرشد خان فرضی نام ہے اور مذکورہ گدی اہل سنت کی نہیں ہے۔ (مدیر اعلیٰ)

جناب مخدوم زادہ غلام مرشد خاں صاحب پیر، لینڈ لارڈ اینڈ لیڈر

ایک سجادہ نشین جو اپنی جوانی سے لے کر اب بڑھاپے تک پرلے درجے کا زانی اور شرابی مشہور رہا ہے، ایک گدی کا سجادہ نشین ہونے کے ناطے اس کے پاس نیک و بد ہر قسم کے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ کل کلاں اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر خوبصورت مزار اور قبہ بنایا جائے گا اور ہم جیسے کتنے ناقص اس کی قبر سے ''فیض'' حاصل کرنے جایا کریں گے اور قبر سے اٹھ کر لوگوں کو صاحب مزار کے مقام و مرتبہ کے علاوہ خود کو حاصل ہونے والے فیض اور نور کا بھرپور ذکر کیا کریں گے۔

میرا سوال ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو کسی زندہ یا فوت شدہ شخص کو بزرگ گردان کر حصولِ فیض کے لیے جاتے ہوئے ان میں سے کسی بات کی بھی تحقیق کرتے ہوں؟ اس بات کا احتمال تو نہیں ہے کہ ہم جس شخص سے فیض حاصل کرنے جا رہے ہوں وہ قرآن پاک کی نظر میں مستقل جہنمی ہو اور حبیب خدا ﷺ کے فرامین کے مطابق منافق ہو؟ ایسے حضرات سے جوق در جوق فیض لینے کے لیے آنے والے لوگوں کو خیال کرنا چاہیے کہ کیا ان سے سفر در وطن، ورد و انوار اور شرح صدر کی کوئی موہوم سی توقع بھی ہوگی؟ ایسا شخص بزرگ، پیر یا سجادہ نشین چھوڑ الٹا لٹک کے نماز پڑھتا ہو، سارا دن لنگر کھلاتا ہو، ہوا میں اڑتا ہو کیا اس کی یہ کرامتیں مدنظر رکھی جائیں گی یا خدا اور اللہ کے حبیب ﷺ کے ارشادات؟ کیا ہم میں سے ہر مسلمان کا یہ فرض نہیں بنتا کہ حصولِ فیض سے قبل ان امور کا جائزہ لے؟ کیا یہی وجہ تو نہیں کہ ہم ایسا شخص تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے جو خدا اور رسول ﷺ کے فرامین کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو؟ ہم اللہ تعالیٰ کے فرامین اور اس کے رسول ﷺ کی سیرت کی روشنی میں شخصیت تلاش کرنے کی بجائے صرف زبان کے چسکے، خاندانی تعلق نبھانے کے پیچھے چل رہے ہوتے ہیں۔ ہم ان حضرات کے پاس حاضری کے وقت کیا واقعی فیض کے حصول کی غرض سامنے رکھتے ہیں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم سالہا سال انہی لوگوں کی غلام گردش میں رہنے کے باوجود خدا کے قرب کی جانب ایک قدم بھی

نہیں اٹھا سکتے ۔لاہوری درویش نے کیا خوب کہا ہے:

شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یادرکھیے اگر آپ کسی زندہ یا فوت شدہ بزرگ کی صحبت میں سفر در وطن کی منزل طے کر رہے ہیں تو واقعی وہاں فیض ہے ورنہ آپ وہم کا شکار ہیں جس کی بنا پر اپنا وقت اور وسائل آگ میں جھونک رہے ہیں۔

میں پچھلے کافی عرصہ سے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جس کا اللہ تعالیٰ پر توکل کامل اور محکم یقین ہو۔اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میرے تعلقات ایسے افراد اور خانوادوں سے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا طریقت اور شریعت ہے۔میں نے جس جس سے بات کی کہ ایسا کوئی شخص ان کی نظر سے گذرا ہو تو میں ان کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ان لوگوں سے جو جواب ملا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسے لوگ کتابوں میں ہی ملتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے خاص کرم فرمایا اور مجھے ایسے ہی ایک شخص سے ملا دیا۔دور دراز گاؤں میں مقیم ،مکمل طور پر عزلت گزیں ،گم نامی میں خوش ،باتیں پُر اثر ،صحبت پُر اطمینان۔مرشد نے ایک بار کہہ دیا ''شاہ صاحب! آپ میرے امام ہیں'' اس کے بعد برس ہا برس تک شاہ صاحب باوضو رہے کہ شیخ کسی بھی وقت امامت کے لیے بلا لیں گے۔زندگی امتحانوں سے پُر ،لیکن کہنا یہ ہے کہ ''اگر دعا قبول ہو جائے تو ایک بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہے، اور جب دعا قبول نہ ہو یا مرضی کے خلاف فیصلہ ہو جائے تو دو بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے نقصان سے بچا لیا ہے۔کوئی سجادہ نشین انہیں اجازت و خلافت نہیں دیتا کیونکہ سجادہ نشینوں کی خلافتیں تو سیاسی ہوتی ہیں جبکہ اس خدا پرست انسان سے انہیں کسی قسم کی مالی یا افرادی یافت کی امید نہیں۔میں نے پورا زور لگایا کہ سلسلہ بیعت شروع فرمائیں جیسا کہ ان کے مرشد نے سنت کے مطابق ان کو اپنا مصلا بخشا اور ان کی اقتدا میں نماز ادا کر کے انہیں اجازت

بخشتی۔ اُن کا اصرار رہا کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں، اگر یہ کام کروانا ہوا تو جس طرح مرشد پہلے انہیں رہنمائی بخشتے ہیں اسی طرح خواب میں حکم دے دیں گے تب اس کے متعلق سوچوں گا۔

یہ تفصیل لکھنے کا مقصد آپ کو مزارات سے برگشتہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ باور کروانا ہے کہ ہم میں کسی بھی شخصیت یا مزار پر جانے سے قبل اتنی قابلیت ہونی چاہیے کہ وہ صاحب مزار شخصیت ہے کیا۔ وہاں نور ہے بھی یا نہیں؟ یا وہاں ظلمت ہے اور ہم ظلمت میں سے حصہ لے کر اور اپنا موجودہ نور بھی برباد کر کے تو واپس نہیں آرہے؟۔

کوئی ایسا مزار ہو یا زندہ شخص جس کے متعلق گمان ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے فیض کی نعمت سے نوازا ہے اور وہ حصولِ فیض کا ذریعہ بھی ہے تو سب سے پہلے اس بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ وہاں فیض ہے بھی یا ہم وہم کا شکار ہو گئے ہیں؟ مثلاً اگر کسی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ بہت بڑے ولی اللہ ہیں اور ہم ان کے پاس کسبِ فیض کے لیے جاتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان حضرت کی حالت یہ ہے کہ عبادات میں اکثر مقامات پر سنتوں پر عمل پیرا نہیں ہیں، معاملات کا یہ حال ہے کہ دوسروں کا شرعی حق کھائے بیٹھے ہیں، نہ تو معاف کرایا اور نہ ہی ادا کیا۔ آپ خود سوچیے کیا ایسے شخص سے انوار اور فیض کا ورود ممکن ہے؟ پھر ہمارا یہ فیض محسوس کرنا چہ معنی دارد؟ یہی وہم ہے جس میں ہمارے عوام و خواص کی ایک بہت بڑی آبادی مبتلا ہو کر بے عمل ہو گئی ہے اور خود کو یا اپنے پیروں کو قلندر سمجھ کر نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسی فرض عبادات کے متعلق کہتے پھرتے ہیں کہ انہیں معاف کر دی گئی ہیں۔ نبی ﷺ کو تو نماز معاف نہیں، ان قلندر صاحب کو معاف ہے۔ معاذ اللہ من ذالک کسی بھی عالم سے پوچھ لیجیے کہ وہ شخص جو بقائمِ ہوش و حواس یہ دعویٰ کرے کہ اسے نماز معاف کر دی گئی ہے وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں؟

آیئے اس کی کچھ مثالیں پیش کردوں:

اس فیض کے ورود کا احساس سب سے پہلے اپنے اوپر ہوتا ہے اور اس تواتر سے ہوتا ہے کہ وہم کا شائبہ تک نہ رہے۔ کامل پیر کی رہنمائی میں وہم اور ورودِ انوار کا فرق ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ جب تک

سالک کو یہ مقام حاصل نہ ہو تب تک مزار سے حصول فیض تو دور کی بات ہے بلا تحقیق ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا بھی ایمان کا جنازہ نکال سکتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

''اگر پیر سے کسی وقت خلاف شریعت کام ہو جائے تو مرید کو چاہیے کہ اس امر میں پیر کی تقلید نہ کرے۔'' (مکتوب شریف نمبر 313 دفتر اول)

یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہمارے پیشہ ور پیر شریعت سیکھنے ہی نہیں دیتے۔ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے استنجا، وضو کا طریقہ، نماز اور زکوۃ وغیرہ اپنے پیر کی تقریروں یا صحبت سے سیکھا ہو؟ حضرت محبوب عالم رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''ذکرِ خیر'' میں اپنے مرشد کامل حضرت توکل شاہ انبالوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں!

''ایک روز اس بات کا ذکر تھا کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے یا نہیں اور جو قبروں سے فیض لیتے اور اسے اویسیہ طریق بتاتے ہیں اس کا کیا حال ہے؟ حضور نے فرمایا ہاں فیض ہوتا ہے اور ہم نے بھی بہت قبروں سے فیض لیا ہے۔ایک دفعہ ہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روح مبارک سے فیض لینے لگے بہت ہی فیض ہوا، خوب لذت آئی۔ہمیں فیض لیتے لیتے کوئی دو اڑھائی گھنٹے لگ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میرے داہنے ہاتھ کی انگلیاں جھٹک کر فرمایا!! ''بس بھی کر''۔ پھر فرمایا کہ ہمارے اس ہاتھ کی انگلیوں میں تین دن تک درد رہا۔

فرمایا! ایک روز ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فیض لے رہے تھے۔ہم نے دیکھا کہ روحوں کا ایک گروہ آیا ہے اور ہمیں کہہ رہا ہے کہ ''یہ سیّد ہے۔'' میں نے خیال کیا کہ ان کو کس طرح معلوم ہوا؟ پھر ہمیں خیال آیا کہ یہ جو ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیض لے رہے تھے اور ہمیں اس میں فنا ہو گئی تھی اس فیض سے انہوں نے معلوم کیا کہ یہ سیّد ہیں۔معلوم ہوا کہ یہ روحیں اس تجلی کی خادم ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیض ہے اس سے انہوں نے معلوم کیا۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''شہاب نامہ'' کے باب ''چھوٹا منہ بڑی

بات'' میں اپنا واقعہ نقل کیا ہے جس کی تلخیص کچھ یوں ہے: ایک بار مجھے کسی چھوٹے سے گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں ایک نیم خواندہ سے مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے ایک داستان سنائی کہ حضور رسول کریم ﷺ جب اپنے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی کوئی درخواست یا فرمائش منظور نہ فرماتے تو وہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی درخواست پیش کرتے کہ حضور ﷺ سے منظور کروالائیں۔ حضور نبی کریم ﷺ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایسی درخواست یا فرمائش خوشدلی سے منظور فرمالیتے۔

جمعہ کی نماز کے بعد کچھ نفل میں نے حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روح مبارک کو ایصال ثواب کی نیت سے پڑھ کر دعا مانگی: ''یا اللہ! میں درخواست کرتا ہوں کہ تو حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روح طیبہ کو اجازت مرحمت فرما کہ وہ میری ایک درخواست اپنے والد گرامی ﷺ کے حضور میں پیش کر کے منظور کروالیں۔ میں اللہ کی راہ کی تلاش میں مروجہ راستوں پر چلنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اگر سلسلہ اویسیہ واقعی حقیقت ہے تو مجھے اس سے استفادہ کرنے کی ترکیب اور توفیق عطا فرمائی جائے۔''

چھ سات ہفتے بعد اچانک میری جرمن بھابی کا ایک عجیب خط موصول ہوا۔ وہ مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کی پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

The other night I had the good fortune to see "Fatimah" daughter of the Holy Prophet (Peace be Upon Him) in my dream. She talked to me most graciously and said, "Tell your brother in law Qudrat Ullah Shahab, that I have submitted his request to my exalted Father who has very kindly accepted it."

[ترجمہ: اگلی رات میں نے خوش قسمتی سے فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے میرے ساتھ نہایت تواضع اور شفقت سے باتیں کیں اور فرمایا کہ اپنے دیور قدرت اللہ شہاب کو بتا دو کہ میں نے اس کی درخواست اپنے برگزیدہ والد گرامی ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ انہوں نے ازراہ نوازش اسے منظور فرما لیا ہے۔]

یہ خط پڑھتے ہی میرے ہوش و حواس پر خوشی اور حیرت کی دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ یہ تصور کہ اس برگزیدہ محفل میں ان باپ بیٹی کے درمیان میرا ذکر ہوا، میرے روئیں روئیں پر ایک تیز و تند نشے کی طرح چھا جاتا تھا۔ دو تین دن میں اپنے کمرے میں بند ہو کر دیوانوں کی طرح اس مصرع کی مجسم صورت بنا بیٹھا رہا۔

مجھ سے بہتر ذکر میرا ہے کہ اس محفل میں ہے

جب تک سالک اس کیفیت کو نہ پہنچ جائے تب تک ہر معروف بزرگ کے پاس اس نیت سے بیٹھنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ جب تک انسان شہوت، غصہ، حرص و لالچ، بخل، حسد اور تکبر کے منفی اثرات سے دوچار ہے تب تک یہ نور وارد ہوتا رہتا ہے۔ ابتدائی طور پر اس نور اور وہم میں فرق کرنا ایک کڑا امتحان ہے۔ اس سے بھی مشکل اوپر بیان کردہ بیماریوں کے منفی اور مثبت اثرات کا ادراک اور ان میں فرق کرنا ہے۔ مبتدی (جس کی طریقت کی تعلیم میں ابھی ابتدا ہو) بسا اوقات حرص اور لالچ کو مثبت سمجھ رہا ہوتا ہے جبکہ وہ سالک کے ایمان کا جنازہ نکال کے رکھ دیتا ہے۔ آج ہمارے ہاں اس رہنمائی کے داعی ہر گاؤں، قصبے اور گلی محلے میں موجود ہیں (جن میں سے اکثریت پیشہ ور عاملوں کی ہے جو علم سے بے بہرہ اور کالے علم سے پیسہ کمانے کا اڈا کھولے بیٹھے ہیں۔ باقیوں نے تسخیر کا کوئی عمل سیکھ رکھا ہے اور اسے پیشہ کے طور استعمال کر رہے ہیں۔) جو لوگ رضاء الٰہی کے راستے کے متمنی اور خواہشمند ہیں وہ اپنے تئیں حقیقی مردان کمال کو تلاش کرتے تو ہیں لیکن تھک ہار کر خاندانی گدیوں کے سجادہ نشینوں پر اکتفا کرتے ہوئے اس نظام گردش میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ گدیاں جہاں انتظام کی خوبصورتی، وقت بے وقت

کھانے کا اہتمام، لوگوں کی آمد و رفت اور بالخصوص اپنی تعریف میں شائع شدہ رسائل وغیرہ کی بہتات ہو۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں بہت گھوما ہوں اور ایسے سینکڑوں لوگوں سے ملا ہوں لیکن ان میں سے صرف دو سجادہ نشین (خواجہ غلام سدید الدین اور حضرت پیر اعظم شاہ) ایسے تھے جو اپنی ذات میں مجھے کامل محسوس ہوئے لیکن دوسروں کو نوازنے کے معاملے میں صرف ایک حضرت کو کسی حد تک دسترس تھی۔ لیکن ان کے ہاں بھی سنتوں اور طریقت پر عامل جماعت نظر نہیں آئی۔ سیدا شریف میں میرے شیخ ابوالوفا حضرت صدیق احمد اس طرح کی ایک مختصر جماعت بنانے میں کامیاب ہوئے لیکن آپ علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد غالباً ہم جانشینان کی تربیت کی کمی کی بنا پر ان میں سے کئی ایک سالک و راغب طریقت میں مزید ترقی نہ کر سکے۔ اس کے باوجود اس جماعت کے زیادہ تر لوگ سنت ہائے نبوی ﷺ پر آخر تک کاربند رہے۔ میں ذاتی طور پر اسے بھی بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں۔ حضرت خواجہ غلام فخر الدین سیالوی علیہ الرحمہ سیال شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی تھے لیکن کمال میں تقریباً انہیں کے ہم پایہ تھے۔ ویسے بھی تاریخ پر نظر ڈالیں تو مجھے کم ہستیاں ہی ایسی نظر آتی ہیں جن کی اولاد واقعی اس قابل ہو سکی کہ لوگوں کو فیض دینے کے قابل ہو۔ آپ تجربے کے لیے سجادہ نشینوں کے پاس حاضری دیں، آپ کو مندرجہ ذیل قسم کی گفتگو سننے کو ملے گی:

1۔ سیاست، گاڑیاں، پلاٹ، بڑے لوگوں سے تعلقات وغیرہ

2۔ تعویذات کے ذریعے کامیاب علاج کے تذکرے

3۔ بزرگوں کی غلط اور بچی جھوٹی حکایات، پر اثر لیکن بے سروپا ارشادات۔ مثلاً میں نے بہت عرصہ قبل ایک واقعہ سنا۔ ہمارے علاقے کے ایک گاؤں میں ایک حافظ صاحب کے پاس ایک گڈریا آیا کہ وہ جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کے والد نے شرط لگائی ہے کہ قرآن پاک حفظ کرو تو بیٹی کا ہاتھ دوں گا۔ اس عمر میں حفظ کرنا ممکن نہیں، کوئی تعویذ وغیرہ بنا دیں کہ شادی حسب منشا ہو جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ تم ظہر کی نماز میرے پیچھے پڑھنا۔ اس نے ظہر کی نماز ان

کے پیچھے ادا کی۔ نماز کے بعد ان بزرگ نے دائیں طرف سلام پھیرا تو اس طرف والے نمازی حافظ ہو گئے، بائیں سلام پھیرا تو ادھر والے لوگ حافظ ہو گئے۔ ہم نے اس واقعہ کی بہت تحقیق کی مگر اس کی کہیں سے کوئی اصل نہیں مل سکی۔

4۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلقات اور وہ طریقے جو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں ان سب کا رخ پیر کے آداب پر آ ختم کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ سدید الدین رحمۃ اللہ علیہ معظم آبادی کے حوالہ سے درج ذیل واقعہ تواتر سے بیان کیا جاتا ہے کہ:

''سورۃ لہب نماز میں نہیں پڑھنی چاہیے کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے چچا کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ جس گستاخ رسول (ﷺ) کے ہاتھ ٹوٹنے کا حکم دے رہا ہے اور اس کے ہاتھ اس عبرت ناک انداز میں توڑے کہ اہلیانِ مکہ تو ایک طرف اس گستاخ کی اپنی سگی اولاد بھی پناہ مانگتی رہی، ہم اس کے چچا ہونے پر اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی سورۃ پڑھنے سے امت کو روکنے کی کوشش کر کے ''ثواب دارین'' میں ''حصہ دار'' بننے کے خواب دکھا رہے ہیں''۔

غالباً اس کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ گستاخ رسول چچا کے احترام میں قرآن ترک ہو سکتا ہے تو پیر صاحب جو کہ نائب رسول (ﷺ) ہیں کے احترام کا عالم کیا ہونا چاہیے۔ یہاں حضرت صاحب معظم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے الفاظ نقل کر دوں کہ انھوں کہا کیا تھا جنہیں بگاڑ کر ہم نے مریدوں کے دلوں میں اپنا جھوٹا سچا احترام پیدا کرنے کے لیے کیا سے کیا بنا دیا۔

حضرت صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا!

''قرآن کریم کی وہ آیات اور سورتیں جن میں عذاب اور سزاؤں وغیرہ کا ذکر ہے وہ جلالی ہیں اور جن میں رحم و کرم، جنت کی نعمتوں اور خوشخبریوں کا بیان ہے، ان کا مزاج جمالی ہے۔ سارا کلام خدا کا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں لیکن بزرگانِ دین اکثر فرض نمازوں میں جمالی آیات اور سورتوں کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ یہ عمل بھی عشقِ الٰہی کے حصول کے لیے مجرب ہے۔ سورۂ لہب کم پڑھنی چاہیے (یہ نہیں فرمایا کہ بالکل نہیں پڑھنی چاہیے) کیونکہ اس میں قہرِ الٰہی کی

جھلک ہے اور ہر آیت دوسری سے بڑھ کر ہے۔ بندے کا کام تو اپنے رب کو راضی کرنا ہوتا ہے نہ کہ بار بار اس کے قہر وغضب کا ذکر کرنا۔" (ملفوظات شدید یاز: پروفیسر ڈاکٹر صاحبزادہ معین نظامی، اشاعت اول فروری 1990ء/رجب المرجب 1410ھ، صفحہ 64)

تبصرہ کرنے کی بجائے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ بات تھی کیا اور کیا بنا دی گئی۔

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فیض خواہ زندہ سے لینا ہو یا صاحب مزار سے، پہلے سالک و راغب کو یہ مقام حاصل ہونا چاہیے کہ جس کے پاس حصول فیض کے لیے حاضر ہو رہا ہے اس کے سینے اور قبر میں نور ہے بھی یا نہیں۔ اگر اسے زندہ شخصیت کے متعلق ہی معلوم نہیں ہو پایا کہ اس کے سینے میں فیض ہے بھی یا نہیں جبکہ وہ سامنے ہے، اس کی صحبت میسر ہے، اس کے معمولات اور اعمال دیکھے جا سکتے ہیں تو فوت شدہ شخصیت جو خود منوں مٹی کے نیچے ہے، جسے آپ دیکھ نہیں سکتے اس کے متعلق فیض کی موجودگی کا از خود اندازہ لگا لینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے، آپ خود بہتر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ لہذا جب تک سالک اس مقام کو نہیں پہنچتا کہ:

وہم اور فیض میں امتیاز کر سکے

فیض کو یقین کی حد تک درست محسوس کر سکے

زندہ صاحب فیض سے اخذ فیض کر سکے

تب تک اسے قبر سے حصول فیض کے معاملے میں بہت احتیاط برتنی چاہیے۔ اس مقام کے سالک کو چاہیے کہ ان چکروں میں پڑنے کی بجائے نماز، روزہ، احکام شریعت اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کرتا رہے اور ساتھ ساتھ اس دشت کی شناوری کے لیے بھی کوشاں رہے یہاں تک کہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے صحیح ادراک عطا فرما دے۔

جس طرح حصول فیض کے لیے فیض لینے کا طریقہ اور اہلیت ضروری ہے اسی طرح فیض دینے کے لیے بھی فیض ہونے کے ساتھ ساتھ فیض منتقل کرنے کا طریقہ اور اہلیت ہونا ضروری ہے۔ ایک شخص نے پی۔ایچ۔ڈی۔ کر رکھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی شخصیت میں

پڑھانے کی اہلیت رکھی ہی نہیں تو وہ اتنا علم ہونے کے باوجود دوسروں کو منتقل کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس کے مقابلے میں ایک کم پڑھا ہوا شخص جس کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے پڑھانے کی خوبی عطا فرمائی ہے اُسے ہر کوئی اچھا استاد کہے گا اور اُس سے استفادہ بھی زیادہ کرے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فیض لینے کے لیے ہمیشہ صاحب ارشاد کا مرید بننا چاہیے کیونکہ اس کے پاس فیض ہوتا بھی ہے، اور اُسے منتقل کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ:

(1) بہت سے بزرگ ایسے ہیں جن کے پاس فیض ہوتا ہے مگر سالکین کو حاصل نہیں ہوتا یا اس کے حصول میں از حد محنت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں مجذوب اور ملامتی بزرگ شامل ہیں۔ مجذوبوں کے ہاں جانے سے پرہیز کرنا چاہیے اگرچہ اخذ فیض کرنا آتا بھی ہو۔

(2) بہت سے مشہور مزارات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق عوام الناس کا گمان ہوتا ہے کہ یہاں فیض کا انبار ہے جبکہ وہاں کچھ نہیں ہوتا بلکہ نور کی بجائے ظلمت ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہوتی ہے۔ ان کی مثالیں پہلے بیان کر دی گئی ہیں۔

(3) چند مزارات ایسے ہیں جن کے متعلق جیسا مشہور ہوتا ہے ویسا ہی فیض ان کے ہاں ہوتا ہے اور ہر لینے والے کو ملتا بھی ہے۔ اس کی بہت سی ذاتی مثالیں میں نے عرض کر دی ہیں۔

مزار سے کسبِ فیض کا طریقہ:

1۔ کسی کامل کے مزار پر حاضری سے قبل نیت کرے کہ وہ کیوں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ میرے گمان میں جس مزار پر واقعی انوارات اور فیوض و برکات ہیں وہ صاحب مزار ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے **انعمت علیھم** فرمایا ہے لہٰذا یہ نیت کرلے "یا اللہ! تو نے جو انعامات اس شخص پر کیے ہیں ان میں سے مجھے بھی حصہ عطا فرما۔" جب مزار پر پہنچے تو اگر قدمین کی طرف راستہ ہو تو ادھر سے حاضر ہو ورنہ زور نہ کرے اور جہاں سے راستہ ملے وہاں سے حاضر ہو جائے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قبر کو چومنا چاہیے اور کچھ لوگ اسے مناسب نہیں سمجھتے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ قبر سے چار ہاتھ دور رہنا چاہیے۔[1] دیوبندی مکتبہ فکر کے مستند عالم رشید احمد گنگوہی بھی حصول فیض از مزارات کو جائز سمجھتے ہیں۔[2]

اگر صاحب مزار کے چہرہ مبارک کے سامنے جگہ خالی ہے تو وہاں بیٹھ جائیں ورنہ جہاں جگہ ملے وہاں تشریف رکھیں۔ یہاں قرآن پاک، کلمہ شریف، درود شریف یا جو سورتیں وغیرہ پڑھنا چاہیں ان کی تلاوت کرکے صاحب مزار کے لیے ایصالِ ثواب کرکے دعا مانگیں "یا اللہ! اپنے اس مقبول بندے پر تو نے جو انعامات فرمائے ہیں ان کا کچھ حصہ مجھے بھی عطا فرما۔"

اس کے بعد مکمل خاموشی اختیار کرکے مراقبہ فرمائیں۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے "مراقبہ اسم ذات"[1] کریں۔ اور پھر "مراقبہ رحمۃ اللعالمین ﷺ"[2] فرمائیں۔ منتہی سالکین آخر میں

---

۱) مزارات شریف میں حاضر ہونے میں پائینتی کی طرف سے جائے اور کم از کم چار ہاتھ کے فاصلے پر مواجہ میں (چہرہ کے سامنے) کھڑا ہو اور متوسط آواز (میں) باادب سلام عرض کرے۔ السلام علیک یا سیدی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پھر درود غوثیہ تین بار، الحمد شریف ایک بار، آیت الکرسی ایک بار، سورۃ اخلاص سات بار، پھر درود غوثیہ سات بار، اور وقت فرصت میں سورۃ یٰسین اور سورۃ الملک بھی پڑھ کر اللہ عزوجل سے دعا کریں کہ الٰہی اس قرأت پر مجھے اتنا ثواب دے جو تیرے کرم کے قابل ہے نہ اتنا جو میرے عمل کے قابل ہے۔ اور اسے میری طرف سے اس بندہ مقبول کو نذر پہنچا۔ پھر اپنا مطلب جو جائز شرعی ہو اس کے لیے دعا کرے اور صاحب مزار کی روح کو اللہ عزوجل کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ قرار دے۔ پھر اس طرح سلام کرکے واپس آئے، مزار کو نہ ہاتھ لگائے نہ بوسہ دے اور طواف بالاتفاق ناجائز ہے اور سجدہ حرام۔ فتاویٰ رضویہ: جلد نہم: باب الجنائز: مسئلہ نمبر 150: صفحہ نمبر 522: شائع کردہ رضا فاؤنڈیشن: جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لاہوری دروازہ: لاہور۔

۲) رشید احمد گنگوہی صاحب فتاویٰ رشیدیہ میں "قبروں پر شرح صدر کی اصلیت" کے باب میں یوں رقم طراز ہیں: سوال: بعض صوفی قبور اولیاء پر چشم بند کرکے بیٹھتے ہیں اور سورۃ الم نشرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا سینہ کھلتا ہے اور ہم کو بزرگوں سے فیض ہوتا ہے۔ اس بات کی کچھ اصل بھی ہے یا نہیں؟

جواب: اس کی بھی اصل ہے، اس میں کوئی حرج نہیں اگر نیت خیر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

صاحب مزار کا مراقبہ کریں یعنی صاحب مزار کی طرف متوجہ ہو کر ان کے قلب کے نیچے اپنا قلب رکھ کر فیض لینے کی کوشش فرمائیں۔ مبتدی اور متوسط کو چاہیے کہ صاحب مزار کی بجائے اپنے مرشد کا تصور کرے کہ ان کے سینہ اقدس سے ایک نور میرے سینہ میں آ رہا ہے۔ اس بات کی دوبارہ تاکید کر رہا ہوں کہ صاحب مزار کی بجائے اپنے مرشد کا تصور کریں البتہ منتہی کے لیے آزادی ہے، صاحب مزار کا تصور کرے یا اپنے مرشد کا، یا دونوں کا۔ وہ لوگ جو لطائف اور حقائق کے اسباق میں سے گزر رہے ہوتے ہیں (اگر وقت اجازت دے تو) ان کے لیے بہتر ہے کہ اپنے لطائف اور حقائق یا جہاں تک کا وہ سبق لے چکے ہیں ان کا مراقبہ بھی کر لیں۔ متوسط اور منتہی سالکین یہ محسوس کرنے کی کوشش کریں کہ دوران مراقبہ کونسا لطیفہ زیادہ روشن ہوتا ہے اور کونسی حقیقت زیادہ واضح ہوتی ہے؟ ایک مزار پر متعدد بار حاضری کے بعد سالک کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ کس مزار سے کس مقام کا فیض حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ ابھی تک سلسلہ بیعت میں داخل نہیں ہوئے یا جنہیں اسباق شروع نہیں کرائے گئے ان کو مراقبہ اسم ذات اور مراقبہ رحمۃ اللعالمین ﷺ پر ہی اکتفا کرنا چاہیے اور صاحب مزار کی طرف متوجہ ہونے کی جرأت کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ جب مراقبات سے فارغ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے۔ یہ بات خاص طور پر ذہن نشین

---

۱) مراقبہ اسم ذات: اپنے دل کی دھڑکن کی طرف متوجہ ہوں، اسے غور سے سنیں اس سے اللہ اللہ اللہ کی آواز سنائی دے گی۔ زبان بند کر کے اس آواز کو سنتے رہیں۔ اگر مشکل پیش آئے تو اپنی کلائی پر نبض محسوس کریں اور زبان کے ساتھ اللہ اللہ اللہ کہیں۔ جب زبان اور نبض ایک ساتھ چلنا شروع ہو جائیں اس وقت زبان بند کر لیں اور دل کی دھڑکن پر غور کریں کہ نبض لفظ اللہ کہہ رہی ہے۔ یہ مراقبہ دن میں بھلے بہت مرتبہ کریں لیکن ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ تک ہی کریں۔

۲) مراقبہ رحمۃ اللعالمین ﷺ: تصور میں اپنے آپ کو روضہ مبارک رسول اللہ ﷺ کے سامنے لے جائیں اور آپ ﷺ کے روضہ اطہر سے آنے والے انوار کو اپنے قلب پر ڈالیں۔ آپ ﷺ کے ہاں کئی رنگوں کے انوارات مختلف اوقات میں وارد ہوتے ہیں اس لیے اُدھر سے کسی رنگ کا نور آئے وہ انعام ہے، اسے دامن قلب میں سمو لیں۔

رہے کہ دعا معطی حقیقی سمجھتے ہوئے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے، رخ خواہ جدھر بھی ہو۔ ہاں البتہ صاحب مزار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی دعا کی جلد قبولیت کا ذریعہ بنتا ہے۔

دعا مانگ کر جس طرح آپ حاضر ہوئے تھے اسی طرح وہاں سے واپسی کا راستہ اختیار کریں۔

لیکن یہاں ایک عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ میرا اپنا تجربہ ہے اور میں اس معاملہ میں سند کا درجہ نہیں رکھتا لہذا ہر شخص اپنی ذاتی استعداد کو استعمال کرتے ہوئے کوئی فیصلہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے سب وہموں سے اور شیطانی خیالات سے اپنے پناہ میں رکھے۔ آمین بحرمت سید المرسلین ﷺ۔

جن مزارات سے مجھے واقعی فیض ملا، ان میں سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مدینہ منورہ؛ حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ، العین، ابوظہبی؛ سلطان العارفین بایزید بسطامی، ایران؛ حضرت ابوالحسن خرقانی، ایران؛ ابوعلی فارمدی، ایران؛ حضرت سیدنا امام علی رضا، ایران؛ خواجہ محبوب عالم، سیدا شریف؛ سید حبیب اللہ شاہ، گجرات؛ خواجہ نور محمد مہاروی، چشتیاں شریف؛ شاہ سلیمان تونسوی؛ حضرت دوست محمد قندھاری، موسیٰ زئی شریف؛ حافظ عبدالکریم، عید گاہ، راولپنڈی؛ محمد فاضل شاہ، گڑھی شریف (ٹیکسلا) سید رحمت علی شاہ، تلمبہ خانیوال؛ سید محمود شاہ گیلانی، کروڑ پکا؛ حضرت طاہر بندگی میانی صاحب، لاہور؛ سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش، لاہور؛ بابا فرید الدین گنج شکر، پاکپتن شریف؛ میر سید شفاعت علی بخاری، اسلام آباد؛ حضرت امین الدین مہی، نانک پور، پاکپتن شریف؛ حضرت عین الدین، بھگوانپور، تحصیل رپالپور؛ حافظ محمد عبداللہ، موضع بوہت، تحصیل پھالیہ۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ بھی تجربہ میں آیا ہے کہ زیادہ تر بزرگوں کے ہاں کسی خاص حقیقت یا لطیفہ کا فیض وافر ہوتا ہے۔ دو حضرات کے ہاں تمام لطائف اور حقائق کے انوار بہ یک وقت اور بارہا محسوس ہوئے، یہ حضرات پیر مرید ہیں یعنی حضرت خواجہ محبوب عالم اور سید حبیب اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما۔ تین بزرگوں کے ہاں بالکل مختلف معاملہ نظر آیا، وہ یہ کہ مروجہ انوار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کا اپنا نور بنا دیا ہے جو ان حضرات کے

ساتھ ہی مخصوص ہے۔ یہ حضرات ہیں سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش، حضرت خواجہ محبوب عالم اور حافظ محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہم۔

حضرت کعب بن زُبیر رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ ہیں اور متحدہ عرب امارات کی سب سے بڑی امارت ابوظہبی کے شہر العین کے پرانے قبرستان میں مدفون ہیں جو اس شاہراہ پر واقع ہے جو العین شہر سے جبلِ حفیط کو جاتی ہے۔ مشہور مزار مبارک ہے، شہر میں کہیں سے پوچھیں تو پتہ چل جاتا ہے۔ العین میں حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر انوارات کا یہ عالم تھا کہ جس جانب اور جس جہت توجہ ہوئی وہ اپنی کیت وکیفیت کے اعتبار سے اس بندہ ضعیف کے ہمت وحوصلے سے نہ صرف زیادہ تھے بلکہ بے حد وحساب اور اس کمزور روح کے لیے ناقابلِ برداشت بھی۔ روضہ رسول ﷺ کی حاضری کی کیفیات بیان سے باہر ہیں اور میرا فہم وادراک ان کے احاطہ سے قاصر ہے۔ البتہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیض ہمہ گیر، ہمہ جہت اور ہمہ اوصاف ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رعب اور شریعت پر عمل کی شدت کے مقابلے میں اپنے کوتاہ عمل اور کم ہمتی کے پیشِ نظر چند بار توجہ ہوئی مگر شرم سے سر جھکا کر اور آنکھیں کھول کر اس جہاں میں واپس آ گیا۔ حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ہی تخی، فیاض اور دل کھول کر عطا فرمانے والے ہیں۔ ان کی تفصیلات کہیں اور تحریر کروں گا۔ اتنا واضح کرنا شاید مناسب ہوگا کہ مجھے کس صاحب مزار پر کس فیض کا غلبہ نظر آیا۔ حضرت خواجہ محبوب عالم اور سید حبیب اللہ شاہ صاحب کے ہاں تمام لطائف اور حقائق بہ یک وقت اور ہمہ وقت موجود نظر آئے۔ حضرت پیر سید رحمت علی شاہ کے ہاں لطیفہ قلب کا غلبہ نظر آیا۔ اس کی confirmation بھی ہوئی۔

حضرت امین الدین مہمی علیہ الرحمہ ناتک پور پاکپتن شریف پر لطیفہ سر کے نور کا غلبہ از حد جمال کے ساتھ ہے۔ حضرت عین الدین بھگوانپور تحصیل دیپالپور پر لطیفہ اخفیٰ کا غلبہ ہے لیکن اُن کے مزاج کا جلال ورودِ انوار میں از حد سرعت اور شدت کے نتیجہ میں زائر گھبرا جاتا ہے۔

[غالباً اسی وجہ سے ان کے ہاں زائرین کی آمد نہ ہونے کے برابر ہے۔] اگر سالک گھبراہٹ پر قابو پا کے ہمت کر جائے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ حضرت طاہر بندگی علیہ الرحمہ اپنے سلسلہ کے لوگوں کی جانب زیادہ متوجہ ہوتے ہیں اور جس مقام کی سالک کو ضرورت ہو اسی سے نواز دیتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ ہمہ گیر ولایت کے حامل ہیں۔ ان کا اپنا ایک ذاتی نور ہے، جسے میں ''گنج بخشی'' فیض کہتا ہوں، ہر وقت وارد ہوتا رہتا ہے اور یہ نہایت ہی پر کشش ہے۔ مگر داتا حضور سے اپنی مرضی کا نور سالک کو اپنی ہمت سے لینا پڑتا ہے۔ گنج بخشی نور اس قدر پر کشش، پر اثر، پر از جمال اور لطیف ہے کہ اکثر سالکین کو اس میں مستغرق کر کے انھیں اپنے مقام اور اپنی ضرورت سے بھی بے خبر کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ سالکین جو اس کا ادراک رکھتے ہیں اور اس جانب توجہ دیتے ہیں، بہت کچھ حاصل کر کے نکلتے ہیں۔ آخر میں اپنی ایک عرض دہرانا چاہوں گا کہ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں ان معاملات میں سند کا درجہ نہیں رکھتا لہٰذا ہر شخص اپنی ذاتی استعداد کو استعمال کرتے ہوئے کوئی فیصلہ فرمائے۔

بقیہ: زبدۃ التحقیق کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

قول لینے سے دائرہ اہل سنت سے خارج نہیں ہوتا محل نظر ہے۔ اور اس مضمون میں یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اگر اقوال متعارضہ ہو تو ان پر عمل کرنے کے کون کون سے قواعد و ضوابط ہیں۔ مزید یہ کہ اقوال متعارضہ میں اقوال کا ہم پلہ اور محل ایک ہونا ضروری ہے جبکہ محترم شاہ صاحب کے دلائل نہ تو سنداً معتبر ہیں اور نہ ہی یہ اقوال افضلیت ابوبکر صدیق کے متعارض ہیں۔ ان شاء اللہ ان متعارض اقوال کی تحقیق اگلے مضمون میں پیش کیں جائیں گی۔ اس مضمون میں بات واضح کر دی گئی ہے کہ اگر محترم قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ اقوال متعارضہ کو بالفرض مان لیں تو پھر بھی یہ بات محل نظر ہے کہ کسی بھی قول کو ماننا صحیح ہو گا۔ کیونکہ ایک تو متعارض اقوال میں سے کسی ایک قول کو ماننے کے اصول حافظ ابن عبدالبر کی کتاب جامع البیان والعلم کے حوالے سے پیش کر دیے گئے ہیں اور حدیث ''اصحابی کالنجوم'' عند المحدثین بھی ضعیف ہے۔ محترم قبلہ شاہ صاحب کی پوری کتاب زبدۃ التحقیق انہی اقوال متعارضہ سے بھری پڑی ہے لہذا انہوں نے اس مسئلہ کو ظنی رکھا اور کسی ایک کے قول کو ماننے والے کو اہل سنت میں شمار کیا مگر جب شاہ صاحب کا اقوال متعارضہ میں سے کسی ایک قول ماننے والا موقف ہی صحیح نہیں تو پھر ان اقوال متعارضہ کو پیش کرنے کا کچھ فائدہ ہی نہیں اور اہم بات تو یہ کہ محترم قبلہ شاہ صاحب افضلیت ابوبکر صدیق کے قائل ہیں۔ محترم قبلہ شاہ صاحب نے جو اقوال متعارضہ پیش کیے ہیں ان کی حقیقت اور تجزیہ کے لئے اگلے مضمون کا مطالعہ کیجئے گا۔ تا کہ حقانیت واضح ہو سکے اور دل کو طمانیت حاصل ہو۔

ابو اسامہ ظفر القادری بکھروی

کچھ علم حدیث کے بارے میں (قسط 3)

علم حدیث سے ناواقف لوگوں اور صرف نام کے مسلمانوں کو اسلام کے خصوصاً حضور ﷺ کے دشمن جس راستے سے زیادہ گمراہ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں وہ حدیث ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج اس ترقی یافتہ دور میں ہم جہاں دنیاوی علوم کے لیے اپنے بچوں کو مہنگے اور اچھے سکولوں میں تعلیم دلواتے ہیں مشکل مضامین پڑھواتے اور سکھلاتے ہیں اس کا پچاسواں حصہ بھی علوم حدیث کا ہم اپنے بچوں کو نہیں سکھلاتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ علوم حدیث کو عام کیا جائے اور اصل علم پھیلایا جائے اس لیے کہ اندھیرے کا سب سے بڑا علاج یہ ہے کہ روشنی کر دو اندھیرا ایک لمحہ دیر لگائے بغیر بھاگ جائے گا۔

ضعیف حدیث کا بیان:

لغوی تعریف: لغت کے اعتبار سے ضعیف قوی کی ضد ہے۔ ضعف حسی بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی۔ یہاں ضعف سے مراد معنوی ضعف ہے۔

اصطلاحی تعریف: ہر وہ حدیث جس میں حدیث صحیح اور حدیث حسن کی مذکورہ صفات جمع نہ ہوں وہ حدیث ضعیف ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح صفحہ ۲۰ ، النوع الثالث معرفة الضعيفة من الحديث)

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! "کل حدیث لم تجتمع فیہ صفات القبول"۔ ہر وہ حدیث جس میں صفات قبول جمع نہ ہو (وہ حدیث ضعیف ہے)

ضعیف حدیث کی اقسام: ضعیف حدیث کی چار اقسام ہیں۔

ا۔ پہلی قسم یہ ہے کہ اس کا ضعف اتنا کم ہے کہ اعتبار کے قابل ہے۔ مثلاً یہ ضعف اختلاط راوی سوئے حفظ، تدلیس کی وجہ سے ہے۔ تو یہ حدیث ضعیف متابعات اور شواہد کے کام آتی ہے۔ تلافی ضعف کے سبب پائے جانے سے قوت پا کر حسن لغیرہ بلکہ صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ وہ ضعیف حدیث ہے جو راوی کے فسق وغیرہ کی وجہ سے متروک ہو۔ بشرطیکہ اب تک سرحد کذب میں

داخل نہ ہو۔ ایسی حدیث احکام میں لائق حجت نہیں البتہ مذہب راجح پر فضائل میں مقبول ہے۔

۳۔ وہ حدیث جس کا راوی کذاب وضاع یا جھوٹ سے متہم ہو۔ یہ حدیث ضعیف کی بدترین قسم ہے۔ بلکہ بعض محاورات کی بنا پر مطلق اور ایک اصطلاح پر اگر ان کا مدار کذاب پر ہو تو اس کو بھی موضوع کہتے ہیں۔ بنظر دقیق ان اصطلاحات پر یہ قسم موضوع حکمی میں داخل ہوگی۔

۴۔ یہ قسم بالاجماع ناقابل اعتبار ہے۔ یہاں تک کہ فضائل میں بھی اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ بلکہ اس کو حدیث بھی مجازاً کہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں یہ حدیث ہی نہیں۔

قارئین کرام کو اس بات کا خیال رہے کہ ضعیف کی پہلی دو قسموں کا حکم اور ہے اور آخری دو قسموں کا حکم اور ہے۔ یہاں پر ہی بدمذہب عوام کو دھوکہ دیتے ہیں اور ضعیف کا معنی موضوع کر دیتے ہیں۔ اور جب اپنی باری آتی ہے تو پھر اس کو یہ تمام قوانین یاد آ جاتے ہیں۔

حدیث ضعیف فضائل میں معتبر ہے: حدیث ضعیف فضائل اعمال اور مناقب کے باب میں پہلی دو قسم معتبر ہیں۔ چنانچہ علامہ نووی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''قال العلماء من المحدثین والفقہاء و غیرھم یجوز و یستحب العمل فی الفضائل والترغیب والترھیب بالحدیث الضعیف ما لم یکن موضوعا''۔ (الاذکار المنتخبۃ من کلام سید الابرار للنووی صفحہ ۱۲)

ترجمہ: ائمہ محدثین وفقہاء اور دیگر علماء کرام فرماتے ہیں کہ فضائل اعمال اور ترغیب وترھیب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا مستحب ہے جبکہ موضوع نہ ہو۔

اسی طرح علامہ ابن حجر الہیتمی علیہ الرحمہ نے فضائل کے سلسلے میں حدیث ضعیف پر عمل کے لیے دلیل دیتے ہوئے کہا! ''قد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل اعمال لانہ ان کان صحیحا فی نفس الامر فقد اعطی حقہ من العمل بہ والا لم یترتب علی العمل بہ مفسدۃ تحلیل ولا تحریم ولا ضیاع حق للغیر''۔ (الفتح المبین شرح اربعین)

ترجمہ: بے شک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کے جواز پر علماء کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ یہ حقیقت میں صحیح ہے۔ تو اس پر عمل کرنے سے اس کا حق ادا ہو۔ ورنہ اس پر عمل کرنے سے حلال اور حرام بنانے اور دوسرے کے حق کو ضائع کرنے کا خطرہ نہیں ہے۔

فتح القدیر میں ہے! ''الضعیف غیر الموضوع یعمل بہ فی فضائل اعمال''۔
(فتح القدیر ۱/۳۰۳ مطبوعہ سکھر)

ترجمہ: فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا بس اتنا چاہیے کہ وہ موضوع نہ ہو۔

اسی طرح مقدمہ امام ابو عمرو ابن الصلاح و مقدمہ جرجانیہ و شرح الفیہ للمصنف و تقریب النواوی اور اسکی شرح تدریب الراوی میں ہے! ''محدثین و غیرھم علماء کے نزدیک ضعیف سندوں میں تساھل اور بے اظہار ضعف موضوع کے سوا ہر قسم حدیث کی روایت اور اس پر عمل فضائل اعمال وغیرہا امور میں جائز ہے۔ جنھیں عقائد و احکام سے تعلق نہیں۔ امام احمد بن حنبل و امام عبدالرحمٰن بن مہدی و امام عبداللہ بن مبارک وغیرھم ائمہ سے اسکی تصریح منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں جب ہم حلال و حرام میں حدیث روایت کریں تو سختی کرتے ہیں اور جب فضائل میں روایت کریں تو نرمی کرتے ہیں۔ (تدریب الراوی ۱/۲۹۸ مطبوعہ لاہور بحوالہ فتاوی رضویہ ۵/۴۸۱ مطبوعہ لاہور)

اس طرح مقاصد حسنہ صفحہ ۴۰۵، موضوعات کبیر ملا علی قاری ص ۶۳، قوت القلوب امام ابو طالب محمد بن علی المکی ۱/۳۳۶، مقدمہ ابن الصلاح ص ۴۹، کتاب الراوی محدث زکریا بن محمد شافعی، مرقات شرح مشکوٰۃ ۲/۸۳ میں ہے۔ تفصیل کیلئے فتاوی رضویہ جلد ۵ میں رسالہ ''منیر العین فی حکم تقبیل الابہامین'' مطالعہ فرمائیں۔

حدیث ضعیف کی تقویت کی وجوہ: ۱۔ کبھی حدیث ضعیف متعدد اسناد سے مروی ہو کر حسن لغیرہ اور کبھی صحیح لغیرہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام عبدالوھاب شعرانی فرماتے ہیں!

''بے شک جمہور محدثین نے حدیث ضعیف کو کثرت طرق سے حجت مانا ہے اور اُسے کبھی صحیح اور کبھی حسن سے ملحق کیا''۔ (میزان الکبریٰ للشعرانی الفصل الثالث ۱/۶۸ مطبوعہ مصر)

اسی طرح مرقات شرح مشکوٰۃ ۳/۱۸، الاسرار المرفوعۃ فی اخبار الموضوعۃ ص ۳۴۶، فتح القدیر ۱/۲۶۶، المیزان الکبریٰ للشعرانی ۱/۶۸، الصواعق المحرقۃ ص ۱۸۴، التعقبات علی الموضوعات ص ۵۷ میں ہے۔

۲۔ کسی حدیث ضعیف پر اہل علم کا عمل اس کو حسن بنا دیتا ہے۔ یعنی علماء کاملین جس ضعیف حدیث پر عمل کرنا شروع کر دیں وہ ضعیف نہ رہے گی بلکہ حسن ہو جائے گی۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے! "یعنی امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے اور اہل علم کا اس پر عمل ہے۔ سید میرک نے امام نووی سے نقل کیا کہ اس کی سند ضعیف ہے تو گویا امام ترمذی عمل اہل علم سے حدیث کو قوت دینا چاہتے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم"۔ (مرقات شرح مشکوٰۃ ۳/۹۸ مطبوعہ ملتان)

اسی طرح تعقبات ص ۱۳ میں ہے۔

۳) مجتہد جس حدیث ضعیف سے استدلال کرے تو اس کا استدلال بھی حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ "ردّ المحتار" میں فرماتے ہیں! "ان المجتهد اذا ستدل بحديث كان تصحيحا له كما في التحرير و غيره "مجتہد جب کسی حدیث سے استدلال کرے تو اس کا استدلال بھی حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ جس طرح تحریر میں امام ابن ھمام نے فرمایا۔

۴) اسی طرح امام عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں! کبھی تجربہ اور کشف سے بھی ضعیف حدیث کو قوت مل جاتی ہے۔ جیسا کہ مرقات ۳/۲۲۲ و میزان الکبریٰ للشعرانی ۱/۳۵ میں ہے۔

ضعیف ترین سندیں: (۱)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: "صدقة الدقيقي "عن فرقد السبخي عن مرة الطيب عن ابي بكر الصديق رضي الله عنه"۔

۲)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: "عمرو بن شمر عن جابر

الجعفی عن الحارث الاعور عن علی رضی اللہ عنہ"۔

۳)۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: "السری بن اسماعیل عن داؤد بن یزید الأزدی عن ابیہ عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ"۔

۴)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: "نسخة عند البصریین الحارث بن شبل عن ام النعمان عن عائشة رضی اللہ عنہا"۔

۵)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: "شریک عن أبی فزارہ عن أبی زید عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ"۔

۶)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نسبت سے ضعیف ترین سند یہ ہے: "داؤد بن المحبر بن قحذم عن ابیہ عن أبان بن أبی عباش عن أنس رضی اللہ عنہ"۔ (تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی ص ۱۱۳،۱۱۴)

موضوع روایت:

لغوی تعریف: موضوع "وَضعٌ" سے ماخوذ ہے۔ جسکے معنی گرانے اور پھینکنے کے ہیں۔ موضوع روایت کو اس لیے موضوع کہتے ہیں کہ یہ اپنے رتبے سے گر جاتی ہے اور پستیوں میں چلی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ "النکت" میں لکھتے ہیں! "جہاں تک لغوی معنی کا تعلق ہے تو ابوالخطاب ابن دحیہ کا کہنا ہے کہ موضوع کے معنی غلط طور پر منسوب بات ہے۔ کہا جاتا ہے فلاں شخص نے دوسرے سے وضع کیا جو اس نے نہیں کہی۔ اسکے معنی پھینکنا اور گرانا بھی ہے۔ لیکن دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

اصطلاحی تعریف: حافظ ابن الصلاح موضوع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں!۔ "ھو المختلق الموضوع" وہ گھڑی ہوئی بنائی روایت ہے۔ (مقدمہ ابن اصلاح ص ۵۷)

ملا علی قاری علیہ الرحمہ شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں!" الموضوع ھو الحدیث الذی فیہ

الطعن بکذب الراوی "۔موضوع وہ حدیث ہے جس میں کذب راوی کی وجہ سے طعن ہو۔
(شرح نخبۃ الفکر لملا علی قاری ص ۳۷)

روایت کا موضوع ہونا کیونکر ثابت ہوتا ہے: امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!"غرض ایسی وجوہ سے حکم وضع کی طرف راہ چاہنا محض ہوس ہے۔ہاں موضوعیت یوں ثابت ہوتی ہے کہ اس روایت کا مضمون:

۱) قرآن عظیم (۲) یا سنت متواترہ (۳) یا اجماع قطعی قطعیات الدلالۃ

۴) یا عقل صریح (۵) یا حسن صحیح (۶) یا تاریخ یقینی کے ایسا مخالف ہو کہ احتمال تاویل وتطبیق نہ رہے۔ (۷) یا معنی شنیع وقبیح ہوں۔جن کا صدور حضور پرنور صلوات اللہ علیہ سے منقول نہ ہو۔جیسے معاذ اللہ کسی فساد یا عبث یا سفہ یا مدح باطل یا ذم حق پر مشتمل ہونا۔

۸) یا ایک جماعت جس کا عدد حد تواتر کو پہنچے اور ان میں احتمال کذب یا ایک دوسرے کی تقلید کا نہ رہے۔اس کے کذب وبطلان پر گواہی مستنداً الی الحس دے۔

۹) یا خبر کسی ایسے امر کی ہو کہ اگر واقع ہوتا تو اس کی نقل وخبر مشہور ومستفیض ہو جاتی۔مگر اس روایت کے سوا اس کا کہیں پتا نہیں۔

۱۰) یا کسی حقیر فعل کی مدحت اور اس پر وعدہ وبشارت یا صغیر امر کی مذمت اور اس پر وعید وتہدید میں ایسے لمبے چوڑے مبالغے ہوں جنہیں کلام معجز نظام نبوت سے مشابہت نہ رہے۔یہ دس صورتیں تو صریح ظہور ووضوح کی ہیں۔

۱۱) یا یوں ظہور وضوع کیا جاتا ہے کہ لفظ رکیک وسخیف ہوں۔جنہیں سمع دفع اور طبع منع کرے اور ناقل مدعی ہو۔کہ بعینہا الفاظ کریمہ حضور افصح العرب ﷺ ہیں۔یا وہ محل ہی نقل بالمعنی کا نہ ہو۔

۱۲) یا ناقل رافضی حضرات اہل بیت کرام سیدھم وعلیہم السلام کے فضائل میں وہ باتیں روایت کرے جو اس کے غیر سے ثابت نہ ہو۔جیسے حدیث"لحمک لحمی و دمک دمی "(تیرا گوشت میرا گوشت تیرا خون میرا خون)

اقول۔ انصافاً یوں ہی وہ مناقب امیر معاویہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما۔ کہ صرف نواصب کی روایت سے آئیں کہ جس طرح روافض نے فضائل امیر المومنین و اہل بیت طاہرین رضی اللہ تعالیٰ عنھم میں قریب تین لاکھ حدیثوں کے وضع کیں۔

''کما نص علیه الحافظ ابو یعلیٰ والحافظ الخلیلی فی الارشاد'' جیسا اس پر حافظ ابویعلیٰ اور حافظ خلیلی نے ارشاد میں تصریح کی ہے۔ یونہی نواصب نے مناقب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں حدیثیں گھڑیں'' کما ارشد الیه الامام الذاب عن السنة احمد بن حنبل رحمه الله تعالیٰ '' جیسا کہ اس کی طرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی۔ جو سنت کا دفاع کرنے والے ہیں۔

۱۳) یا قرائن حالیہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہ روایت اس شخص نے کسی طمع سے یا غضب وغیرہما کے باعث ابھی گھڑ کر پیش کر دی۔ جیسے حدیث سبق میں زیادت جناح اور حدیث ذم معلمین اطفال۔

۱۴) یا تمام کتب وتصانیف اسلامیہ میں استقرائے تام کیا جائے۔ اور اس کا کہیں پتہ نہ چلے۔ یہ صرف اجلہ حفاظ ائمہ شان کا کام تھا جس کی لیاقت صدہا سال سے معدوم ہے۔

۱۵) یا راوی خود اقرار وضع کر دے۔ خواہ صراحۃً خواہ ایسی بات کہے جو بمنزلہ اقرار ہو۔ مثلاً ایک شیخ سے بلا واسطہ بدعویٰ سماع روایت پھر اس کی تاریخ وفات وہ بتائے کہ اس کا اس سے سننا معقول نہ ہو۔ یہ پندرہ باتیں ہیں کہ شاید اس جمع وتلخیص کے ساتھ ان سطور کے سوا نہ ملیں۔'' ولو بسطنا المقال علی کل صورة لطال الکلام و تقاضی المرام و لسنا هنالك بصدد ذلك۔ اگر ہم ہر ایک صورت پر تفصیلی گفتگو کریں تو کلام طویل ہو جائے گا اور مقصد دور ہو جائے گا۔ لہذا ہم یہاں اسکے درپے نہیں ہوتے''۔ (فتاوی رضویہ ج۵، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲ مطبوعہ لاہور)

نقشہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

حدیث کے دو حصے ہیں
متن حدیث کے ۷ علوم
سند حدیث کے ۱۲ علوم
متن (درایت حدیث)
سند (روایت حدیث)
(۱) غریب الحدیث
(۲) فقہ الحدیث
(۳) مختلف الحدیث
(۴) مشکل الحدیث
(۵) ناسخ الحدیث و منسوخہ
(۶) اسباب ورود الحدیث
(۷) مصحف و محرف
۱۔ معنعن
۲۔ مؤنن
۳۔ مسلسل
علو نسبی کی دو قسمیں ہیں (۴) سند عالی و نازل
علو مطلق
(۵) روایت الاکابر علی الاصاغر
(۶) روایت الاباء عن الابناء
(۷) روایت الابناء عن الاباء
(۸) روایت الاقران والمدبج
(۹) سابق ولاحق
(۱۰) علم جرح وتعدیل
(۱۱) علل حدیث
(۱۲) اسماء الرجال

تحقیق وتحریر: فیصل خان☆

منحۃ الحی فی کشف ظلمات زبیر علی زئی (قسط نمبر 2)

امام شافعی اور مسئلہ تدلیس کی تحقیق:

ترک رفع یدین پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے غیر مقلد زبیر علی زئی نے ہر ممکن کوشش کی مگر پھر بھی ناکام ہوئے۔ آخر کار عبدالرحمن معلمی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفیان ثوری کی تدلیس ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اپنی ہی جماعت کے خلاف طبقات المدلسین کا انکار کر بیٹھے اور ہر مدلس راوی کی عن والی روایت کو ضعیف کہنا شروع کر دیا۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے زبیر علی زئی غیر مقلد نے امام شافعی رحمہ اللہ کا سہارا لیا۔ زبیر علی زئی غیر مقلد نے اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۱۰۹ تا ۱۳۹'' پر ''امام شافعی اور مسئلہ تدلیس'' کے نام سے ایک مضمون لکھا۔ فرماتے ہیں!

''امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوگیا کہ اس نے تدلیس کی ہے تو اس نے اپنی پوشیدہ بات ہمارے سامنے ظاہر کردی (الرسالۃ فقرہ: ۱۰۳۳)

موصوف مزید ارشاد فرماتے ہیں!

''اس کے بعد امام شافعی نے فرمایا: پس ہم نے کہا: ہم کسی مدلس سے کوئی حدیث قبول نہیں کرتے حتی کہ وہ حدثنی یا سمعت کہے (الرسالۃ فقرہ: ۱۰۳۵)۔

اپنی تصنیف ''انوار الطریق ص ۱۱۱'' پر لکھتے ہیں!

''امام شافعی کے بیان کردہ اس اصول سے معلوم ہوا کہ جس راوی سے ساری زندگی میں ایک دفعہ تدلیس کرنا ثابت ہوجائے تو اس کی عن والی روایت قابل قبول نہیں ہوتی''۔

موصوف نے اس مضمون میں کل ۵۰ حوالہ جات پیش کئے ہیں۔ ان حوالہ جات کا مختصر سا حال کچھ

☆) 0321-5501977

یوں ہے۔

(i)۔ زبیر علی زئی غیر مقلد کے پیش کردہ حوالہ جات میں ۳۰ حوالہ جات محدثین کرام کے ہیں۔

(ii)۔ پیش کردہ محدثین کرام کے ان ۳۰ حوالہ جات میں ۲۰ حوالے ایسے محدثین کرام کے ہیں جنہوں نے صرف امام شافعی رحمہ اللہ کی ''کتاب الرسالہ'' والا قول ہی نقل کر کے سکوت اختیار کیا ہے۔ جس سے آپ ان حوالوں کی فنی حیثیت سے آگاہ ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ امام شافعی کے حوالہ پر محدثین کرام کا سکوت ہے اور یہ ۲۰ محدثین کرام صرف ناقل ہی ہیں اور کسی بات پر سکوت کو رضا مندی سمجھنا تو خود زبیر علی زئی کو قبول نہیں ہے۔ اگر قبول ہے تو پھر زبیر علی زئی سے عرض ہے کہ جن محدثین کرام نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر سکوت کیا تو اس کو بھی رضا مندی اور تصحیح کی دلیل سمجھیں۔ حالانکہ وہاں زبیر علی زئی نے سکوت کو تصحیح سمجھنے پر اعتراض کیا ہے یہ تو خود ان کا تضاد ہے۔ قارئین کرام حوالہ جات نقل کرنا ہی بات نہیں ہے۔ بلکہ ان کی بات اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگی جب تک کہ وہ طبقات کا انکار ثابت نہ کریں۔ مطلقاً ایسے حوالے نقل کرنا جس میں صرف امام شافعی کا اصول اور اس کی تائید ہو کیونکہ امام شافعی کے اصول میں حافظ ابن حجر اور دیگر محدثین نے تخصیصات ثابت کیں ہیں۔ لہٰذا جب تک وہ طبقات کا انکار ثابت نہیں کریں ایسے حوالہ جات فضول ہیں۔ حافظ ابن حجر نے خود النکت ص ۲۵۴ پر امام شافعی کا قول نقل کر کے طبقاتی تقسیم کی ہے۔

(iii)۔ زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء اہل سنت کے ہیں۔ جن کی حقیقت بھی آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(iv)۔ زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء دیوبند کے ہیں۔ جن کا جواب تو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔ مگر پھر بھی زئی صاحب نے عددی گنتی کی برتری ثابت کرنے کے لئے ان حوالوں کو درج کیا ہے۔ جو سراسر ہٹ دھرمی اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔

امام شافعی کے قول کی تحقیق:

یوں ہے۔

(i)۔زبیر علی زئی غیر مقلد کے پیش کردہ حوالہ جات میں ۳۰ حوالہ جات محدثین کرام کے ہیں۔

(ii)۔پیش کردہ محدثین کرام کے ان ۳۰ حوالہ جات میں ۲۰ حوالے ایسے محدثین کرام کے ہیں جنہوں نے صرف امام شافعی رحمہ اللہ کی ''کتاب الرسالہ'' والا قول ہی نقل کر کے سکوت اختیار کیا ہے۔جس سے آپ ان حوالوں کی فنی حیثیت سے آگاہ ہو گئے ہوں گے۔کیونکہ امام شافعی کے حوالہ پر محدثین کرام کا سکوت ہے اور یہ ۲۰ محدثین کرام صرف ناقل ہی ہیں اور کسی بات پر سکوت کو رضا مندی سمجھنا تو خود زبیر علی زئی کو قبول نہیں ہے۔اگر قبول ہے تو پھر زبیر علی زئی سے عرض ہے کہ جن محدثین کرام نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر سکوت کیا تو اس کو بھی رضا مندی اور تصحیح کی دلیل سمجھیں۔حالانکہ وہاں زبیر علی زئی نے سکوت کو تصحیح سمجھنے پر اعتراض کیا ہے یہ تو خود ان کا تضاد ہے۔قارئین کرام حوالہ جات نقل کرنا ہی بات نہیں ہے۔بلکہ ان کی بات اس وقت تک قابل قبول نہ ہو گی جب تک کردہ طبقات کا انکار ثابت نہ کریں۔مطلقاً ایسے حوالے نقل کرنا جس میں صرف امام شافعی کا اصول اور اس کی تائید ہو کیونکہ امام شافعی کے اصول میں حافظ ابن حجر اور دیگر محدثین نے تخصیصات ثابت کیں ہیں۔لہذا جب تک وہ طبقات کا انکار ثابت نہیں کریں ایسے حوالہ جات فضول ہیں۔حافظ ابن حجر نے خود النکت ص ۲۵۴ پر امام شافعی کا قول نقل کر کے طبقاتی تفہیم کی ہے۔

(iii)۔زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء اہل سنت کے ہیں۔جن کی حقیقت بھی آگے ملاحظہ فرمائیں۔

(iv)۔زبیر علی زئی کے حوالوں میں ۵ حوالے علماء دیوبند کے ہیں۔جن کا جواب تو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔مگر پھر بھی زئی صاحب نے عددی گنتی کی برتری ثابت کرنے کے لئے ان حوالوں کو درج کیا ہے۔جو سراسر ہٹ دھرمی اور جھوٹ کا پلندہ ہے۔

امام شافعی کے قول کی تحقیق:

اَب ہم نفس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ پہلے تو یہ عرض کروں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ''کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵'' والے اصول کو مطلق اور کلیتاً اصول ماننا ہی غلط ہے۔ کیونکہ زبیر علی زئی خود اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۱۱۰'' پر اس اصول میں تخصیصات اور استثناء کے قائل ہیں۔ لہذا امام شافعی کے اصول کو ہمارے خلاف قاعدہ کلیہ بنا کر پیش کرنا اور عوام الناس کو مغالطہ دینا مردود اور باطل ہے۔ یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ امام شافعی کا اصول کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں تخصیص اور استثناء ہوسکتی ہے۔ ان تخصیص اور استثناء میں مندرجہ ذیل دیگر نکات بھی شامل ہیں:

(i)۔ مدلسین کے طبقات (ii)۔ تدلیس کی کمی و زیادتی

(iii)۔ ثقات سے تدلیس (iv)۔ طویل رفاقت

(v)۔ مخصوص اساتذہ وغیرہم

لہذا ان مندرجہ بالا تخصیصات کو امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے خلاف کہنا غلط اور جناب کے اپنے اصول کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی عرض کروں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا اپنا منہج بھی اس اصول سے ذرا ہٹ کر اور الگ ہے۔ کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی ''کتاب الرسالہ فقرہ ۱۰۳۵'' پر یہ صاف لکھا ہے کہ ہم مدلس کی صرف وہ روایات لیں گے جس میں **حدثنی یا سمعت** کا لفظ موجود ہو۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ نے متعدد مدلسین سے عن والی روایت نقل کیں ہیں۔ لہذا مندرجہ ذیل مدلس راویوں سے امام شافعی نے اپنی کتاب الرسالہ میں روایت کی ہیں۔

(i) محمد بن مسلم الزھری رحمہ اللہ (طبقہ ثالثہ کے مدلس): فقرہ ۵۱۴، ۵۳۳، ۵۶۱، ۹۵۹، ۶۶۰، ۶۹۱، ۶۹۶، ۷۳۸، ۷۵۴، ۷۷۵، ۸۱۱، ۸۸۶، ۹۰۹، ۱۱۲۶، ۱۱۷۴، ۱۱۸۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۵، ۱۳۷۳، ۱۵۷۴، ۱۷۴۱، ۱۷۱۱، ۱۷۱۱، ۴۷۴، ۴۷۳، ۸۳۴، ۸۴۰، ۸۳۳، ۸۶۳

(ii) محمد بن عجلان رحمہ اللہ: (طبقہ ثالثہ کے مدلس) الرسالہ فقرہ نمبر ۳۷۷، ۱۰۹۰

(iii) ابن جریج رضی اللہ عنہ: (طبقہ ثالثہ کے مدلس) الرسالہ فقرہ نمبر ۳۹۸، ۸۹۰، ۹۰۳

(iv) ابو الزبیر رضی اللہ عنہ: (طبقہ ثالثہ کے مدلس) الرسالہ فقرہ نمبر۔ ۳۹۸، ۸۹۰، ۸۸۹

(v) سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ: (طبقہ ثالثہ عند الفریقین مخالف) ۲۹۵، ۳۷۳، ۴۰۲، ۴۰، ۴۳۶، ۴۷۴، ۴۷۷، ۵۳۳، ۵۶۱، ۶۵۹، ۷۷۴، ۷۷۵، ۸۸۹، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۹، ۹۱۶، ۱۰۹۴، ۱۱۰۴، ۱۱۲۴، ۱۱۳۴، ۱۱۶۰، ۳۳، ۳۷، ۱۷۱، ۱۷۴، ۱۱۸۳، ۱۲۲۵، ۱۲۹۰، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۷۳، ۱۵۱۴، ۱۷۱۱، ۸۱۱، ۸۲۳، ۸۲۵، ۸۴۰، ۸۶۴، ۱۱۷۲، ۱۱۷۴

اس کے علاوہ کتاب الام ا مسند شافعی سے ہزاروں ایسے مقامات ہیں جہاں مدلسین کی عن والی راویت موجود ہیں۔

اعتـــــراض: غیر مقلد زبیر علیزئی نے امام شافعی رحمہ اللہ کے اس مندرجہ بالا منہج کو غلط ثابت کرنے کے لئے دو وجوہات بیان کیں ہیں۔ زبیر علیزئی غیر مقلد انوار الطریق ص ۱۲۷ و ص ۱۲۸ پر لکھتا ہے۔

1: "امام شافعی کا اسنادہ صحیح وغیرہ کہنے کے بغیر مجرد روایت بیان کرنا حجت پکڑنا نہیں ہے۔

2: یہ ضروری نہیں ہے کہ مدلس کے سماع کی تصریح خود امام شافعی سے صراحتاً ثابت ہو بلکہ دوسری کتاب میں اس کی صراحت کافی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے مدلسین کی مرویات کے بارے میں علماء کرام کا عمل جاری وساری ہے۔

جواب: زبیر علی زئی کے یہ جوابات اصول کی روشنی میں کئی وجہ سے مردود اور باطل ہیں۔

اول: زبیر علی زئی غیر مقلد کا یہ جواب تحقیق نہیں بلکہ مناظرانہ و منطقیانہ ہے لہذا مردود اور باطل ہے۔

دوم: زبیر علی زئی صاحب ذرا امام شافعی رحمہ اللہ کے ایسے حوالوں کی نشاندہی ان کی کتاب الرسالہ سے تو کریں۔ جہاں انہوں نے عن والی روایات کے بارے میں اسنادہ ضعیف لکھا ہو۔

سوم: زبیر علی زئی غیر مقلد کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں اسنادہ صحیح کہنا کا اسلوب ہی نہیں ہے۔

چہارم: امام شافعی رحمہ اللہ اگر اپنی کتاب الرسالہ میں عن والی روایت پر سکوت اختیار کریں تو غیر مقلد زبیر علی زئی کو اعتراض ہوتا ہے مگر زبیر علی زئی غیر مقلد نے محدثین کرام کے ۲۰ سکوتی حوالے امام شافعی کی کتاب الرسالہ فقرہ :۱۰۳۵ تائید میں جو دیے ہیں۔ اس پر رضامندی کیوں؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ زبیر علی زئی غیر مقلد عوام الناس کو مغالطہ دے رہے ہیں۔

پنجم: زبیر علی زئی کا امام شافعی کی کتاب الرسالہ کو صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی طرح سمجھنا غلط ہے۔ اور یہ لکھنا کہ ''ضروری نہیں ہے کہ مدلس کی سماع کی تصریح خود امام شافعی سے صراحتاً ثابت ہو بلکہ دوسری کتاب میں اس کی صراحت کافی ہے جیسا کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم کے مدلسین کی مرویات کے بارے میں علماء کرام کا عمل جاری وساری ہے۔ حافظ زبیر صاحب کی یہ بات بالکل باطل و مردود ہے کیونکہ اول تو کتاب الرسالۃ کو صحیحین پر قیاس کرنا مردود ہے۔ دوسرا یہ کہ جس طرح صحیح بخاری وصحیح مسلم کے بارے میں محدثین کرام کے اقوال موجود ہیں اس طرح کے اقوال امام شافعی کی کتاب الرسالۃ کے بارے میں ثابت کرنا غیر مقلد زبیر علی زئی کے ذمہ ہے۔ لہٰذا ایسے حوالوں کی نشاندہی غیر مقلد زبیر علی زئی نے ہی کرنی ہے۔ اگر سچے ہیں تو کسی ایک محدث سے ثابت کریں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الرسالۃ کی عن والی روایات محمول علی السماع ہیں۔ مزید یہ کہ یہ بات خود امام شافعی رحمہ اللہ کے اپنے اصول کے مخالف ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ مدلس راوی کی غیر مصرح بالسماع (عن والی روایت) لکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لہٰذا زبیر علی زئی کا اعتراض واستدلال باطل اور مردود ہے۔

قارئین کرام مسئلہ صرف یہ ہے کہ کیا امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الرسالہ فقرہ ۱۰۳۵ والے قول پر خود عمل کیا ہے یا کہ نہیں؟ مگر یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ کا اپنا عمل اس قول پر نہ تھا۔

اعتراض: حافظ زبیر صاحب مناظرانہ طریق پر اپنی کتاب ''انوار الطریق ص ۵۷'' پر تحریر فرماتے ہیں!

"دوسرے یہ کہ امام شافعی نے کتاب الام میں محمد بن اسحاق بن یسار، ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ الاسلمی اور ولید بن مسلم وغیرھم کی معنعن روایات بھی بیان کی ہیں تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی مقبول التدلیس یا طبقہ ثانیہ میں سے تھے۔

جواب: عرض یہ ہے کہ زبیر علی زئی غیر مقلد کو یہ معلوم ہی نہیں کہ نفس موضوع کیا ہے، بات کیا چل رہی ہے اور وہ جواب کیا دے رہے ہیں؟ غیر مقلد زبیر علی زئی کے مندرجہ بالا تحریر سے تو یہ واضح ہو گیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے خود مدلسین سے عن والی روایت لی ہیں جو امام شافعی کے اپنے اسلوب سے خلاف ہے۔

دراصل میں نے تو یہ گذارش عرض کی تھی کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵ کا جو قول آپ بار بار پیش کر رہے ہیں، اس قول پر ظاہراً امام شافعی کا اپنا عمل جاری وساری نہیں ہے۔ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کو ہمارے خلاف قاعدہ اور کلیہ بنا کر پیش کرنا غلط ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ متعدد مقامات پر غیر مقلد زبیر علی زئی اس قول میں تخصیص کے قائل ہیں۔ اور یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے کسی مقام پر محمد بن اسحاق ولید بن مسلم کو طبقہ ثانیہ یا مقبول التدلیس نہیں کہا میں نے تو امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج پیش کیا ہے کہ وہ بھی مدلس راوی کی عن والی روایت سے احتجاج کرتے ہیں۔ لہٰذا ان مناظرانہ جوابات سے نہ تو آپ کا مدعا حل ہوتا ہے اور نہ ہی جان خلاصی ہو سکتی ہے۔ یہ مناظرانہ جواب معصوم اور بھولے بھالے غیر مقلدین کو تو بھلے لگ سکتے ہیں۔ مگر دراصل ان جوابات کی نہ تو کوئی اصل ہے اور نہ ہی حقیقت اور مزید یہ کہ ان کے یہ مناظرانہ جواب بھی غلط اور مردود ہیں۔

اعتراض: جب زئی صاحب کو امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج اور اسلوب سمجھایا گیا اور اس کا جواب دینے سے عاجز آگئے تو موصوف نے بدتمیزی اور جارحانہ انداز میں کچھ یوں لکھا!

"کہ تم کون ہوتے ہو امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال میں تضاد ثابت کرنے والے؟ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا! کچھ تو شرم کریں۔ (انوار الطریق ص 75)

جواب: غیر مقلد زبیر علی زئی ذرا اپنی روش پر بھی دھیان دیں۔ اپنی جسارت کے بارے میں سوچیں، تم نے تو ائمہ اہل سنت پر الزامات اور بدتمیزی کا جو بازار گرم کیا ہے وہ بات تو قابل مذمت اور قابل شرم بات ہے۔ تم نے علماء اہل سنت کے بارے میں جو افتراء اور بہتان کی بارش کی ہے اس کی مثال تو کہیں نہیں ملتی۔ مگر جب جناب کو اپنے اصول کے مطابق بات سمجھائی تو جناب کو تو غصہ آگیا۔ ہماری ہمت کو داد دیں کہ آپ کے اس طوفان بدتمیزی کا بڑے ہی ادب سے جواب دے رہے ہیں۔

حضور جواب سے عاجز ہیں تو میدان چھوڑ کر بھاگنے میں عافیت جانیں خوانخواہ ہر روز کے نئے اصول وضوابط وضع کرنے سے جان آسانی سے چھوٹ جائے گی اور علمی قابلیت کا بھرم بھی سر عام پھوٹنے سے بچ جائے گا۔

ذرا "انوار الطریق ص ۲۲" کو دوبارہ پڑھ کر دیکھ لیں کہ آپ نے حافظ ابن حجر کے بارے میں کیا لکھا ہے!

"یہ طبقاتی تقسیم خود حافظ ابن حجر کے اصول .... سے معارض ہونے کی وجہ سے بھی ناقابل قبول اور غلط ہے"۔

جناب آپ کون ہوتے ہیں حافظ ابن حجر کے اقوال میں تعارض ثابت کرنے والے؟ جب آپ کی اپنی مرضی کی بات ہو تو اقوال میں تعارض ثابت کرتے ہیں اور جب اپنی مرضی کے خلاف ہو تو پھر طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیتے ہیں۔ جناب آپ کو تو عادت ہے الزامی جواب دینے کی، مگر تحقیقی میدان میں ایسے حربے فضول ہیں۔

قارئین کرام! غیر مقلد (اہل حدیث) زبیر علی زئی صاحب کی اس بدتمیزی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان کے پاس میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ زبیر صاحب کی اس بدتمیز زبان کے بدلے ہم خوش اسلوبی سے بات کرنے کے قائل ہیں۔ لہذا عرض ہے کہ امام شافعی کے منہج سے بات جو سامنے آئی وہ عرض کر دی گئی ہے۔ اگر زبیر علی زئی صاحب عوام الناس کو

مغالطہ نہ دیتے تو ہم کبھی بھی یہ منہج سامنے نہ لاتے، دیگر یہ کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ منہج میں نے نہیں بلکہ آپ کے سلفی مذہب اور غیر مقلدین علماء کرام نے مجھ سے بھی پہلے پیش کیا ہے۔ ان علماء کرام میں مندرجہ ذیل لوگ شامل ہیں:

(1) شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن سعید (منہج المتقدمین فی التدلیس، ص ۲۳)

(2) ناصر بن حمد الفہد (منہج المتقدمین فی التدلیس، ص ۱۶۳)

(3) شیخ محمد طلعت (معجم المدلسین، ص ۲۹)

(4) ابو عبیدہ مشہور بن حسن (شاگرد البانی) (جزء علم الحدیث)

(5) محمد خبیب احمد غیر مقلد (رسالہ محدث نومبر ۲۰۱۰ء)

(6) صالح بن سعید الجزائری (التدلیس واحکامہ، ص ۱۲۹)

لہٰذا صرف راقم پر اعتراض کرنا ناانصافی ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے منہج سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مدلسین کی عن والی روایت لیتے تھے جو کہ ان کی اپنی "کتاب الرسالہ اور کتاب الام" سے ثابت ہے۔ اور یہ بھی عرض کردوں کہ کیا بذات خود زبیر صاحب نے متعدد مقامات پر جلیل القدر محدثین کرام مثلاً ابن حبان، حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے اقوال میں تضاد ثابت نہیں کیا ؟ اگر خود تضاد ثابت کریں تو عین اصول کے مطابق اور اگر ہم نشاندہی کریں تو آپ اسے بے ادبی سے تعبیر کریں۔ مشہور شعر ہے کہ

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا　　　　یا سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

جناب بات اصول کی روشنی میں ہی اچھی لگتی ہے۔ مجھ میں تو ائمہ کرام اور محدثین کرام کا ادب بھی ہے اور شرم بھی ہے۔ اور ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی شخص بشمول غیر مقلدین حضرات کی دل آزاری نہ ہو۔ یہ ایک علمی موضوع ہے لہٰذا اس موضوع پر علمی اور عالمانہ روش ہی بہتر ہے مجھے مطالعہ کے بعد جو چیز واضح ہوئی اسے عرض کر دیا ہے۔ ماننا یا نہ ماننا یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ مگر یہ عرض کردوں کہ جمہور علماء غیر مقلدین حضرات آپ کے موقف سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے

اپنے اساتذہ جن میں بدیع الدین شاہ راشدی اور محب اللہ شاہ راشدی صاحب بھی شامل ہیں
جن سے آپ کی حدیث کی سند چلتی ہے آپ کی بات کے مخالف ہیں۔ بلکہ آپ کے استاد محب اللہ
شاہ راشدی نے اپنے مضمون جو رسالہ ''الاعتصام'' میں چھپ چکا ہے آپ کو رجوع کرنے کا کہا
تھا۔ مگر رجوع کیے بغیر ہی آپ اپنے خودساختہ و مذمومہ اصول پر بضد ہیں۔

زبیر صاحب ''رسالہ الحدیث شمارہ نمبر ۶۷''، ''الفتح المبین ص ۴۲'' اور اپنی کتاب ''انوار الطریق
ص ۵۷ و ص ۲۰۵'' پر سفیان بن عیینہ کی عن والی روایات کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

''بطور فائدہ عرض ہے کہ سفیان بن عیینہ سے امام شافعی کی تمام روایات سماع پر محمول ہیں'' (
النکت الزرکشی ص ۱۸۹)

عرض یہ ہے کہ غیر مقلد زبیر علی زئی کو اپنے مذمومہ غلط اصول ثابت کرنے کے لئے یہ
حق تو حاصل ہو کہ وہ علامہ الزرکشی رحمہ اللہ کے حوالے سے امام شافعی کی سفیان بن عیینہ (مدلس)
سے عن والی روایات کو محمول علی السماع ثابت کرسکیں مگر ہمیں یہ حق حاصل نہ ہو کہ ہم حافظ ابن حجر
اور حافظ علائی ا دیگر محدثین کرام کے منہج سے سفیان ثوری کی عن والی روایت کو صحیح مانیں۔
قارئین کرام کیا یہ علمی زیادتی نہیں کہ جب اپنا توقف ثابت کرنا ہو تو پھر کوئی سا بھی قول قابل
قبول اور اگر نہ ماننا ہو تو پھر دلائل کے انبار کا بھی رد کردیا جائے۔ مزید عرض کروں کہ حافظ ابن حجر
رحمہ اللہ کے طبقات المدلسین امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے خلاف نہیں بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ
کے قول میں تخصیص اور استثناء ہے۔ لہذا حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے طبقات کو جمہور کے خلاف کہنا
باطل اور مردود ہے۔ زبیر علی زئی غیر مقلد حافظ الزرکشی کے حوالے سے سفیان بن عیینہ کی روایات
کو محمول علی السماع کہہ کر تخصیص کا نام دیں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے طبقات کو جمہور کے خلاف
کہہ کر رد کردیں۔ کیا اسی کا نام تحقیق ہے؟ اگر یہ تحقیق ہے تو پھر آپ ہی کو مبارک ہو۔ یہاں یہ نکتہ
عرض کروں کہ آخر وہ کونسا ایسا اصول ہے جس کی وجہ سے حافظ الزرکشی نے النکت ص ۱۸۹ پر امام
شافعی رحمہ اللہ کی روایات کو سفیان بن عیینہ سے محمول علی السماع قرار دیا ہے۔ اس کا جواب دینا تو

زبیر علی زئی صاحب ہی کے ذمہ ہے تاکہ معاملہ واضح ہو سکے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ زبیر علی زئی صاحب نے اپنی تصنیف ''انوار الطریق ص ۵۷'' پر حافظ الزرکشی کے بارے میں لکھا ہے!''اول الذکر بات زرکشی ۷۹۴ھ نامی ایک عالم نے فرمائی ہے۔''

زبیر علی زئی صاحب نے اپنی تحریر میں محدث حافظ الزرکشی کو صرف زرکشی نامی ایک عالم لکھ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اگر حافظ الزرکشی معتبر محدث نہیں ہیں تو حافظ الزرکشی کا حوالہ بھی معتبر نہیں ہے۔ اور اگر یہ حوالہ معتبر نہیں تو پھر کتاب الرسالہ اور کتاب الام کی ان سینکڑوں روایات جو سفیان بن عیینہ سے عن سے مروی ہیں پر کیا حکم لگائیں گے؟ مزید یہ کہ کتاب الرسالہ اور کتاب الام کی عن والی روایات کے بارے میں یہ لکھنا کہ ''ان کی صراحت دوسری کتابوں میں ثابت ہیں'' بالکل غلط ہے۔ کیونکہ نفس موضوع امام شافعی کا تدلیس کے بارے میں اپنا منہج اور اسلوب ہے نہ کہ حدیث کی تصحیح اور تضعیف کرنا۔ یاد رہے کہ تدلیس کا منہج ہونا الگ بات ہے اور حدیث کی تصحیح یا تضعیف کرنا الگ ہے۔ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کی تدلیس کے منہج کو حدیث کی تصحیح کے ساتھ گڈمڈ کرنا مردود اور باطل ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ ''کتاب الرسالہ فقرہ: ۱۰۳۵'' کے قول کے مطابق امام شافعی مدلس کی عن والی روایت کو قبول نہیں کرتے مگر اس قول کے برخلاف امام شافعی رحمہ اللہ نے بہت سے مدلسین کو عن والی روایات کو اپنی کتاب الرسالہ میں روایت کیا ہے۔

امام شافعی کا اسلوب اور منہج ان کے اپنے قول کے مطابق مختلف ہے۔ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول اور دیگر محدثین کرام کے سکوتی حوالے پیش کر کے عوام الناس کو مغالطہ دینا باطل ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام کے سامنے امام شافعی رحمہ اللہ کا منہج اور اسلوب واضح ہو گیا ہے اور ان حوالوں کی حقیقت بھی واضح ہو گئی جن میں امام شافعی کے قول پر خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ جب اصل قول ہی کا قاعدہ کلیہ نہیں تو فروع کی کیا حیثیت؟ لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول سے عوام الناس کو مغالطہ دینا پرلے درجے کی ناانصافی ہے۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆

تحریر: ابو اُسامہ ظفر القادری بکھروی

اعلیٰ حضرت محدث بریلوی علیہ الرحمہ پر ایک اعتراض کا جواب

اعتراض: مولانا احمد رضا خان بریلوی نے "ملفوظات اعلیٰ حضرت حصہ دوم صفحہ نمبر ۲۷" میں عبد الرحمٰن قاری (صحابیِ رسول) پر فتویٰ کفر لگایا ہے۔

جواب: قارئین محترم! گزارش یہ ہے کہ عبد الرحمٰن قاری نام کا حضور نبی کریم ﷺ کا کوئی بھی صحابی نہیں ہے۔ کیونکہ اسماء الرجال اور خاص کر صحابہ کرام علیہم الرضوان پر جتنی بھی کتب لکھی گئی ہیں اس نام کے کسی صحابی کا ذکر موجود نہیں۔ اور اگر معترضین اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو کتب معتبرہ میں سے اس نام کے صحابی کے حالات زندگی اور اس کا سن پیدائش و وفات پیش کریں۔

مخالفین کی چال بازی: مخالفین عوام کو دھوکہ دینے کے لیے ایک نام پیش کرتے ہیں جس کا نام "عبد الرحمٰن بن عبد القاری" ہے۔ کیا عبد الرحمٰن قاری اور عبد الرحمٰن بن عبد القاری میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ دعویٰ کیا اور دلیل کیا؟۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا الشاہ احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے ملفوظات میں جس عبد الرحمٰن قاری کا تذکرہ ہے وہ کوئی اور شخص ہے اور عبد الرحمٰن بن عبد القاری کوئی اور ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس عبد الرحمٰن کا ذکر ملفوظات اعلیٰ حضرت میں موجود ہے وہ عبد الرحمٰن فزاری ہے اور رسول اللہ ﷺ کے مویشیوں پر ڈاکہ ڈالنے والا ہے۔ یہ واقعہ امام بخاری (صحیح بخاری باب غزوہ ذی القرد ۲/۶۰۳ و مترجم بخاری ۲/۱۵۲ طبع لاہور) کے مطابق غزوہ خیبر سے صرف تین روز پہلے پیش آیا۔ اسی طرح یہ بات صحیح مسلم باب غزوہ ذی القرد ۲/۱۱۳ و فتح الباری شرح بخاری ۷/۴۶۰ و شرح صحیح مسلم للسعیدی ۵/۵۹۷ میں بھی موجود ہے۔ اسی غزوہ میں عبد الرحمٰن فزاری صحابہ کرام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اور یہ غزوہ ۷ ہجری کا ہے۔ اس غزوہ کے ہیرو حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے جو روایات مروی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

"حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی سواری کے اونٹ اپنے غلام رباح کے ہمراہ چرنے کے لیے بھیجے تھے اور میں (سلمہ بن اکوع) بھی ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) کے گھوڑے سمیت ان کے ساتھ تھا کہ اچانک صبح عبدالرحمٰن فزاری (جس کا ذکر ملفوظات اعلیٰ حضرت میں کیا گیا ہے) نے اونٹوں پر چھاپہ مارا اور ان سب کو ہانک کر لے گیا اور چرواہے کو قتل کر دیا۔ میں نے کہا! رباح یہ گھوڑا لو اور اسے ابوطلحہ تک پہنچا دو اور رسول اللہ ﷺ تک خبر دو۔ اور خود میں نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مدینہ کی طرف رخ کیا اور یا صباحاہ!! تین مرتبہ پکارا پھر میں حملہ آوروں کے پیچھے چل نکلا اور ان پر تیر برساتا جاتا اور یہ رجز پڑھتا جاتا:

انا ابن الاکوع　　　　اليوم يوم الرضع

ترجمہ: میں اکوع کا بیٹا ہوں۔ اور آج کا دن دودھ پینے والے کا دن ہے۔

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بخدا میں انھیں مسلسل تیروں سے چھلنی کرتا رہا۔ جب کوئی سوار پلٹ کر میری طرف آتا تو میں کسی درخت کی اوٹ میں بیٹھ جاتا۔ پھر اسے تیر مار کر زخمی کر دیتا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ پہاڑ کے تنگ راستے میں داخل ہوئے تو میں پہاڑ پر چڑھ گیا اور پتھروں سے ان کی خبر لینے لگا۔ اس طرح میں نے مسلسل ان کا پیچھا کیے رکھا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے جتنے اونٹ تھے میں نے ان سب کو اپنے پیچھے کر لیا۔ اور ان لوگوں نے میرے لیے ان اونٹوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن میں نے پھر بھی ان کا پیچھا جاری رکھا۔ اور ان پر تیر برساتا رہا۔ یہاں تک کہ بوجھ کم کرنے کے لیے انھوں نے تیس سے زیادہ چادریں اور تیس سے زیادہ نیزے پھینک دیے"۔

حاصل کلام یہ کہ اس لڑائی میں صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عبدالرحمٰن کو قتل کر ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا! "آج ہمارے سب سے بہتر شہسوار ابوقتادہ اور سب سے بہتر پیادہ سلمہ (بن اکوع) ہیں۔ اور آپ ﷺ نے مجھے دو حصے دیے ایک پیادہ کا اور ایک شہسوار کا اور مدینہ واپس ہوتے ہوئے (یہ شرف بخشا) کہ عضباء نامی اپنی اونٹنی پر اپنے پیچھے سوار فرما

لیا''۔(ماخوذ بخاری ومسلم، مدارج النبوت، زرقانی، سیرت ابن ہشام، زادالمعاد وغیرہ)

قارئین محترم! ذرا غور فرمائیں کہ یہ عبد الرحمٰن جس کا ذکر ملفوظات اعلیٰ حضرت میں کیا گیا ہے ۷ ہجری کے معرکے میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اور رہا عبد الرحمٰن بن عبد القاری تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ ! اکثر محدثین نے عبد الرحمٰن بن عبد القاری کو تابعی تسلیم کیا ہے۔ صرف علامہ واقدی انھیں صحابہ میں شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ان کو اُن لوگوں میں شمار کیا ہے جو عہد رسالت میں پیدا ہوئے مگر انھیں حضور ﷺ سے سماع حدیث کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ ان کی وفات ۸۱ ہجری میں ہوئی جبکہ ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔ اس حساب سے انکی پیدائش ۳ ہجری ہے۔ تو کیا وہ چار سال کی عمر میں لڑنے گئے تھے؟۔ جیسا کہ ''اکمال فی اسماء الرجال'' میں ہے:''عبد الرحمن بن عبد القاری یقال انه ولد علی عهد رسول الله ﷺ ولیس له منه سماع ولا روایة وعده الواقدی من الصحابة فیمن ولد عهد رسول الله ﷺ المشهور انه تابعی وهو من جملة تابعی المدینة و علمائها سمع عمر بن خطاب مات سنة احد و ثما نین وله ثمان و سبعون سنة''۔(مشکوۃ مع اکمال فی اسماء الرجال (اردو) ۳/۳۷۲ مطبوعہ لاہور)

ترجمہ: ان کا نام عبد الرحمٰن بن عبد القاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن نہ حضور ﷺ سے حدیث کی سماعت کی نہ روایت بیان کی۔ مؤرخ واقدی نے اُن صحابہ کے ذکر میں جو آنحضرت (ﷺ) کے زمانہ میں پیدا ہوئے ان کا بھی شمار کیا ہے۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ تابعی ہیں۔ مدینہ کے تابعین اور وہاں کے علماء میں سے ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی۔ ۸۱ھ میں بعمر ۷۸ سال وفات پائی۔

۲)ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!''عبد الرحمن بن عبد القاری ولد علی عهد النبی ﷺ وقیل به الیه وهو صغیر روی عن عمرو ابی طلحه وابی ایوب وابی هریرة---قال ابن معین ثقه--- وقال ابن سعد توفی بالمدینة

سنة ۸۵ ھ فی خلافت عبد الملك وھو ابن (۷۸)سنة۔۔۔اجلة تابعی اھل المدینة وعلمائھم۔۔۔وقال العجلی مدنی تابعی ثقه و ذکرہ مسلم وابن سعد وخلیفة فی الطبقة الاول من تابعی اھل المدینة "۔(تہذیب التہذیب ۷/۲۲۳مطبوعہ بیروت)

۳)اسی طرح علامہ ابن اثیر نے اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ۳/۳۷۷،۳۷۸مطبوعہ دار الفکر میں لکھا ہے۔علاوہ ازیں درج ذیل کتب میں بھی عبد الرحمٰن بن عبد القاری کے متعلق تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں:

۴)طبقات ابن سعد۵/۵۷ (۵)طبقات خلیفہ ۲۳۶ (۶)ثقات العجلی ص ۳۳
۷)تاریخ البخاری الکبیر۵/الترجمہ ۹۸۸ (۸)علل احمد۱/۲۵۷
۹)معرفۃ التاریخ ۱/۳۷۰ (۱۰)شذرات الذھب۱/۸۸
(۱۱)خلاصۃ الخزرجی۲/الترجمہ ۴۱۷۲ (۱۲)معرفۃ التابعین صفحہ ۲۶
۱۳)تذھیب التھذیب۲/۲۱۸ (۱۴)تہذیب الکمال ۱۷/۲۶۳
۱۵)تاریخ الاسلام ۳/۱۸۲ (۱۶)سیر اعلام النبلاء ۴/۱۴،۱۵
۱۷)تجرید اسماء الصحابۃ ۱/الترجمہ ۳۷۲۰ (۱۸)الکاشف ۲/الترجمہ ۳۲۹۷
۱۹)العبر ۱/۹۲ (۲۰)ثقات ابن حبان ۵/۷۹ (۲۱)الجرح والتعدیل/۱/الترجمہ ۱۲۳۳

ان تمام کتب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عبد الرحمٰن بن عبد القاری تابعی ہیں۔لہذا ملفوظات اعلیٰ حضرت میں جس عبد الرحمٰن کا ذکر ہے وہ یہ نہیں ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چلو صحابی نہ سہی تابعی کو کافر کیوں کہا؟

اس ضمن میں عرض ہے کہ ملفوظات اعلیٰ حضرت میں موجود عبد الرحمٰن کا ذکر تو عہد نبوی ﷺ سے ہے تو پھر وہاں تابعی کہاں سے آ گیا؟ بہرحال تابعی ہو یا صحابی یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ محدث بریلوی علیہ الرحمہ نے جس عبد الرحمٰن کو کافر کہا ہے یہ وہ شخص ہے۔اور جس کے کفری

کارنامے ملفوظات اعلیٰ حضرت حصہ دوم میں موجود ہیں۔ چند باتیں قارئین کی وضاحت کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

۱) یہ عبدالرحمن اپنے ہمراہیوں کے ساتھ حضور ﷺ کے اونٹوں پر آ پڑا۔

۲) حضور ﷺ کے چرواہے کو قتل کیا اور اونٹ لے گیا۔

۳) حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے اس کا تعاقب کیا۔

۴) اس عبدالرحمن کو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔

گزارش دل: کیا حضور ﷺ کے اونٹوں کو لوٹنے والا صحابی یا تابعی ہوگا؟

کیا حضور ﷺ اور انکے صحابہ سے جنگ کرنے والا صحابی یا تابعی ہوگا؟

کیا حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے کسی صحابی کا تعاقب کیا؟

کیا حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے کسی صحابی یا تابعی کو قتل کیا؟

ہر ذی عقل و ذی فہم ان سوالات کے جوابات کے بارے میں یہی کہے گا کہ ہرگز نہیں۔ غزوہ ذی قرد کے حالات و واقعات پڑھ کر سب کا یہی فیصلہ ہوگا کہ یہ عبدالرحمن ضرور بضرور اللہ اور اس کے رسول جل جلالہ وصلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن اور بدترین کافر تھا۔

ایک غلط فھمی اور اسکا ازالہ: ملفوظات اعلیٰ حضرت حصہ دوم میں عبدالرحمن کے نام کے ساتھ جو واقعات تفصیلاً مذکور ہیں وہ واقعی طور پر اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ یہ عبد الرحمن بن عبدالقاری ہرگز ہرگز نہیں ہیں۔ اگرچہ اس کافر عبدالرحمن کی نسبت سامع یا جامع کی غلطی کی وجہ سے بدل گئی ہے۔ فزاری کی جگہ قاری ہوگیا ہے۔ صرف نسبت بدلنے سے مسمی نہیں بدلتا۔ اور ملفوظات میں صاحب ملفوظات کی عبارت بعینہ منقول نہیں ہوتی بلکہ یہ روایت بالمعنی ہوتی ہے اور سامع سے غلطی کا صادر ہو جانا ممکن ہے جیسا کہ اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

از قلم: علامہ پیر محمد تبسم بشیر اویسی☆

اسلام میں گداگری کی ممانعت

عن عبد اللّٰہ ابن عمران رسول اللہ ﷺ قال وھو علی منبر و ذکر الصدقہ والتعفف والمسئلۃ الید العلیا خیر من الید السفلیٰ فالید العلیا ھی المنفقۃ والسفلیٰ ھی السائلۃ۔ (بخاری جلد اول صفحہ 192، مسلم جلد اول صفحہ 332)

ترجمہ: "حضرت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے منبر شریف پر تشریف فرما ہو کر ارشاد فرمایا صدقہ اور مانگنے سے بچنے کے متعلق اور مانگنے کی برائی ذکر فرمائی کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اوپر والا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے، اور نیچے والا ہاتھ سوال کرنے والا ہے۔"

صدقہ: زکوۃ تو فرض ہے اور وہ بھی صدقہ ہے لیکن وہ تو صرف صاحب نصاب پر لازم ہوتی ہے اس کے علاوہ صدقات نافلہ ہوتے ہیں جو کہ صاحب نصاب اور نصاب سے کم مالیت والے بھی کر سکتے ہیں، بلکہ بعض صدقات فقراء اور مساکین بھی کر سکتے ہیں جیسا کہ تسبیحات و تکبیرات بھی صدقہ کا حکم رکھتی ہیں، بلکہ کسی سے ہنستے چہرے کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہوتا ہے اور یہ صدقات موجب اجر و ثواب اور بلیات و آفات کے ٹلنے کا سبب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ روایت میں ہے: علیکم بالصدقۃ فان اللہ تعالیٰ لید رأبالصدقۃ سبعین بابا من البلاء ابسرھا الجزام والبرص۔ "اپنے اوپر صدقہ لازم کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ کی برکت سے ستر دروازے بلاؤں کے دفع فرماتا ہے ان میں سے معمولی اور آسان دروازہ جذام (کوڑھ) برص (سفید داغ) ہے۔ (کشف الغمہ)

حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بادر وابالصدقۃ فان البلاء لا یتخطاھا۔ صدقہ کرنے میں جلدی کرو۔ بے شک بلائیں اس سے تجاوز نہیں کرتیں (یعنی ٹل جاتی ہیں)"۔ (مشکوۃ 167)

☆: 0300-6491308

ان مبارک حدیثوں سے ثابت ہوا کہ مصائب وبلیات اور آفات کا واحد علاج صدقہ ہے اور صدقہ کی برکت سے مصیبت ٹل جاتی ہے اور مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ صدقات گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح ہر عمل میں اخلاص شرط ہے۔ اسی طرح صدقات بھی وہی نفع بخش اور فائدہ مند ہوتے ہیں جس میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلب ہو اور اُن کو احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کی وجہ سے ضائع نہ کر لیا ہو جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔ لا تبطلو صدقاتکم بالمن والاذیٰ۔ اپنے صدقات احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کے ساتھ باطل نہ کرو۔" جس پر صدقہ کرے اُس کا احسان جانے کہ اُس نے صدقہ قبول کر لیا۔ اس پر احسان جتلانے اور اس کو حقیر جانے اُس کو تکلیف واذیت پہنچانے سے صدقہ کا اجر وثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

سوال کرنے کی مذمت :بغیر حاجت شدیدہ اور سخت مجبوری کے سوال کرنا اور لوگوں سے مانگنا سخت مکروہ اور ناپسندیدہ امر موجب ذلت ورسوائی ہے بلکہ چاہیے اپنے ہاتھ سے محنت ومشقت کر کے گزارہ کرے اور صبر وقناعت کرے۔ بلکہ اس طرح وقت گزارنا مانگنے کی ذلت سے ہزار درجہ بہتر ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم شریف میں ہے:" عن ابی هریره رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال والذی نفسی بیده لان یأخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یاتی رجلا فیساله اعطاه و منعه ۔سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص رسی پکڑے اور اپنی پیٹھ پر لکڑی کا گٹھا لاد کر لائے اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے پاس آئے اور اس سے سوال کرے، وہ اسے دے یا نہ دے۔" (بخاری ومسلم)

معلوم ہوا کہ محنت ومزدوری کر کے کمانا اور کھانا لوگوں سے مانگنے سے بچنا بہت بہتر ہے کیونکہ اس طرح نفس ذلیل وخوار ہوتا ہے اور اس کا وقار مجروح ہوتا ہے در بدر پھرنا اور گداگری کرنا اور گلیوں میں گھوم کر مانگنا اور طرح طرح کے حیلوں، بہانوں سے مانگنا اور جھوٹ بولنا، کبھی ماں باپ کی بیماری ظاہر کرنا اور کبھی بے گھر ہونے کا بہانہ بنانا اور مال جمع کرنا اور گداگری کو پیشہ بنا لینا بہت ہی معیوب امر اور

ذلت ورسوائی کا باعث اور آخرت میں تباہی وبربادی کا سبب ہے۔ حدیث میں ہے سید دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ جو لوگوں سے اپنا مال بڑھانے کے لیے سوال کرتا ہے وہ اپنے لیے (جہنم کے) انگاروں کا سوال کر رہا ہے۔ (اب اس کی مرضی) خواہ کم سوال کرے یا زیادہ۔ اسی طرح ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں میں گھومتا رہتا ہے۔ لقمہ یا دو لقمے ایک کھجور یا دو کھجورے لے کر چلا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ مسکین کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ جس کے پاس اتنا مال نہ ہو جو اس کی ضروریات سے اس کو مستغنی کر دے اور نہ اس کے آثار سے مسکینی وفقر کا پتہ چلے تا کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ وہ لوگوں سے سوال کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

معلوم ہوا مسکین وفقیر وہ نہیں ہے جو مروجہ گداگری کرتا ہے اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے ہاں ایسا مسکین ہو جس کی نشاندہی حدیث میں کی گئی ہے جس کو اس کے حالات کا پتہ لگ جائے۔ وہ اس کی مدد کرے اور اس پر صدقہ کرے اور لوگوں سے تعاون کرائے تو وہ بہت بہتر ہے اور ایسے حاجت مند پر صدقہ کرنے کا بہت اجر وثواب ہے بغیر ضرورت اور حاجت کے مانگنا قیامت میں ذلت ورسوائی کا سبب ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسان سوال کرتا رہے گا حتیٰ کہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔ ان احادیث وروایات سے ظاہر ہوا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور مانگنا اور گداگری کو پیشہ بنانا دنیوی واخروی ذلت ورسوائی کا سبب ہوگا اور مالداری کیلئے سوال کرنا ایسا ہے جیسے آگ کے انگاروں کا سوال کرنا اور مانگنے والا کل قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے ایسا ذلیل ورسوا ہوگا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ٹکڑا نہ ہوگا۔ اس مذکورہ حدیث میں بھی یہی ہے کہ آپ نے صدقہ کرنے پر ابھارا اور مانگنے کی برائی بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا: ''اونچا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' اللہ تعالیٰ اپنے راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بخشے'' آمین!

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

مفتی محمد رضاء المصطفےٰ ظریف القادری☆

مسائل شرعیہ اور اُن کا حل

سوال: بعض سادات جب غیر سید سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں سید ہوں اور تو اُمتی ہے۔ اسی طرح بعض غیر سید جب سید سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں اُمتی ہوں اور آپ سید ہیں۔ یعنی اُمتی کے مقابلے میں سید اور سید کے مقابلے میں اُمتی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ شرعی طور پر اس بارے میں کیا حکم ہے۔ کیا سید اُمتی نہیں؟۔ (السائل: حافظ محمد صفدر)

الجواب: ایسا کہنا نہ سادات کے لیے جائز ہے اور نہ ہی غیر سادات کے لیے۔ سادات اور غیر سادات اُمتی ہونے میں سب برابر ہیں۔

سوال: دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (السائل: ظفر محمود قریشی)

الجواب: سلام کرنے سے پہلے یا بعد ہاتھ جوڑنا پاکستان کے بعض علاقوں میں مروج ہے اور کئی اہل علم بھی ایسا کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ بوقت ملاقات صرف مسنون طریقہ سے سلام و مصافحہ پر ہی اکتفا چاہیے۔ ہاتھ جوڑنا خلاف سنت ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ قرآن مجید کے پرانے اور پھٹے ہوئے نسخوں نیز ان کے بوسیدہ اوراق کی حفاظت کے لیے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟۔ (تحفظ اوراق مقدسہ کے نام سے یہ فتویٰ مکتبہ قادریہ میلاد چوک سرکلر روڈ گوجرانوالہ سے مل سکتا ہے)

جواب: قرآن مجید یا اس کے اوراق پرانے اور بوسیدہ ہو جائیں اس قابل نہ رہیں کہ اُن سے تلاوت کی جاسکے اور یہ اندیشہ ہو کہ اوراق منتشر ہو کر ضائع ہو جائیں گے تو ان کی حفاظت کے بارے کتب اسلامیہ میں تین صورتیں مذکور ہیں۔

جلانا، دھونا، دفنانا۔

چنانچہ مُلا علی قاری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''مصحف کا بوسیدہ ورق جس سے کوئی فائدہ نہ رہ گیا ہو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اُسے دھو ڈالنا بہتر ہے یا جلانا۔ ایک قول یہ ہے کہ جلانا بہتر

☆ دارالافتاء مرکزی جامعہ حنفیہ رضویہ سراج العلوم گوجرانوالہ

ہے کیونکہ دھونے میں ایک قسم کی اہانت یہ ہوگی کہ غسالہ پیروں تلے روندا جائیگا۔'' (مرقات ج ۲ ص ۶۳۱)

اور جلانے میں اس طرح کی کوئی اہانت نہیں ہو سکتی دوسرا قول یہ ہے کہ دھونا بہتر ہے اور غسالے کو کسی پاک جگہ بہا دیا جائے کیونکہ جلانے میں ایک طرح کی اہانت ہے۔

علامہ محمود عینی فرماتے ہیں! ''ہمارے علمائے حنفیہ نے فرمایا جب مصحف اتنا بوسیدہ ہو جائے کہ اس سے فائدہ نہ حاصل ہو سکے تو لوگوں کی پامالی سے دور کسی پاک جگہ دفن کر دیا جائے۔ (عمدۃ القاری ج ۴ ص ۱۹)

فقیہ ابی اللیث سمرقندی لکھتے ہیں! ''بوسیدہ مصحف پاک زمین میں دفن کیا جائے۔ جلایا نہ جائے۔'' (فتاویٰ النوازل ص ۲۰۷)

پانچ سو علماء کا فتویٰ: سلطان اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے دور حکومت میں موصوف سلطان کے منتخب جلیل القدر پانچ سو علماء کے مرتبہ فتاویٰ میں ہے! ''مصحف جب پرانا ہو جائے اور اس سے تلاوت نہ ہو سکے تو اُسے آگ میں نہ جلایا جائے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۳)

اسی میں ہے! ''مصحف جب پرانا ہو جائے کہ اُس سے تلاوت نہ کی جا سکے اور اس کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے''۔ (حوالہ ایضا)

علامہ شامی لکھتے ہیں! ''مجتبیٰ میں لکھا ہے کہ جب مصحف پرانا اور بوسیدہ ہو جائے تو اس کو دفن کرنا احسن ہے جیسے انبیاء کرام (علیہم الصلوۃ والسلام) اور اولیاء (علیہم الرضوان) کو دفن کیا جاتا ہے اور باقی دینی کتابیں جب بوسیدہ ہو جائیں اور ان سے نفع نہ اٹھایا جا سکے تو ان کا حکم بھی یہی ہے اور دفن کرنا تعظیم کے خلاف نہیں کیونکہ لوگوں میں سے افضل حضرات (انبیاء و اولیاء) بھی دفن کیے جاتے ہیں اور ذخیرہ میں ہے کہ جب مصحف پرانا ہو جائے اور اس سے پڑھنا دشوار ہو جائے تو اس کو آگ میں نہیں جلایا جائے گا۔ امام محمد نے اسی طرف اشارہ کیا ہے اور ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور مناسب یہ ہے کہ اُسے پاک کپڑے میں لپیٹا جائے اور اس کے لیے لحد بنائی جائے۔ اس لیے

کہ اگر اس کی قبر بہ طریق شق بنائی گئی تو اس پر مٹی گرے گی اور اس میں ایک قسم کی تحقیر ہے ہاں اگر اس کے اوپر چھت بنالی جائے پھر مٹی ڈالی جائے تو کوئی حرج نہیں اور اگر چاہے تو اسے پانی کے ساتھ دھولے یا کسی پاک جگہ رکھ دیا جائے جہاں نہ کسی بے وضو کا ہاتھ لگے نہ گرد و غبار پڑے نہ نجاست لگے اور نہ اس کی تعظیم میں فرق آئے تو یہ بھی جائز ہے۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۲۶۹)

امام سرخسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''مصحف کو آگ میں جلانا نہیں چاہیے اس لیے کہ ہوسکتا ہے اُس میں اللہ کے ذکر والی کوئی چیز ہو یا کلام اللہ کا کچھ حصہ ہو اور یہ بات مخفی نہیں کہ آگ میں جلانے میں اُسے حقیر جاننا ہے۔ (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۱۰۲۹)

آپ کسی حنفی امام کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں! ''مصحف کو پاک جگہ دفن کرنے میں کوئی حرج نہیں''۔ (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۱۰۵۰)

علامہ سید احمد طحطاوی حنفی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں! ''مصحف سمیت تمام کتابوں کو جو لائق انتفاع نہ رہیں جاری پانی میں بہانے میں حرج نہیں یا دفن کر دی جائیں اور دفن کرنا احسن ہے۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو دفن کیا گیا۔ (حاشیہ الطحطاوی ج ۴ ص ۲۱۰)

امام نووی شافعی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں! ''جب (آیات قرآنیہ) کو لکڑی پر لکھا گیا تو اس لکڑی کو جلانا مکروہ ہے''۔ (التبیان فی آداب حملۃ القرآن) ص ۸۹۔۹۷)

علامہ سیوطی اور علامہ زرکشی لکھتے ہیں! ''قاضی حسین نے بوسیدہ اوراق کو جلانے کی ممانعت پر جزم فرمایا ہے اس لیے کہ یہ کام احترام کے خلاف ہے''۔ (اتقان ج ۲ ص ۲۲۱)

شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد حلوائی متوفی ۴۵۶ھ علامہ جصاص اور علامہ طاہر بن احمد صاحب خلاصہ متوفی ۵۴۲ھ علیہم الرضوان فرماتے ہیں! ''مصحف جب بوسیدہ ہو جائے۔ اُسے جلایا نہ جائے بلکہ اُس کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا جائے''۔ (واللفظ شمس الائمہ بحوالہ البرہان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۴۷۷)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ کا فتویٰ : مسئلہ: کیا

فرماتے ہیں علمائے دین وحامیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص متدین متبع سنت رسول ﷺ نے پارہائے کہنہ فرسودہ قرآن شریف اور قواعد بغدادی اور قواعد ابجد کو جو لڑکوں کے دست مالش سے پھٹے ہوئے تھے اس مصلحت سے کہ ان کی بے ادبی نہ ہو اور پاؤں کے تلے نہ آویں بدون قصد توہین کے بسند حدیث بخاری کے جو باب جمع القرآن میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ''امر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق '' ان کو جلا دیا آیا یہ شخص اہل سنت کے نزدیک بلحاظ مصلحت وسند مذکور وادلہ شرعیہ کے صواب پر ہے یا خطا پر کتب معتبرہ سے جواب فرماویں۔ بینوا توجروا

الجواب: احراق مصحف بوسیدہ وغیر منتفع علماء میں مختلف فیہ ہے۔ اور فتویٰ اس پر ہے کہ جائز نہیں۔ قال فی الفتاویٰ عالمگیریة المصحف اذا صار خلقا و تعذر القرأة منه لا یحرق بالنار اشار الشیبانی الی هذا فی السیر الکبیر و به ناخذ کذافی الذخیرة بلکہ ایسے مصاحف کو پاک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کرنا چاہیے۔ فیھا ایضاً المصحف اذا صار خلقا لا یقرؤ منه و یخاف ان یضع یجعل فی خرقة طاهرة و یدفن و دفنه اولیٰ من وضعه موضعا یخاف ان یقع علیه النجاسة و نحو ذلک و لیحد له لانه لو شق و دفن یحتاج الی اهالة التراب علیه و فی ذلک نوع تحقیر الا اذا جعل فوقه سقف بحیث لا یصل التراب علیه فهو حسن ایضا کذا فی الغرائب اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم سے کہ احراق واقع ہوا کما فی حدیث البخاری بغرض رفع فتنہ وفساد تھا اور بالکلیہ رفع اوس کا اسی طریقہ میں منحصر کہ صورت دفن میں ان لوگوں سے جنہیں مصاحف محرقہ اور ان کی ترتیب خلاف واقع پر اصرار تھا احتمال اخراج تھا بخلاف مانحن فیہ کہ یہاں مقصود حفظ مصحف ہے۔ بے ادبی اور ضائع ہوجانے سے اور یہ امر طریقہ دفن میں کہ مختار علماء ہے کما مر بنهج احسن حاصل البتہ قواعد بغدادی وابجد اور سب کتب غیر منتفع بہا ماورائے مصحف کریم کو جلا

دینا بعد محو اسمائے باری عزاسمہ اور اسمائے رسل ملائکہ صلی اللہ تعالیٰ علیہم وسلم اجمعین کے جائز ہے۔ کما فی الدرر المختار الکتب التی لا ینتفع بها محی عنها اسم اللہ و ملائکۃ و رسولہ ویحرق الباقی واللہ تعالیٰ اعلم و علمہ عزاسمہ اتم

معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے ناقابل استعمال پرانے نسخے اور بوسیدہ اوراق کی حفاظت جس سے اسکا تقدس اور ادب زیادہ محفوظ رہ سکے یہی ہے کہ ایسے نسخوں اور اوراق کو کسی بہتر اچھے طریقے سے دفن کیا جائے پانی چونکہ مختلف پاک ناپاک جگہ سے گذرتا اور ٹھہرتا ہے حتیٰ کہ جانور تک اس میں پیشاب وگوبر کرتے ہیں انسان پاکی ناپاکی کی حالت میں نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں لہذا پانی میں نہ بہائے جائیں جہاں تک جلانے کا تعلق ہے اسے جہاں علماء نے ناپسند فرمایا ساتھ ہی عوام الناس بھی ایسے فعل کو اچھا تصور نہیں کرتے ایسے فعل کے مرتکب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

چنانچہ رسم المفتی ''من لم یعرف احوال زمانہ فھو جاھل ''یعنی جو شخص احوال زمانہ سے بے خبر ہو وہ جاہل ہے کہ مطابق علماء کو چاہیے کہ وہ ہرگز جلانے کا فتویٰ نہ دیں۔

دور عثمانی میں احراق مصاحف :پرانے مصاحف واوراق کو جلانے کے جواز کے قائل حضرات حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں مصاحف کے جلانے کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام کا دائرہ جب وسیع ہو گیا تو جن مسلمانوں نے قرآنی آیات کو جس اُستاد سے جس طرز تلفظ اور قرأت سے سیکھا تھا ان میں اور دوسرے اُن مسلمانوں میں جن کو دوسری قرأت میں تعلیم دی گئی تھی اختلاف پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت حذیفہ نے حضرت عثمان سے کہا اس اُمت کو سنبھالو اس سے پہلے کہ ان میں یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اختلاف پیدا ہو۔ (بخاری ج ۲ ص ۷۴۶، اتقان ج ۱ ص ۸۰، مناہل العرفان ج ۱ ص ۲۵۲)

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ صحابہ کرام کے سامنے پیش کیا اور صحابہ کے اتفاق پر آپ نے حضرت حفصہ کے گھر سے وہ نسخہ منگوایا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے

دور میں لکھا گیا تھا اور قرآن مجید کے وہ نسخے نذر آتش کر دیے جو مختلف حضرات کے پاس موجود تھے۔

جلانے کی وجوہات و اسباب :شارح بخاری علامہ کرمانی علیہ الرحمہ اس جگہ لکھتے ہیں!''اگر تو کہے کہ قرآن مجید کو جلانا کیونکر جائز ہو سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ جلایا وہ گیا تھا جو منسوخ تھا یا جو غیر قرآن کے ساتھ خلط ملط ہو چکا تھا۔(کرمانی ج ۱۸ص ۹،عمدۃ القاری ج ۲۰ص ۱۸)

ملا علی قاری فرماتے ہیں!''حضرت عثمان نے نذر آتش اُسے کرایا جو قرآن نہ تھا یا قرآن سے اتنا خلط ملط ہو گیا تھا کہ اُسے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا۔اور انھوں نے جلانے ہی کو اس لیے ترجیح دی کہ اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کچھ قرآن چھوڑ دیا کیونکہ اگر وہ قرآن (غیر منسوخ) ہوتا کوئی مسلمان اُسے جلانا روا نہ رکھتا۔(مرقات ج ۲ص ۶۳۱)

ابن ابی داؤد اور طبرانی نے شعیب سے روایت کی ہے!''جناب عثمان نے ہر وہ مصحف نذر آتش کرنے کا حکم دیا جو ان مصاحف کے خلاف تھا جنھیں بلاد اسلامیہ میں بھیجا گیا''۔(بحوالہ فتح الباری ج ۹ص ۱۷،کتاب المصاحف ص ۲۷،سجستانی''اتقیان ص ۶۹)

علامہ کرمانی فرماتے ہیں!''وہ مصاحف نذر آتش کیے گئے جن میں غیر قرآن،قرآن سے مخلوط تھا یا قرأت شاذہ یا وہ قرائتیں تھیں جو منسوخ ہو چکی تھیں انھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس لیے نذر آتش کرایا کہ اختلاف ختم ہو جائے''۔(کرمانی ج ۱۸ص ۹)

اور آئندہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص ان مصاحف کو پیش کر کے مسلمانوں میں پھر اختلاف و انتشار پیدا کرے اور انھیں ایک قرآن اور ایک زبان پر جمع نہ رہنے دے۔معلوم ہوا کہ آپ کا یہ اقدام نظریہ ضرورت کے تحت تھا اور شریعت کا مشہور قاعدہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات ضرورتیں ممنوعات کو جائز بنا دیتی ہیں۔

علامہ قاضی عیاض کی تحقیق :علامہ ابن حجر اور علامہ عینی لکھتے ہیں!''قاضی عیاض نے اس بات پر وثوق فرمایا ہے کہ لوگوں نے پہلے انھیں پانی سے دھویا پھر انھیں جلایا تاکہ انھی

طرح تلف ہو جائیں"۔ (عمدة القاری ج ۲۰ ص ۱۸)

علامہ ابن حجر کی رائے: آپ فرماتے ہیں! "جلانے کا حکم اس وقت سے متعلق تھا بہر حال اب اگر ضرورت ہو تو دھونا ہی اولیٰ ہے"۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۷)

علامہ عینی بھی یہی فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (عمدة القاری ج ۲۰ ص ۱۹)

البتہ علماء احناف کا موقف یہ ہے کہ دھونے کی نسبت دفنانے میں زیادہ ادب ہے۔ اور اسی صورت کو عرف میں بھی زیادہ باعث ادب تصور کیا جاتا ہے۔ اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ انما العبرة فی الادب للعرف۔ ادب میں اعتبار عرف کا ہے۔ اسی عرف کے اعتبار کی وجہ سے مسجد میں جوتا پہنے جانا بے ادبی ہے۔ حالانکہ صدر اول میں یہ حکم نہ تھا۔ چنانچہ فتاویٰ سراجیہ اور عالمگیریہ میں ہے دخول المسجد متنعلا مکروہ مسجد میں جوتا پہنے داخل ہونا مکروہ ہے۔ عمدة المفتیین ورد المختار میں ہے دخول المسجد متنعلا من سوء الادب مسجد میں جوتا پہنے جانا بے ادبی ہے بوسیدہ اوراق و پرانے مصاحف کے جلانے کو عرف میں بے ادبی پر محمول کیا جاتا ہے۔ لہذا انھیں جلانے کی بجائے دفنایا جائے۔

کسی نے انکار نہ کیا: مصعب بن سعد سے روایت ہے! "فرمایا میں نے بکثرت لوگوں کو اس وقت پایا جب عثمان نے مصاحف نذر آتش کرائے سب نے اسے پسند کیا اور کسی نے انکار نہ کیا"۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۱۷، عمدة القاری ج ۲۰ ص ۱۸، کنز العمال ج ۲ ص ۱۸۱ کتاب المصاحف ص ۱۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ **بھی یہی کرتے:** حضرت عمر بن سعید سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں! "حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر حضرت عثمان کے وقت میں حاکم ہوتا تو مصاحف کے سلسلہ میں میں بھی اسی طرح کرتا جو عثمان نے کیا"۔ (مناہل العرفان ج ۱ ص ۲۵۵)

اعلان علی رضی اللہ عنہ: ابوبکر انباری نے سوید بن غفلہ سے روایت کی۔ انھوں نے فرمایا! "میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا اے لوگوں کے گروہ اللہ سے ڈرو۔ عثمان کے بارے میں حد سے نہ بڑھو اور انھیں مصاحف جلانے والا کہنے سے بچو۔ اللہ کی قسم آپ نے

مصاحف کو اصحاب رسول ﷺ کی جماعت کے مشورے کے سوا نہیں جلایا"۔ (مناہل العرفان ج۱ ص۲۵۵، اتقان ص۶۱، فتح الباری ج۹ ص۱۷، عمدۃ القاری ج۲۰ ص۱۸)

جیسا کہ گذشتہ سطور سے یہ بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ جو مصاحف نذر آتش کیے گئے تھے وہ وہی تھے جو اصل نسخے کے خلاف قرأت منسوخہ، شاذہ اور غیر قرآن پر مشتمل تھے۔ اصل نسخہ قرآن کو نہیں جلایا گیا تھا بلکہ اسے رائج اور شائع کیا گیا تھا۔ لہذا دور عثمانی میں مصاحف کو جلانے کے اس عمل کو مقیس و مقیس علیہ میں مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کے پرانے نسخوں اور بوسیدہ اوراق کو جلانے کے سلسلہ میں نہ دلیل جواز بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی خلیفۂ رسول سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر کسی قسم کی تنقید و اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

تحقیر و استخفاف: گذشتہ تحریر کا تعلق اس امر کے ساتھ تھا کہ قرآن کے پرانے نسخوں اور بوسیدہ اوراق کی حفاظت کا بہترین اور زیادہ مؤدب طریقہ یہ ہے کہ انھیں دفنا دیا جائے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی بدبخت توہین کے پیش نظر قرآن مجید کے نئے یا پرانے نسخوں، بوسیدہ یا ناقابل استعمال اوراق کو گندی جگہ گرا یا جلا دیتا ہے تو اس کے بارے حکم شرعی کیا ہوگا؟۔

چنانچہ علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمہ لکھتے ہیں! "توجہ کی بات یہ ہے کہ جو شخص مصحف قرآن کریم یا اس کے جز کا استخفاف کرے یا ان کی اہانت کرے یا اس کے کل یا جز کا منکر ہو یا اس کی تکذیب کرے یا قرآن کریم کے کسی ایسے حکم یا خبر کو جھٹلائے جس کی تصریح اس میں موجود ہو یا ایسی چیز کو ثابت کرے جس کی قرآن کریم میں نفی موجود ہو یا ایسی چیز یا بات کی نفی کرے جو قرآن سے ثابت ہے اور مزید برآں یہ کہ وہ اس کو بخوبی جانتا بھی ہو۔ یا ایسے امور میں شک کرے تو ایسا شخص بالاجماع کافر ہے۔ (التبیان ص۸۴)

علامہ نووی اور امام ابن حجر ہیتمی فرماتے ہیں! "اگر کسی مسلمان نے والعیاذ باللہ قرآن مجید کو نجاست میں ڈال دیا تو ڈالنے والا کافر ہو جائیگا۔ (واللفظ للنووی التبیان ص۹۸، الزواجر ج۲ ص۳۳۹) واللہ ورسولہ اعلم۔

تحقیق وتحریر: فیصل خان☆

زبدۃ التحقیق کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسئلہ افضلیت شیخین جو کہ اہل سنت وجماعت کے مسلمہ عقائد کی قبیل سے تھا گذشتہ کچھ عرصہ سے اہل سنت کے بعض حلقوں میں متنازعہ فیہ کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ جیسا کہ اس مسئلہ پر جناب محترم قبلہ سید عبدالقادر جیلانی صاحب کی ''کتاب زبدۃ التحقیق'' کچھ عرصہ پہلے منظر عام پر آچکی ہے۔ محترم قبلہ شاہ صاحب نے اپنی کتاب زبدۃ التحقیق ص ۱۰۹ پر اپنا عقیدہ کچھ یوں سپرد قرطاس فرماتے ہیں۔

''ہمارا اپنا عقیدہ بحیثیت سنی کے جناب ابوبکر صدیق ؓ کے بارے میں بحیثیت خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق ہونے کے افضل الامت ہونے کا ہے۔ مگر ان صحابہ کرام اور علماء امت کو سنیت سے خارج نہیں کیا جا سکے گا۔ جو ہماری اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔''

قبلہ محترم شاہ صاحب کا یہ موقف دو نکات پر مشتمل ہے کہ!

1: ان کا اپنا عقیدہ حضرت ابوبکر صدیق کا افضل الامت ہونے کا ہے۔

2: جن صحابہ نے ابوبکر صدیق کو افضل الامت نہیں مانا ان کو سنیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قبلہ محترم شاہ صاحب کے اس موقف کے دونوں پہلو کی تنقیح اور وضاحت تفصیل طلب ہے تاکہ معاملہ واضح اور آشکار ہو سکے۔ قبلہ محترم شاہ صاحب نے دعویٰ تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے افضل الامت ہونے کا کیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ زبدۃ التحقیق ص ۱۰۵ تا ص ۱۰۸ پر حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل بیان کرنے کے بعد ص ۱۰۸ پر ان احادیث پر اعتراض بھی وارد کیے جس کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر علماء اہل سنت نے دلیل قائم فرمائی ہے۔ مقصد واضح ہے کہ ایک طرف تو قبلہ شاہ صاحب زبدۃ التحقیق ص ۱۹۹ پر لکھیں کہ'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت بحیثیت خلیفہ راشد کے برحق ہے اور اس حیثیت سے آپ افضل الامت ہیں''۔ مگر ساتھ ہی ساتھ شاہ صاحب زبدۃ التحقیق میں حضرت ابوبکر کی افضلیت والی احادیث پر اعتراضات بھی وارد کرتے نظر آرہے ہیں۔

اہم نوٹ: میں محترم قبلہ سید عبدالقادر شاہ صاحب سے ادباً ایک سوال ضرور کروں گا کہ حضور آپ کے نزدیک اگر

حضرت ابوبکر صدیق افضل الامت ہیں تو آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ کیونکہ قبلہ شاہ صاحب نے زبدۃ التحقیق ص ۱۰۹ پر اس موقف کو "اپنا عقیدہ" لکھا ہے۔ اور میں یہ عرض کر دوں کہ قبلہ شاہ صاحب نے خود زبدۃ التحقیق ص ۲۰۰ کے آخری سطر میں یہ لکھا ہے کہ "افضلیت تو باب عقائد کی چیز ہے۔ جس میں قطعیات کا ہونا ضروری ہے۔ اس عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عقیدہ افضلیت میں قطعیات کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا محترم قبلہ شاہ صاحب کو اپنا عقیدہ ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل قطعی پیش فرمانا ہوگی۔ کم از کم قبلہ شاہ صاحب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو افضل الامت کہنے کی کوئی قطعی دلیل تو پیش فرمائیں تا کہ معاملہ واضح ہو سکے۔

اب ہم محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔
محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کے دوسرے پہلو کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ "کیونکہ افضلیت کے مسئلہ میں دیگر روایات مختلف صحابہ کرام سے دیگر صحابہ کرام کی افضلیت میں بھی موجود ہیں یعنی کچھ صحابہ کرام میں سے ایک صحابی نے حضرت زبیر بن العوام کو افضل کہا، کسی نے سیدہ فاطمۃ الزہراء کو افضل کہا، کسی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو افضل کہا گیا کسی روایت میں ازواج مطہرات کو افضل کہا گیا ہے۔ الغرض قبلہ عبدالقادر شاہ صاحب نے ان متعدد اقوال اور روایات کی روشنی میں یہ اصول وضع کر دیا کہ اگر کوئی حضرت ابوبکر صدیق کو افضل نہ مانے تو اسے اہل سنت سے خارج نہیں کرنا چاہیے۔ اب اہل سنت سے کیوں خارج نہیں کرنا چاہیے۔ اس اصول کی بنیاد قبلہ محترم شاہ صاحب نے زبدۃ التحقیق ص ۳۵۴ پر کچھ یوں فرمائی ہے۔ "ان اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم سب صحابہ کرام کو مینار ہدایت سمجھا لہذا ان میں کسی کے قول کی بھی پیروی کی جائے تو موجب رشد و ہدایت ہوگی۔ محترم قبلہ شاہ صاحب زبدۃ التحقیق ص ۳۲۸ پر مزید لکھتے ہیں۔ "حاصل کلام یہ ہوگا کہ جب صحابہ کرام میں اجماع نہیں ہو سکا تو ان کے اقوال خلافیہ سے باہر نہیں جایا جا سکتا بلکہ ان میں سے کسی ایک قول کے اختیار کر لینے کی اجازت ہوگی۔ کیونکہ صحابہ کرام میں حق دائر ہے۔

نکتہ: قبلہ شاہ صاحب کے اس موقف میں بھی دو پہلو ہیں:

1: اجماع نہ ہو تو صحابہ کرام کے اقوال خلافیہ میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کرنا حق ہوگا۔

2: دوسرا پہلو یہ واضح ہوا کہ اگر اجماع ہو جائے تو پھر اقوال خلافیہ میں سے کسی بھی ایک قول کو اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یعنی جب اجماع منعقد ہو جائے تو اقوال خلافیہ میں سے کسی بھی قول کو اختیار کرنا غلط ہوگا اور ایسے تمام اقوال جو اجماع کے خلاف ہوں تو شاذ ہو کر ان سے استدلال باطل ہوگا۔ مگر اس کے برعکس قبلہ محترم شاہ صاحب زبدۃ التحقیق ص ۳۲۳ پر صحابہ کرام کے اختلاف کی وجہ سے اجماع افضلیت ابوبکر صدیق نہیں مانتے ہیں۔ قبلہ شاہ

صاحب لکھتے ہیں۔ "جب اتنے اکابر کا اختلاف موجود تھا اور آج تک ہے تو پھر جناب ابوبکر صدیق کی افضلیت پر اجماع کیسے ہو سکتا تھا؟ لہٰذا قبلہ محترم شاہ صاحب کے دعویٰ کی تنقیح بہت اہم اور ضروری ہے۔ قبلہ شاہ صاحب کا یہ موقف بھی مضبوط نہیں ہے۔

اب ہم محترم قبلہ شاہ صاحب کے اس موقف کہ "اصحابی کالنجوم ...... کسی کے قول کی بھی پیروی کی جائے تو جب رشد و ہدایت ہوگی" زبدۃ التحقیق ص ۲۵۴ کا ایک فکری اور تحقیقی نکتہ نظر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس سے قبل یہ بھی عرض کر دیں کہ محترم قبلہ شاہ صاحب نے جن جن روایات سے استدلال کرتے ہوئے دیگر صحابہ کرام وغیرہما کو بھی افضل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان روایات کی استنادی حیثیت بھی محل نظر ہے جس کی وضاحت کسی اور مقام پر بھی کر دی جائے گی۔ اور ان احادیث کے متعلق محققین جمہور علماء کرام و محدثین نے جو کہا ہے وہ بھی منظر عام پر لائی جائیں گی۔ تاکہ عوام الناس پر یہ واضح ہو کہ مسئلہ افضلیت میں ضعیف حدیث یا روایات سے استدلال نہیں ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح ان روایات جو نہ تو سنداً ثابت ہیں اور نہ ہی جن سے مدعا ثابت کیا جا سکتا ہے وہ پیش کر کے اجماع توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اصحابی کالنجوم کا تحقیقی مفہوم:

محترم قبلہ شاہ صاحب نے اقوال اختلافیہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسئلہ افضلیت میں کسی بھی صحابی کا کوئی بھی قول در باب افضلیت میں اگر قبول کر لیا جائے تو وہ حق ہوگا اور اس طرح اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ استنادی وفنی حیثیت سے در کنار حضرت عائشہ، حضرت فاطمۃ الزہراء، حضرت زبیر بن عوام وغیرہما کے فضیلت کے بارے میں بھی چند روایات قبلہ شاہ صاحب نے نقل کیں ہیں۔ اب ان روایات نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر ان مندرجہ بالا میں سے کسی صحابی کے قول کو بھی مان لیں تو وہ حق ہوگا اور اس موقف کی بنیاد اصحابی کالنجوم والی روایت بھی تھی۔ اب اس موقف پر اپنی رائے دینے سے بہتر ہے کہ قبلہ محترم قبلہ شاہ صاحب کے نزدیک معتبر حافظ ابن عبدالبر کی تحقیق پیش کر دی جائے تاکہ عوام الناس کو اس معاملہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ حافظ ابن عبدالبر م ۴۶۳ھ لکھتے ہیں۔

اختلف الفقهاء في هذا الباب على قولين:

أحدهما: أن اختلاف العلماء من الصحابة ومن بعدهم من الأئمة رحمهم الله رحمة واسعة، وجائز لمن نظر في اختلاف أصحاب رسول الله ﷺ أن يأخذ بقول من شاء منهم، كذلك الناظر في أقاويل غيرهم من الأئمة ما لم يعلم أنه خطاء، فاذا بان له

أنه خطأ الخلافة نص الكتاب أو نص السنة أو اجماع العلماء لم يسعه اتباعه فان لم يبين له من هذه الوجوه جاز له استعمال قوله ، وان لم يعلم صوابه من خطئه وصار في حيز العامة التي يجوز لها أن تقلد العالم اذا سألته عن شئ وان لم تعلم وجهه ، هذا قول يروى معناه عن عمر بن عبدالعزيز" والقاسم بن محمد و عن سفيان الثوری ان صح عنه ، وقال به قوم ومن حجتهم على ذلك قوله ﷺ: أصحابی كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم " وهذا مذهب ضعيف عند جماعة من أهل العلم و قد رفضه أكثر الفقهاء وأهل النظر۔ (جامع البیان والعلم ۲/۹۵)

ترجمہ: اس باب میں فقہاء اسلام کے دو قول ہیں ایک یہ کہ صحابہ اور بعد کے ائمہ کا اختلاف رحمت و وسعت ہے اور یہ کہ ہر صحابی کے قول پر عمل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ائمہ کے مختلف اقوال میں سے جس قول کو لے لیا جائے جائز ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کی نص صریح یا علماء امت کا اجماع اس کے خلاف موجود نہ ہو مگر علم سے بے بہرہ عوام کے لئے عالم کی تقلید بلا اختلاف جائز ہے۔ یہ قول عمر بن عبدالعزیز، قاسم بن محمد، سفیان ثوری وغیرہ علماء کرام کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان بزرگوں کی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ السلام نے فرمایا: '' میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں، جس کی بھی اقتداء کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔ لیکن اہل علم کا ایک بڑا طبقہ اس مذہب کو ضعیف قرار دیتا ہے اور اکثر فقہاء وعلماء نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ اب بات یہ ہے کہ پھر ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ اگر ایسے حالات کسی معاملہ میں پیدا ہو تو حافظ ابن عبدالبر نے اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر مزید لکھتے ہیں!'' وأما مالك والشافعي ومن سلك سبيلهما من أصحابهما ، وهو قول الليث بن سعد والأوزاعي وأبي ثور و جماعة أهل النظر: أن الاختلاف اذا تدافع فهو خطاء وصواب والواجب عند اختلاف العلماء طلب الدليل من الكتاب والسنة والاجماع والقياس على الأصول على الصواب ، منها وذلك لا يعدم فان استوت الادلة وجب الميل مع الاشبه بما ذكرنا بالكتاب والسنة فاذا لم يبين ذلك وجب التوقف ، ولم يجز القطع الا بيقين فان اضطر أحد الى استعمال شئ من ذلك في خاصة نفسه جازله ما يجوز للعامة من التقليد واستعمل عند افراط التشابه والتشاكل وقيام الادلة على كل قول بما يعضده قول رسول الله

" البر ما اطمأنت اليه النفس والاثم ما جال في الصدر فدع ما يريبك الى ما لا يريبك " هذا حال عن لا يمعن النظر وه بحسنه وهو حال العامة التى يجوز لها التقليد فيما نزل بها وأفتا بذلك علماؤها۔ (جامع البیان والعلم ۲/۹۳)

ترجمہ: امام مالک، امام شافعی، لیث بن سعد اوزاعی، ابو ثور اور اہل نظر کی رائے یہ ہے کہ جب ایک ہی مسئلہ میں دو متضاد قول ہوں تو دونوں حق نہیں ہو سکتے۔ لازمی طور پر ایک صحیح ہوگا اور دوسرا غلط۔ ایسی صورت حال میں کتاب و سنت اجماع امت، اصول مسلمہ پر قیاس کر کے طلب دلیل ضروری ہے۔ اگر طرفین کے دلائل ہم پلہ ہوں اور راجح و مرجوح کا فیصلہ نہ ہو سکے تو جو قول کتاب وسنت سے زیادہ مشابہ ہو اس کی طرف مائل ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو سکوت و توقف بہتر ہے قطعیت کے ساتھ کوئی حکم نہ لگایا جائے۔ اس قسم کے مسائل اگر اپنی ذات کو پیش آئیں تو عوام کی طرح تقلید جائز ہے از حد تشابہ اور تماثل کی صورت میں۔ مگر جب کوئی واضح پہلو سمجھ میں نہ آسکے تو اس حدیث شریف پر عمل کرنا چاہیے نیکی وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو اور بدی وہ ہے جو دل میں کھٹک پیدا کرے جس بات میں تنگی محسوس کرے اسے چھوڑ دو اور جس میں دل کو خلش نہ ہو اسے لے لو لیکن یہ طریقہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو عوام کے درجے میں ہیں اور غور وفکر کی صلاحیت نہیں رکھتے ایسے لوگوں کو یقیناً علماء کے فتویٰ کی پیروی کرنا چاہیے۔ مگر جملہ علماء کا اتفاق ہے کہ قاضی اور مفتی کو قضاء و افتاء کے منصب اسی وقت قبول کرنا چاہیے جب کتاب وسنت اور اجماع امت سے کما حقہ واقفیت ہو اور بوقت ضرورت اجتہاد کی قابلیت بھی رکھیں۔

قارئین کرام! حافظ ابن عبدالبر کے اس قول سے مندرجہ ذیل اہم نکات سامنے آتے ہیں۔

1: ایک ہی مسئلہ میں اگر دو متضاد یا متعارض اقوال ہوں تو دونوں حق نہیں ہو سکتے۔ صحیح صرف اور صرف ایک ہی قول ہوگا۔ اور ایسی صورت میں کتاب وسنت اور متفقہ اصولوں پر عمل ہوگا۔

2: اگر طرفین کے دلائل ایک جیسے یا ہم پلہ ہوں تو راجح اور مرجوح کی طرف جانا ہوگا۔ یعنی ایک قول راجح ہوگا اور دوسرا قول مرجوح ہوگا۔

3: اور اگر کوئی راجح اور مرجوح کا بھی فیصلہ نہ کر سکے تو قول کتاب وسنت سے زیادہ قریب اور مشابہ ہو تو اس کو لینا چاہیے کیونکہ مرجوح قول پر عمل کرنا غلط ہے۔

4: اگر کوئی قرآن وسنت کے مشابہ اقوال بھی نہ اخذ کر سکے تو پھر اس کو توقف کرنا چاہیے اور اس پر کوئی حکم نہ لگائے۔ کیونکہ اس شخص کو قرآن وسنت کے مشابہ اقوال ڈھونڈتے اور اخذ کرنے میں مشکل ہوگی اس لئے ایسے

شخص کو توقف کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ممکن ہو تو پھر اس مسئلہ میں کسی بڑے عالم کی تقلید کرنی چاہیے۔

5: اور اگر کسی مسئلہ میں واضح پہلو سامنے نہ آئے تو جس طرف دل مائل ہو تو وہ قول اخذ کرنا چاہیے مگر یہ طریقہ صرف عام لوگوں کے لئے ہی ہے کیونکہ عوام الناس کے اندر غور و فکر کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ مگر صرف دل ہی کی نہ مانے بلکہ ایسی صورت میں علماء کے فتویٰ کی پیروی ضروری ہے۔ عام بندہ یہ نہ کرے کہ صرف دل جس طرف مائل ہو اس طرف کا قول مانے بلکہ عالم کے فتویٰ کی پیروی کرے اور یہاں یہ بات اہم ہے کہ یہ معاملہ صرف اور صرف عوام یا جاہل لوگوں کیلئے ہے۔ علماء حقانیہ کے احکامات تو اس سے جدا اور الگ ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔

6: آخری نکتہ یہ معلوم ہوا کہ عام یا جاہل آدمی کو کسی عالم کے فتویٰ پر عمل کرنا چاہیے مگر یہ بھی یاد رکھیں کہ فتویٰ بھی ہر شخص کا قابل قبول نہیں ہوتا۔ فتویٰ صرف اور صرف ان علماء کرام کا قابل قبول ہوتا ہے جس میں کتاب و سنت اور اجماع امت سے واقفیت اور عبور حاصل ہو اور اگر ضرورت پڑے تو اس میں اجتہاد کی قابلیت بھی ہو۔

7: حافظ عبدالبر کے قول سے یہ بھی واضح ہوا کہ اصحابی کالنجوم سے استدلال کرنا غلط ہے۔ کیونکہ کسی بھی صحابی کے کسی بھی قول کو اخذ کرنے سے ہدایت پانے والے مذہب کو ایک بڑے طبقہ اور جمہور علماء کرام نے ضعیف کہا اور فقہاء کرام نے اس موقف کو رد کر دیا۔

اب ان کو عوام الناس کے سامنے واضح کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ افضلیت میں قبلہ محترم شاہ صاحب نے بنیاد ہی اقوال متعارضہ اور اصحابی کالنجوم پر رکھی ہے۔ محترم قبلہ شاہ صاحب کا استدلال گذشتہ سطور میں واضح کر دیا ہے کہ ان کا استدلال یہ ہے کہ نصوص متعارضہ مسئلہ افضلیت میں صحابہ کرام سے وارد ہوئے ہیں اور صحابہ کرام کے نصوص متعارضہ میں سے کسی ایک نص یا قول پر عمل کرنے والا ہدایت اور حق پر ہوگا کیونکہ تمام صحابی ہدایت یافتہ ہیں اور کسی کے بھی ایک قول پر عمل کرنے یا ماننے سے اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔

1: مگر حافظ عبدالبر کے قول سے یہ واضح ہو گیا کہ دو متعارض اقوال میں سے حق ایک کے ہی ساتھ ہوگا۔ مطلب یہ کہ مسئلہ افضلیت میں نصوص متعارضہ میں سے کسی ایک ہی صحابی کا قول حق ہوگا اور اس مسئلہ میں استدلال صرف قرآن و سنت اور متفقہ اصولوں پر ہی ہوگا۔ اور مزید یہ کہ اصحابی کالنجوم سے استدلال بھی صحیح نہیں کیونکہ علماء کرام اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور بصورت دیگر اس حدیث سے مطلب پر عمل کرنے کو ضعیف مذہب قرار دیا ہے۔

2: محترم قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ دلائل بالفرض اگر ہم پلہ بھی ہوں (مگر یہ یاد رکھیں کہ قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ اقوال متعارضہ قوت میں ہم پلہ بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ قبلہ شاہ صاحب کے پیش کردہ دلائل میں سے

90% روایات ضعیف وموضوع ہیں جن کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ آئندہ پیش کیا جائے گا اور بقیہ 10% روایات بھی اپنے عموم پر نہیں اور استمکیات کی وجہ سے ان پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے مقابلے میں یہ باقی ماندہ روایات بھی ہرگز ہرگز ہم پلہ نہیں ہیں) تو پھر بھی ہمیں راجح اور مرجوح کی طرف جانا پڑے گا۔ اور یہ بات علماء کرام پر مخفی نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت راجح ہے اور مرجوح روایات پر عمل کرنے کا حکم بھی قبلہ شاہ صاحب کو معلوم ہے۔

۳: بالفرض کوئی بھی شخص مسئلہ افضلیت کے بارے میں راجح اور مرجوح کا فیصلہ نہ کر سکے تو قرآن وسنت کے زیادہ نزدیک مسئلہ کو ماننا پڑے گا۔ افضلیت ابوبکر صدیق قرآن وسنت کے زیادہ نزدیک ہے لہٰذا افضلیت ابوبکر صدیق کی ہی ماننا پڑے گی۔

۴: اگر کسی عالم کو مسئلہ افضلیت میں قرآن وسنت کے مشابہ اقوال بھی نہ مل سکے تو پھر بطور تنزل ایسے عالم کو توقف کرنا چاہیے۔ مگر اس توقف سے بھی کام نہیں چلے گا۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے سے بڑے عالم کی تقلید کرکے مسئلہ افضلیت کے بارے میں معرفت اختیار کرے۔

۵: اگر کسی عام بندے کو ایسے معاملہ یعنی مسئلہ افضلیت میں معاملہ واضح ہو تو وہ اپنے دل کی بات مانے یعنی دل جس طرف پر مطمئن ہو مگر یہ بھی یاد رکھیں یہ اس وقت ہے جب تک وہ کسی عالم کے فتویٰ پر آگاہ نہ ہو اور یہ بھی ذہن نشین رہے یہ معاملہ صرف اور صرف عوام الناس کے لئے ہے عالم پر ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

مزید یہ بھی ذہن نشین رہے کہ عام آدمی کسی کے فتویٰ پر عمل کرکے مسئلہ افضلیت پر عمل نہیں کرسکتا مسئلہ افضلیت میں بھی فتویٰ اس عالم کا قابل قبول ہوگا جس کو کتاب وسنت اور اجماع امت پر عبور حاصل ہو اور اس عالم میں اجتہاد کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہونی چاہیے۔

اس مندرجہ بالا تحقیق سے یہ واضح ہوگیا کہ افضلیت پر اقوال متعارضہ پیش کرکے اور چند علماء کرام کے توقف والے حوالے پیش کرکے اس مسئلہ میں عوام الناس کو الجھانا صریح غلط ہے۔ کیونکہ اول یہ کہ اقوال متعارضہ ہم پلہ نہیں ہیں اور اپنے استدلال میں واضح نہیں ہیں۔ لہٰذا ان سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوم توقف والے حوالے اگر بالفرض بطور تنزل مان بھی لئے جائیں (حالانکہ جن علماء کرام کا محترم قبلہ شاہ صاحب نے توقف کا مذہب نقل کیا ہے ان میں اکثر علماء کرام افضلیت ابوبکر صدیق کے قائل ہیں) تو پھر بھی یہ حوالے کارآمد نہیں کیونکہ حافظ ابن عبدالبر نے اختلافی مسئلہ میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ مختلف مراتب بیان کردیے ہیں۔ کیونکہ جس طرح عالم اور جاہل برابر نہیں ہوسکتے اسی طرح ہر عالم کی معیار علمیت بھی جدا جدا ہوتی ہے۔

نکتہ : قارئین کرام اس مقام پر یہ یاد رکھیں کہ مسئلہ افضلیت پر بالفرض مختلف اقوال اور علماء کرام کا موقف مختلف ہو تو اس طرح کے معاملہ میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر عالم کی حیثیت دوسرے عالم سے مختلف ہوتی ہے اور ان تمام کا معیار علم اور مطالعہ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ اگر کسی کے مطالعہ میں مسئلہ افضلیت اجماعی ہے تو اس نے مسئلہ افضلیت کو اجماعی لکھا۔ اگر کسی کے علم میں ایسے معاملہ میں توقف پہلے آ گیا تو اس نے اس مسئلہ پر توقف کیا۔ مگر یہ بھی یاد رکھیں کہ ان میں ہر کسی کے قول پر عمل کرنا جائز نہیں کیونکہ جاننے والے کو نہ جاننے والے پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

مزید یہ بھی ذہن نشین رہے کہ محترم قبلہ شاہ صاحب نے جن اقوال متعارضہ سے استدلال کیا ہے ان کی سند اور متن بھی محفوظ نہیں اور یہ کہ ان اقوال سے تعارض ثابت بھی نہیں ہوتا۔ ان اقوال تعارض کی حقیقت ان شاء اللہ اگلے مضمون میں بطور احسن واضح کر دی جائے گی۔ اور محترم قبلہ شاہ صاحب کو تعارض ثابت کرنے کے لئے بھی کم از کم دس وجوہات اصول کی روشنی میں بیان کرنا پڑیں گے۔

صرف تعارض کہہ دینے سے تعارض ثابت نہیں ہوتا جس طرح حدیث کو صحیح کہہ دینے سے حدیث صحیح نہیں ہوتی بلکہ اصول اسماء الرجال کی روشنی میں راویوں کی توثیق کر کے حدیث صحیح ہوتی ہے۔ لہٰذا محترم قبلہ شاہ صاحب کو تعارض کی شرائط بیان کر کے ان شرائط پر تعارض کو ثابت کرنا پڑے گا۔ لہٰذا مسئلہ افضلیت خالصتاً علمی مسئلہ ہے جس شخص کے سامنے جس طرح کے دلائل آئے اس نے اسی طرح کا حکم بھی لاگو کیا اور جس طرح کا علمی معیار کسی عالم کا ہو اس نے اسی علمی معیار کے مطابق مسئلہ افضلیت کو بیان کیا۔ جس طرح علماء کرام کا علمی اور تحقیقی معیار میں فرق ہے۔ اسی طرح ان کے اقوال اور وضع کردہ اصول وضوابط کی حیثیت بھی الگ اور جدا ہوگی۔ امام اعظم کے مقابلے میں امام کرخی یا علامہ بدرالدین عینی کا قول ہرگز ہرگز قابل قبول نہ ہوگا کیونکہ امام اعظم مجتہد مستقل مطلق ہیں اور ان کی حیثیت اور رتبہ علمی لحاظ سے کافی بلند ہے۔ لہٰذا امام اعظم کے قول کو فوقیت حاصل ہوگی۔

لہٰذا محترم قبلہ شاہ صاحب کا اس مسئلہ میں عوام الناس کو الجھانا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مسئلہ افضلیت میں متواتر احادیث، نصوص، اجماع اور جمہور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر ہیں ان میں سے محترم قبلہ شاہ صاحب کو کم از کم جمہور کا تو اعتراف ہے۔ ان شاء اللہ ہم افضلیت ابوبکر صدیق پر متواتر احادیث، نصوص اور اجماع بھی اپنی کتاب میں نقل کریں گے تاکہ عوام الناس پر مسئلہ واضح ہو سکے۔

مناسب ہوگا کہ محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کی بنیاد (کہ صحابہ کرام میں اگر اختلاف ہو تو کسی بھی صحابی کے قول اختیار کرنے سے آدمی اہل سنت سے خارج نہ ہوگا اور ہدایت یافتہ ہوگا) پر مزید صحابہ کرام و تابعین و تبع

تابعین علماء اہل سنت کے اقوال سے وضاحت کردی جائے تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔

اختلاف صحابہ اور لیث: قال یحیی: وبلغنی أن اللیث بن سعد قال: اذا جا الاختلاف أخذنا فیه بالأحوط (جامع البیان والعلم: ۱۶۹۶)

ترجمہ: امام لیث بن سعد کہا کرتے تھے، صحابہ کے اختلاف میں پہنچتے ہیں تو ہم زیادہ محتاط قول کو لیتے ہیں۔

اختلاف صحابہ کرام اور امام مالک: أخبرنا عبدالرحمن بن یحیی ثنا احمد بن سعید ثنا محمد بن زبان ثنا الحارث بن مسکین عن ابن القاسم عن مالک أنہ قال فی اختلاف أصحاب رسول اللہ ﷺ مخطیء و مصیب، فعلیک بالاجتهاد۔ (جامع البیان والعلم: ۱۶۹۷)

ترجمہ: امام مالک نے فرمایا: صحابہ میں بعض حق پر تھے اور بعض سے غلطی ہوئی، اس لئے ان کے افعال پر کھا کرو۔

اختلاف صحابہ کرام اور قاضی اسماعیل بن اسحاق: وذکر اسماعیل بن اسحاق فی کتابہ "المبسوط" فی اجتهاد الرأی فاما أن یکون توسعة لأن یقول الناس واحد منهم عن غیر أن یکون الحق عندہ فیہ فلا، ولکن اختلافهم یدل علی انهم اجتهدو فاختلفوا قال ابوعمر: کلام اسماعیل هذا حسن جداً۔

ترجمہ: قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا: صحابی کے اختلافات عمل میں سہولت و وسعت پیدا نہیں کرتے البتہ اجتہاد کی راہ کشادہ کرتے ہیں آدمی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ صحابی کی غلطی لے کر بیٹھ جائے اور کہے یہ صحابہ کا عمل ہے۔ البتہ ان کے اختلاف سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق ضرور ہے کہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ قاضی اسماعیل کا یہ قول بالکل درست ہے۔

نوٹ: یہاں یہ بات اہم ہے کہ اختلاف میں دونوں روایات کا صحیح اور متعارض ہونا ضروری ہے کیونکہ ضعیف روایت یا وہ روایت جو اپنے عموم پر نہ ہو تو ایسی روایات کس طرح دیگر روایت سے متعارض ہو سکتی ہیں۔

اختلاف صحابہ اور امام مالک: سماع أشهب: سئل مالک عمن أخذ، بحدیث حدثہ ثقة عن أصحاب رسول اللہ ﷺ أتراہ من ذلک فی سعة فقال: لا واللہ حتی یصیب الحق وما الحق والصواب الا واحد۔ (جامع البیان: ۱۷۰۰)

ترجمہ: اشہب کی روایت ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا "اگر ثقہ راوی ایک ہی مسئلہ میں صحابہ سے دو مختلف قول روایت کرے تو کیا ہر قول پر عمل کرنا ٹھیک ہے؟ امام مالک نے جواب دیا: بخدا نہیں بلکہ جو قول حق ہو اسے

کہا جاتا ہے اور حق ایک ہی ہو سکتا ہے دونوں متضاد قول حق نہیں ہو سکتے۔

اختلاف صحابہ اور امام شافعی: أخبرنا احمد بن عبداللہ بن محمد ، ثنا المیمون بن حمزة الحسینی بمصر ثنا ابوجعفر الطحاوی ثنا ابوابراھیم اسماعیل بن یحیی المزنی۔ قال الشافعی اختلاف أصحاب رسول اللہ ﷺ أصیر فیھما الی ما وافق الکتاب أو السنة اوالاجماع أو کان أصح فی القیاس ، وقال فی قول الواحد منھم ، اذا لم یحفظ لہ مخالفا منھم صرت الیہ وأخذت بہ اذا لم أجد کتاباً ولاسنة ولا اجماعاً ولا دلیلاً ھذا وجدت معہ القیاس قال: وقل ما یوجد ذلک (جامع البیان والعلم ۱۷۰۴)

ترجمہ: امام شافعی نے کہا: میں اختلاف کی صورت میں اس صحابی کا قول لوں گا جو کتاب وسنت واجماع امت کے موافق یا قیاس کی کسوٹی پر کھرا اترے گا اگر کسی مسئلے میں ایک ہی صحابی کا قول ہے اور اس کے خلاف کوئی قول موجود نہیں تو اسے لے لوں گا مگر شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت واجماع کے خلاف نہ ہو اور قیاس پر بھی پورا اترے مگر ایسی صورت شاذ ہی پیش آتی ہے۔

نوٹ: امام اعظم کا اختلاف صحابہ کرام میں دو قول ہیں۔ ایک قول امام شافعی کے ہم معنی ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ میں جس صحابی کا قول بھی لے لوں، درست ہے اجماع صحابہ سے خروج میرے نزدیک مناسب نہیں تابعین اور دوسرے لوگوں کی جانچ پڑتال کو ضروری سمجھتا ہوں۔ مگر امام اعظم کا یہ قول بھی محل نظر آتا ہے کیونکہ امام اعظم سے مشہور یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام اور احادیث میں اختلاف کے وقت فقیہ صحابہ کی حدیث پر عمل کو ترجیح دی۔ امام اعظم مجتہد مستقل مطلق تھے ان کو یہ مقام تھا کہ وہ کسی بھی صحابی کے قول کو لے سکتے تھے۔ مگر عرض یہ ہے کہ یہ حق اور مقام صرف اور صرف امام اعظم کو ہی حاصل ہے ہر کسی کو یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی بھی صحابی کا قول لے۔ کیونکہ مجتہد کو ہی ناسخ والمنسوخ، راجح ومرجوح وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

قارئین کرام کے لئے یہ عرض کر دوں کہ امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو افضل سمجھتے تھے۔ لہذا امام اعظم کے قول سے بھی راہ نکالنی مشکل ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجتہد مطلق کو یہ اصولاً حق حاصل ہے کہ وہ صحابہ کرام کے کسی بھی قول کو لے مگر یہ بھی یاد رہے کہ مجتہد بھی کسی مسلمہ اصول کے تحت کسی ایک صحابی کے قول کو لیتا ہے۔ بے اصولی تو ان کے ہاں بہت ہی مشکل ہے۔ اگر کسی مجتہد نے اگر کسی ایک صحابی کا قول لیا تو وہ اس کے اصول وضوابط بھی بتائے گا۔

قارئین کرام!! اگر آپ احادیث کا بغور مطالعہ کریں تو متعدد مقامات ایسے موجود ہیں جہاں صحابہ کرام کا ایک

دوسرے سے اختلاف ہوا۔ مگر مطالعہ میں یہ بات آئی کہ انہوں نے حق کو ہمیشہ واضح کیا اور دوسرے صحابہ کرام نے اس حق کو قبول بھی کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے کہ "یہ میری رائے ہے اگر صحیح ہو تو خدا کی توفیق ہے اور اگر غلط تو میری کوتاہی ہے۔ میرے مطالعہ میں ایسے بہت سارے واقعات وقوع پذیر ہوئے ہیں کہ صحابہ کرام کے آپس میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہوا اور انہوں نے ایک کو حق پر اور دوسرے کو خطا پر سمجھا اگر ایسا نہ ہوتا تو ان میں ہر صحابی دوسرے صحابی کو کہتے کہ میرا قول بھی حق ہے اور تیرا قول بھی حق ہے ہم دونوں ہدایت کے ستارے ہیں اور اختلاف کی وجہ سے ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ ہم اس بات کو واضح کرنے کے لئے چند مثالیں پیش کرتے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

1: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین عرب کے بارے میں تمام صحابہ کا قول رد کر دیا تھا اور فرمایا تھا اگر عرب وہ سب ادا نہیں کرتے جو رسول اللہ ﷺ کو ادا کرتے تھے تو ان میں ان پر جہاد کروں گا۔ (بخاری ۱۳۲، مسلم ۲۳۸۰)

2: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے اختلاف کرتے ہوئے تکبیرات جنازہ پر صرف چار تکبیر پر مجبور کیا۔ (بخاری رقم: ۲۸۳ ے ۔ ۲۸۵ ے، مسلم ۳۰)

3: اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے سنا کہ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ عورت کے سامنے آ جانے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے تو تردید کی اور فرمایا: میں درمیان میں لیٹی ہوتی تھی اور رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔

4: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے کئے تھے تو حضرت عائشہ نے مخالفت کی اور فرمایا: عبداللہ رسول اللہ ﷺ کے تمام عمروں میں ساتھ تھے مگر بھول گئے ہیں۔ حضور نے چار نہیں بلکہ تین عمرے کئے تھے۔ (صحیح بخاری، ۳۲۵)

5: حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مرتدوں کو قتل کے بعد جلوا دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس عمل پر انکار کیا۔ (مسند ابی یعلیٰ ۲۵۳۲، ابن حبان ۵۶۰۶، بخاری ۱۹۲۲، مسند احمد ۱/ ۲۸۲)

6: اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس کو معلوم ہوا کہ حضرت علی عرب عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے سے منع کرتے اور فرماتے ہیں۔ "انہوں نے نصرانیت میں سے اگر کچھ لیا ہے تو شراب خوری ہے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے کہا بلکہ ان کا ذبیحہ کھانا روا ہے۔

7: اسی طرح ایک مسئلہ میں حضرت فاروق اعظم نے اپنی رائے چھوڑ کر حضرت معاذ بن جبل کی رائے کی طرف

رجوع کیا اور فرمایا معاذ اللہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوتے۔ (سنن الدارقطنی رقم:۲۸۱۱، مصنف ابن ابی شیبہ:۲۹۳۰۸)

اس مندرجہ بالا تحقیق سے واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام نے بھی حق کی دلیل کو مانا اور یہ نہ کہا کہ میں بھی ہدایت پر ہوں اور تو بھی ہدایت پر ہے۔ لہذا یہ موقف اختیار کرنا محل نظر ہے کہ صحابہ کرام کی جس حدیث کو بھی لیں چاہو تو صحیح ہوگا۔

عالموں کے دو متضاد اقوال پر عمل کی تحقیق:

ہمارے اس دور میں یہ بات بڑی ہی عجیب اور اصول کے خلاف ہے کہ مسئلہ افضلیت میں فلاں کا قول فلاں سے مختلف یا متعارض یا متضاد ہے تو پھر اس پر کیا حکم لگاؤ گے۔ کیا مسئلہ افضلیت ابوبکر صدیق پر ان علماء کرام کو اہل سنت سے خارج کر دو گے۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ فتویٰ دینا تو فقیہ کا کام ہے ہر عالم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ فتویٰ لگائے کیونکہ اگر مفتی کی شرائط پر پرکھیں تو آج کے دور میں شاید ہی کوئی آپ کو مفتی نظر آئے سوائے چند شخصیات کے۔ لہذا مسئلہ افضلیت پر مابین فریقین جو ناصبیت، خارجیت اور رافضیت کی فتویٰ بازی ہو رہی ہے وہ قواعد وضوابط اور مسلمہ اصول کے سراسر خلاف ہے۔ لہذا اس قسم کی فتویٰ بازی سے گریز کرنا چاہیے مزید یہ عرض کر دوں کہ فتویٰ ایسے شخص پر لاگو ہوتا ہے جس کی نظر میں تمام دلائل اور ثبوت ہو اور پھر وہ اس کا انکار کرے۔ اگر کسی کی نظر یا مطالعہ میں دلائل ہی نہ ہو تو اسکے موقف پر فتویٰ لگانا بڑی جرأت کا کام ہے اور وہ اس مسئلہ پر ماجور سمجھا جائیگا۔ اب اس مسئلہ افضلیت میں جس عالم کے مطالعہ میں جس قسم کے دلائل تھے انہوں نے اس مسئلہ افضلیت پر اسی قسم کا موقف اختیار کیا۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ علماء کرام اور مجتہدین کے بھی مراتب ہیں۔ لہذا ان مراتب کا خیال رکھتے ہوئے ان کے اقوال کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بعض عالم کسی ایک فن کا ماہر ہوتا ہے تو دوسرا کسی دوسرے فن کا ایک عالم علم تفسیر کا ماہر ہوگا تو دوسرا علم حدیث کا، ایک عالم منطق کا ماہر ہوگا تو دوسرا فلسفہ کا، اور ان تمام عالموں سے مجتہد کی شان اور فضیلت سب سے بڑھ کر ہے اور مجتہد کے بھی کئی مراتب ہیں۔

اقوال متضاد اور امام مزنی: امام مزنی شاگرد رشید امام شافعی کا دو علماء کے متضاد اقوال کے بارے میں قول ملاحظہ کریں! "لم تصنع هذا الرأى العالمين المختلفين ؟ فتثبت منهما ما أثبته الدليل وتبطل ما أبطله الدليل" (جامع البیان العلم ۱۱۵/۲)

ترجمہ: تو اختلاف رکھنے والے دونوں عالموں کے اقوال سے بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کرتے؟ جو قول دلیل سے صحیح ثابت ہو جائے اسے لے لو اور جو باطل ٹھہرے اسے چھوڑ دو۔"

حافظ ابن عبد البر کا فیصلہ: امام مزنی کے اس قول پر حافظ ابن عبد البر کچھ اس انداز میں فیصلہ وارد کرتے ہیں: ''ما ألزمه المزني عندی لازم'' (جامع البیان العلم ۲/۱۱۵)
یعنی امام مزنی کا استدلال بالکل درست ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔
لہذا معلوم ہوا کہ علماء کرام کے متعارض اقوال میں سے ایک کا قول قرآن وسنت اور آثار کی روشنی میں اخذ کرنا ضروری ہے۔

حدیث أصحابي کالنجوم کا تحقیقی جائزہ: محترم قبلہ شاہ صاحب کے موقف کی بنیاد حدیث اصحابی کالنجوم کا بھی قارئین کرام کے لئے مختصر اجائزہ پیش خدمت ہے۔

1: امام مزنی حدیث اصحابی کالنجوم کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ان صح هذا الخبر فمعناه: فيما نقلوا عنه وشهدوا به عليه فكلهم ثقة مؤتمن على ما جاء به لايجوز: عندي غير هذا وأما ما قالوا فيه برأيهم فلو كانوا عند أنفسهم كذلك ما خطأ بعضهم بعضاً ولا أنكر بعضهم على بعض ولا رجع منهم أحد الى قول صاحبه فتدبر'' (جامع البیان العلم ۲/۱۱۶)
ترجمہ: امام مزنی نے حدیث اصحابی کالنجوم کی تشریح میں کہا ہے اگر یہ حدیث صحیح ہے (جو کہ ضعیف ہے) تو معنی یہ ہیں کہ روایت دین میں تمام صحابی ثقہ اور معتبر ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی معنی میرے نزدیک درست نہیں کیونکہ اگر خود صحابہ اپنی رائے کو ہمیشہ صواب اور غلطی سے مبراء سمجھتے ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے کی تغلیط کرتے اور نہ کبھی اپنے کسی قول سے رجوع کرتے، حالانکہ بے شمار موقعوں پر صحابہ کرام ایسا کر چکے ہیں۔

2: محدث بزار حدیث اصحابی کالنجوم کے بارے میں لکھتے ہیں: ''هذا الكلام لايصح عن النبي ﷺ'' (جامع البیان العلم ۲/۱۱۶) یعنی یہ کلام (اصحابی کالنجوم) نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔
لہذا معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس روایت میں راوی ضعیف ہیں مگر طوالت کی وجہ سے اس مقام پر صرف محدث بزار کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔ اگر کسی نے اس حدیث پر کلام کیا تو ان شاء اللہ تفصیلی گفتگو ہوگی۔
مزید یہ کہ محدث بزار نے حدیث اصحابی کالنجوم کو صحیح حدیث عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين بعدي کے بھی خلاف لکھا ہے۔ (جامع البیان العلم ۲/۱۱۷)

نتیجہ: قارئین کرام! اس تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ اگر کسی مسئلہ میں نصوص یا اقوال متعارض ہوں تو دلائل کی روشنی میں ایک ہی کو ترجیح ہوتی ہے اور یہ کہ حدیث اصحابی کالنجوم ہی ضعیف ہے۔ لہذا محترم قبلہ شاہ صاحب کا اپنی کتاب زبدۃ التحقیق میں اقوال متعارضہ در باب افضلیت میں نقل کر کے یہ ارشاد فرمانا کہ ان اقوال میں سے کسی ایک کا

تبصرہ نگار: افضل شاہد اعوان

تعارف وتبصرہ کتب

تبصرہ کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ادارہ کا کتاب کے مضمون سے کلی طور پر متفق ہونا ضروری نہیں۔

۱) مقالات سلطانیہ

مصنف: شیخ الاسلام خواجہ حافظ سلطان محمود دریاوی مدظلہ العالی

صفحات: ۴۸۳ ہدیہ: ۱۵۰

ناشر بزم سلطانیہ (0300-5193811۔صاحبزادہ محمود احمد)

شیخ طریقت حضرت علامہ حافظ سلطان محمود دریاوی دامت برکاتہم العالیہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ دریائے رحمت شریف حضرو ضلع اٹک کو اللہ تعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا ہے کہ آپ خانقاہی ذمہ داریاں بحسن وخوبی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ دینی کتب کے مطالعہ اور مختلف متنازعہ مسائل کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔پیر صاحب قبلہ نے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔آپ نے نہ صرف تقریر میں بدعقیدہ لوگوں کا رد کیا ہے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مسائل پر علمی تحقیقی کتابچے اور اشتہارات بھی شائع کیے ہیں۔جن میں آپ نے انتہائی مختصر انداز میں مسلک حق کو مخالفین پر واضح کیا ہے۔ان رسائل واشتہارات کے مطالعہ سے آپکے وسیع المطالعہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔زیر تبصرہ کتاب ''مقالات سلطانیہ'' حضرت پیر صاحب کے مختلف ادوار میں شائع ہونے والے کتابچوں اور اشتہارات کو مزید اضافوں اور تخریج کے ساتھ ''مقالات سلطانیہ'' کے نام سے دوبارہ یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔یہ مقالات انتہائی تحقیقی اور معلومات افزا ہیں۔یہ کتاب علماء اور عوام دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

۲) مفتاح الجنۃ

مصنف: آغا حسن بلال درانی کراچی (0332-8989271)

صفحات: ۱۰۰ ہدیہ: دعائے خیر ناشر: دربار کریمی لوسر میرا وہ کینٹ

بنیادی طور پر یہ کتاب فرمودات و معمولات کریمیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں فلسفہ طریقت و شریعت، عصر حاضر کے مسلمانوں کے جملہ مسائل کا حل، نماز تہجد، کریمیہ سلسلے کا وظیفہ، فضیلت ذکر، فضیلت درود پاک، ختم کریمی، ختم خواجگان اور شجرہ نقشبندیہ مجددیہ کریمیہ کے علاوہ ضمناً کئی دوسرے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳) مولود کعبہ کون؟

مصنف: علامہ قاری محمد لقمان (0300-6235167) صفحات: ۸۰ ہدیہ: ۵۰

ناشر: دار التحقیق جامعہ محمدیہ فاروقیہ رضویہ شادیوال گجرات

۴) سوئے حجاز یا سوئے ایران

تحریر: صاحبزادہ محمد ضیاء الحق قادری رضوی

صفحات: ۲۴ ناشر: مرکزی جماعت اہل سنت تحصیل گوجرخان

ملنے کا پتہ: مکتبہ غوثیہ مہریہ رضویہ میلاد چوک گڑ منڈی مین بازار گوجرخان

۵) پیر سید مہر علی شاہ اور تحریک خلافت

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد علیہ الرحمہ

صفحات: ۳۲ ہدیہ: ۱۵ روپے کے ڈاک ٹکٹ

ملنے کا پتہ: ادارہ مظہر اسلام ۶۲/۳ نئی آبادی مجاہد آباد مغل پورہ لاہور پوسٹ کوڈ ۵۴۸۴۰

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆